ہیرالڈ لیم

مترجم جمیل نقوی

Умари Хайём - Omar Khayam

دیباچہ

اس معرکتہ الآرا ناول کا مصنف ہیرلڈ لیم نیویارک کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست نیوجرسی کے علاقے الپائن میں یکم ستمبر ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوا۔ وہ پیدائشی معذور تھا۔ اس کی آنکھوں، کانوں اور زبان میں فطری نقائص تھے۔ وہ صحیح طور پر نہ سن سکتا تھا نہ دیکھ سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا۔ اس کے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ بڑا ہی صبر آزما تھا۔

بہر حال جوں توں کر کے اس نے تعلیم حاصل کی۔ قدرتی جسمانی نقائص نے لیم کو تنہائی پسند بنا دیا تھا اور وہ اپنا بیشتر وقت کتب خانوں میں بیٹھ کر کتابوں کے مطالعے میں گزارتا تھا۔ بیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس کے جسمانی نقائص آہستہ آہستہ دور ہونے شروع ہوئے اور 1916ء میں اس نے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے گریجویشن کیا۔ 1917ء میں شادی کے بعد امریکہ متحدہ کے مغربی حصے میں بود و باش اختیار کی۔

ابتدا ہی سے ہیرلڈ لیم کو ایشیائی باشندوں کی تاریخ کے مطالعے کا شوق تھا۔ ان ممالک کے متعلق یادداشتوں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور ساتھ ہی اپنے ذاتی کتب خانے میں ایران، شرق اوسط، روس اور چین وغیرہ کی تاریخوں کی بڑی تعداد اکٹھا کر لی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اسے مشرق بعید اور مشرق قریب کے ممالک کے سفر کا بھی موقع ملا۔

ہیرلڈ لیم نے ''عمر خیام'' (1934) کے علاوہ مندرجہ ذیل گرانقدر ناول بھی لکھے

ہیں:

چنگیز خاں (1927) تیمور لنگ (1928)، صلیبی جنگیں (1930)، نور محل (1932)، گروی بچوں کے لیے (1933)، بربریوں کے محاربات (1940) ۔

تاریخی مضامین لکھنے کا سلسلہ زمانہ طالب علمی ہی سے جاری تھا اور نیویارک ٹائمز میں افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے جو زیادہ مشرقی باشندوں کی روزمرہ زندگی، تہذیب اور ثقافت پر مبنی ہوتے تھے۔ اپنی ادبی و تحقیقی تصانیف کے اعتراف میں کئی تمغے بھی حاصل کیے اور افسانہ نگاری سے ناول نویسی کی طرف رخ کیا اور امریکی ادب میں ایشیائی تہذیب و تمدن کو روشناس کرانے کا سہرا لیم ہی کے سر ہے۔

جمیل نقوی

الجمیل، اے۔ ۱۹/۱۱ بلاک جے

شمالی ناظم آباد، کراچی ۳۳

☆☆☆

مقدمہ

تاریخ فی نفسہ خشک سہی محض نفس الامر' لیکن جب فنکار کا جمالیاتی شعور اس کو اجاگر کرتا ہے تو اس میں بھی آب و رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کے خشک واقعات بھی تر و تازہ نظر آنے لگتے ہیں۔ تخیل کی بہیں لہروں میں نیا جادو جگا دیتی ہے۔ یہ سب جوہر قابل کی قوت مشاہدہ' پرواز تخیل' تخلیقی صلاحیت اور قوت بیان پر موقوف ہے کہ وہ دور کی حقیقتوں کو محسوس کرے اور ان ہیں اس طرح سے ابھار کر سامنے لے آئے کہ ان کی تصویر نظروں میں ہو بہو ویسی ہی پھر جائے کہ جیسے پردہ سیمیں پر جیتی جاگتی رواں دواں تصاویر۔ ہمارے یہاں بے شمار داستانیں' امیر حمزہ' بوستان خیال وغیرہ طلسمات کا بے پایاں دفتر ہیں۔ اگرچہ ان میں تمام تر تخیل میں محیر العقول ہنگامہ آرائی ہے اور اس کی جھلک دکھائی نہیں دیتی جو عملاً بسر کی جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے چلتی پھرتی زندگی اور اس کی سرگرمیاں۔

زیادہ اہم' کم از کم موجودہ حقیقت پرست زمانے میں ایسی تخلیقات ہیں۔ جن میں زندگی کے کوائف و احوال میں پوری طرح ڈوب کر اسے بھرپور رچاؤ کے ساتھ محسوس مرئی شکل عطا کرے اور ہم افسانہ و حقیقت' نفس الامر اور تخیل کے دہرے کیف سے سرشار ہوں اور زندگی کو سچ مچ اپنے اصلی رنگ میں مشاہدہ کریں جیسے ہم اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہیرلڈ لیم جیسے نادر مصنف کا تذکرہ ناگزیر ہے جس کو اس قسم کی

داستان طرازی کو فروغ دینے میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ مغربی مصنف ہونے کے باوجود اس نے مشرقی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بلکہ اس طرح اپنایا ہے گویا کہ اس کی اپنی دنیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اہل مغرب کے لیے بے حد دشوار ہے۔ کیونکہ ان کی دنیا مشرق کی دنیا سے کوسوں دور ہے۔ لیکن لیم اس لحاظ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ اس دنیا خصوصاً اسلامی دنیا سے اہل مشرق سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تعجب ہے کہ مشرق کو جس طرح مغربی مصنفوں نے پیش کیا ہے وہ خود مشرقی مصنفوں کو نصیب نہیں۔ جیسا کہ رباعیات عمر خیام، ایڈون آرنلڈ کی ''لائف آف ایشیا'' اور ''اسلامک روزری'' مالو کے ''تیمر لین'' حاجی باب اصفہانی اور مشرقی تحریک کے بے شمار علمبرداروں کی تصنیفات سے ظاہر ہے۔

صاحب قرانی تیمور ہو یا شاعر و مہندس عمر خیام، لیم ان کا شریک سفر ہی نہیں، ہم عصر، ہم نشین اور ہم نوالہ و ہم پیالہ معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ ان تمام اشخاص کا جو اس کے زیر نظر ناول ''عمر خیام'' میں پیش کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ان تمام مقامات سے بھی پوری طرح واقف ہے جو اس کی اس تصنیف کا محل وقوع ہیں جیسے اس نے اپنی تمام زندگی انہی میں گزاری ہو۔ اور وہ ہر ہر شہر گلی کوچہ کوچہ لوگوں کے طور طریق رہن سہن، معمولات اور روزمرہ کے واقعات سے ذاتی طور پر واقف ہو بعین جیسے کسی سپہ سالار کو میدان جنگ کا مکمل نقشہ پیش نظر ہو۔ تعجب ہے کہ اس نے اس قدر اور باریک سے باریک باتیں کیسے معلوم کیں۔

عمر خیام پر لیم کی تصنیف اس لیے بھی اور بھی اہم ہے کہ اس میں شہرہ آفاق شاعر

کی شخصیت اس کے گوناگوں حالات اور کوائف حیات کو بالتفصیل تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جامعیت کا یہ اہتمام یہاں تک ہے کہ افراد کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ معاشرے اور تمام ملک کے عروج و زوال کا نقشہ اور اس کے اسباب واضح کیے گئے ہیں۔ جیسے پردہ سیمیں کے سینما اسکوپ پر جو متحرک تصویر پیش کی جا رہی ہے ناظر خود بھی اس میں شامل ہو۔

اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ عمر خیام کی شخصیت اور زندگی کسی بھی نادر روزگار با کمال شخصیت کا المیہ ہے اور دل پر بے مہری زمانہ اور نیرنگ روزگار کا گہر نقش چھوڑتا ہے۔ یہ تاثر ہی بجائے خود فنی کمال کی بہترین علامت ہے۔ کیونکہ پیش کش کی اہمیت تمام تر ندرت تصور پر موقوف ہوتی ہے۔ ایسی تصنیفات غیر معمولی ثقافتی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ جس طرح عمر خیال کی رباعیات عالمی فکر کا لازمی حصہ ہیں۔ اسی طرح تمام عالمی شاہکار نوع انسان کے مشترکہ ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انہیں ہر زبان میں منتقل ہونا چاہیئے۔

میرے فاضل دوست جمیل نقوی نے اس گرانقدر تصنیف کو اردو میں پیش کر کے بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنے کے لیے ارادہ ہی بڑی ہمت کی بات ہے۔ چہ جائیکہ اس مہم کو جو ہفت خواں سے کم نہیں فی الحقیقت سر کیا جائے اور وہ بھی باحسن ترین وجوہ۔

ترجمہ بجائے خود ایک اہم تہذیبی عمل ہے۔ اس قدر اہم کہ ہم شاذونادر اس کا تصور کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت عالم فکر و نظر اور تہذیب و تمدن کو ایک ہی سطح پر لانے کا

ذریعہ ہے۔ اگر یہ عمل رک جائے تو دنیا کی ترقی بھی رک جائے یہ بین الاقوامی دادو ستد کا مسلسل عمل ہے جو حیات کو برابر تازگی بخش اور تنگنائے کو فراخنائے میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اگر نصرانیت کو عالمگیر فروغ حاصل ہے اور دنیائے مغربی پر آج تک اس کا تسلط ہے۔ تو اکا ایک موثر ذریعہ انجیل مقدس کے ترجمے کے سوا اور کیا تھا؟ اور دنیا کے وسیع حصے پر اسلام کا جو اثر ہے اس میں قرآن مجید کے تراجم کو کس قدر دخل ہے؟ ملکی فتوحات کا اثر مسلم لیکن یہ جلد ہی زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن تراجم کا دامن بچا کر مانوس وضع پیدا کرنا ہے یعنی عبارت اپنی زبان میں۔

مجھے مسرت ہے کہ پیش نظر ترجمہ میں جمیل نقوی کی تخلیقی صلاحیتیں برقرار رہی ہیں۔ انہوں نے ترجمہ بڑی وفاداری سے کیا ہے۔ لیکن اس میں ناگوار حد تک وفاداری کی کوئی علامت محسوس نہیں ہوتی۔ مترجم کی طباعی کے جوہر ہر کہیں نمایاں ہیں۔ جو اس کی پیش کش کا حاصل ہیں۔ اگر اردو ادب کو قوس قزح کہا جائے تو اس کے سات رنگوں میں اس کا رنگ بھی ایک بھرپور کیف کے ساتھ شامل ہے۔

مترجم کے ذوق و شوق سے امید ہے کہ وہ ادبی خدمات کے اس سلسلہ کو جاری رکھے گا۔ جس کا وہ اپنی دیگر متعدد تصنیفات میں ثبوت فراہم کر چکا ہے۔

پروفیسر رفیق خاور

☆☆☆

باب اول

نیشاپور کے قدیم شہر میں کتب فروشوں کی گلی 1069ء میں

وہ گلی جامع مسجد سے پارک تک جاتی تھی دھوپ سے بچاؤ کے لیے اس کے اوپر انگوری بیلیں پھیلا کر چھت سی پاٹ دی گئی تھی۔ دور چلنے کے بعد جہاں سے گلی مڑتی تھی وہاں پانی کا ایک چشمہ تھا۔ اور اس کے قریب ہی چنار کا ایک تناور درخت کھڑا تھا۔

جو عورتیں پانی بھرنے آتی تھیں وہ بڑے شوق سے چشمے کے کنارے بیٹھتیں اور اپنے گھڑے رکھ کر آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ مرد کتابوں کی دکانوں میں بیٹھے اونگھتے رہتے اور جب مسجد کے مکتب سے لڑکے پڑھ کر نکلتے تو وہ دوڑتے ہوئے آواز لگاتے "پرانی کتابیں بیچنے والو! جاگ اٹھو!"

اس آوازے سے یاسمین دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتی' چونکہ اس کے چہرے پر بچکانہ نقاب ہوتی تھی اس لیے لڑکے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے۔ مردوں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتے' وہ اس کے پاس سے گزر جاتے۔ البتہ کبھی کبھی یاسمین کی بھوری بلی پر پتھر ضرور پھینکتے تھے۔ ان میں سے بعض لڑکوں کے چہرے سبزہ آغاز تھے۔

یاسمین کی عمر تقریباً بارہ سال ہو گی۔ وہ خود کو حسین بھی سمجھتی تھی۔ اسی وجہ سے

اسے اپنے چہرے پر سفید رنگ کا نصف بچا نقاب ڈالنا کسی طرح پسند نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ اگر میں چہرے پر پورا نقاب ڈالوں اور جھلملیوں کی اوٹ سے لڑکوں کو جھانکوں تو وہ ضرور میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ یاسمین کو کتابوں کی دکان پر اپنے باپ کی مدد بھی کرنا پڑتی تھی۔ اس کا باپ بوڑھا اور کمزور تھا باریک لکھے ہوئے قلمی نسخوں کو پڑھتے پڑھتے اس کی بینائی قریب قریب جاتی رہی تھی۔ اپنی بیٹی کے مقابلے میں اسے بوعلی سینا کی کسی مجلّا و مطلا کتاب کا ایک ورق زیادہ عزیز تھا۔ اور گھر کی مستورات یاسمین کو اس وقت یاد کرتیں۔ جب انہیں اس سے کوئی کام لینا ہوتا تھا۔

جب اس کا باپ لڑکوں کو کوئی کتاب پڑھ کر سناتا تو بعض اوقات وہ بھی سننے لگتی لیکن اسے ذرا بھی مزا نہ آتا۔ رات کے وقت آسمان پر جنگلی ہنس کی شکل نمودار ہونے یا اس پردے کی بحث جو غیر مرئی اشیاء پر پڑا ہے اسے کیسی دلچسپی ہو سکتی تھی وہ سوچتی تھی کہ اس قسم کے مسائل کا سمجھنا مردوں کا ہی حصہ ہے' لڑکیوں کے اندر اتنی صلاحیت نہیں ہے۔ مرنے کے بعد انہیں وہی جگہ ملے گی جو کتوں اور ریلیوں کے لیے مخصوص ہے۔

یاسمین اپنے باپ کی دوکان پر جھاڑو بارو کرتی' جو چیز اس کے باپ کو نظر نہ آتی وہ اٹھا کر دیتی اور اس کی ضروریات کے لیے زنان خانے میں آتی جاتی۔ فرصت کے لمحوں میں یا تو وہ بڑی بے دلی سے سر بند کاڑھتی یا پھر بلی کے بھورے بچے سے کھیلتی رہتی اور ایسی جگہ بیٹھتی جہاں سے کتب فروشوں کی گلی کا پورا منظر نظر کے سامنے

رہے۔

دو لڑکے نسبتاً دوسروں سے عمر میں بڑے تھے۔ اکثر اس کے باپ کی دکان پر آتے تھے۔ ان میں سے ایک جس کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا ایک زمیندار کا بیٹا رحیم زادہ تھا۔ اس کی سرخ اور بھورے رنگ کی عبا یاسمین کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ دوسرا لڑکا اتنی دیر سر جھکائے کتابیں پڑھتا رہتا کہ اندھیرا ہو جاتا اور دکان دار مغرب کی نماز کے لیے دکانوں سے باہر نکل آتے۔

رحیم نے جس دن شام کو ایک خاص مصور مجلّا اور مطلا کتاب خریدی اس کا باپ گلی کے موڑ سے یاسمین کے لیے مٹھائی خرید لایا غریبوں کو ایسی نعمتیں کبھی کبھار نصیب ہوتی ہیں۔ یاسمین مزے لے لے کر مٹھائی کھا رہی تھی اور اس کا باپ سوچ رہا تھا کہ "دراصل رحیم کو کتاب کی وہ تصویر پسند تھی جو جلد کی پشت پر بنی ہوئی تھی اور جس میں گھوڑے پر سوار ایک سلطان کو کسی کافر کو تلوار سے قتل کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا"۔

یہ سب باتیں مردوں کی دنیا سے تعلق رکھتی تھیں یاسمین کو ان کو کچھ علم نہ تھا اس کے دل میں تو ایک ننھی سی آرزو تھی اور مبہم سا تصور تھا کہ ایک پروقار اور شاہانہ کروفر رکھنے والا امیر دمشق کی سرخ عبا پہنے بارہ ترک سپاہیوں کو جلو میں لیے ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر کتب فروشوں کی گلی میں آئے گا اور یہ عالی المرتبت شہزادہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھے گا اور اس کے باپ کو قیمتی تحائف دے کر اس سے یاسمین کو اپنے ہمراہ لے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔ پھر وہ اسے دریا کے

کنارے اپنے محل میں رکھے گا جہاں سفید راج ہنس ہوں گے، حریری ملبوسات ہوں گے اور نقرئی ظروف میں چنے ہوئے میٹھے میٹھے پھل ہوں گے۔ سفید گھوڑے کا یہ سوار اس سے ہمیشہ پر خلوص محبت کرنے گا اور اپنی دوسری بیویوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور صرف اسی کے بچوں کو زیادہ پیار کرے گا اور کبھی اس کے ساتھ استہزا اور بدسلوکی نہ کرے گا۔

''رحیم بہت ہنستا ہے'' یاسمین نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ اس کے باپ نے جواب دیا۔ ''ہاں ٹھیک ہے'' آخر وہ کیوں نہ ہنسے وہ رچے بچے گھرانے میں پیدا ہوا ہے اور بیسیوں نوکر اس کے اشارے پر ادھر ادھر دوڑتے ہیں۔

یاسمین نے اپنے دل میں سوچا کہ پھر وہ ٹھیک رہے گا اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے تصور میں رحی کو سفید گھوڑے والا امیر بنالیا۔ پھر بھی رحیم رحیم ہی رہا۔ اس نے ایک بار اسے تانبے کا ایک پیسہ دیا تھا اور اس نے یہ پیسہ اتنا چمکایا تھا کہ وہ بالکل سونے کا سکہ معلوم ہوتا تھا۔ یاسمین کو تعجب تھا کہ رحیم ہمیشہ ابراہیم کے بیٹے کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔

اس نے بلی کے بچے کو جو کود کر سڑک پر جانا چاہتا تھا روکا اور دل ہی دل میں سوچا کہ ابراہیم کا بیٹا بہت خاموش ہے اور اسکا چہرہ خوفناک حد تک متین ہے۔ مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر اسے دوسرے لڑکے نے کبھی اس سے نظریں بھی تو چار نہیں کیں۔ عبا اس کے چوڑے شانوں پر بے پروائی سے پڑی رہتی ہے اور عمامہ اس کے سر پر بڑی بے ترتیبی سے بندھا ہوتا ہے جیسے اسے اپنے لباس کی کوئی فکر ہی

نہیں۔ وہ گدھوں کے ریوڑ کو چیرتا پھاڑتا اور اونٹوں کی گردنوں کے نیچے سے گزرتا ہوا اس تیزی سے راستہ طے کرتا جیسے کوئی چیز اسے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ جب وہ اس کے باپ کی دکان پر آتا تو بڑے انہماک سے یکے بعد دیگرے کتابیں پڑھتا رہتا ہے اور رحیم اور اس کا باپ باتیں کرتے رہتے ہیں۔

یاسمین کا باپ بڑبڑایا ''ابراہیم کا بیٹا؟ سنا ہے وہ مدرسے میں خاموش نہیں بیٹھتا۔ وہ حجتیں کرتا ہے مسخرا پن کرتا ہے۔ واللہ ان باتوں کا انجام کبھی اچھا نہیں نکلا''۔

یاسمین مسخرے پن سے خوب واقف تھی۔ زنان خانے میں وہ خود بھی اس کی مشق کرتی رہتی تھی۔ لیکن جس دن اس کی بلی کے بچے پر لڑکوں نے پتھر برسائے تھے اسے ایک اور بات سوچنی پڑی۔

بلی کا بچہ باہر نکل گیا تھا۔ یاسمین ملکی ملکی کہہ کر اسے دیر تک پکارتی رہی لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ بالآخر اس نے دیکھا کہ وہ گلی کے موڑ پر چنار کی شاخوں میں چھپا ہوا ہے۔ ملکی اس پیڑ سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ کیونکہ وہ مجبور تھا۔ پانچ چھ طالب علم اس پر پتھر برسا رہے تھے۔ پہلے تو وہ یونہی اوپر پتھر پھینکتے رہے۔ لیکن جوں جوں ان کے دل میں اسے جان سے مارنے کی خواہش بڑھنے لگی وہ اس پر شدت سے پتھراؤ کرنے لگے۔

''ٹھہرو!''۔ یاسمین لرزتی ہوئی آواز میں زور سے چلائی۔ طالب علم پھر بھی نہ مانے اور یاسمین سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ ادھر ملکی بے بسی کے عالم میں

شاخوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ یاسمین لڑکوں کو ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مایوسانہ انداز سے وہ درخت پر جھپٹی اور شاخوں سے لپٹ کر اوپر چڑھنے کی جدوجہد کرنے لگی۔

جب تک وہ بلی کے بچے تک نہ پہنچ گئی درخت پر چڑھتی ہی چلی گئی اور جب اس نے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا تو پتھر برسنے بھی بند ہو گئے۔ لڑکوں کی دلچسپی ختم ہو گئی اور وہ اپنے اپنے رستے پر ہو لیے۔

اب یاسمین اوپر سے نیچے کی شاخوں پر اتری تو اسے ڈر لگا۔ وہ زمین سے بہت بلندی پر تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی بلندی پر وہ کیسے چڑھ گئی تھی۔ بچے کو گود میں لے کر وہاں سے کود جانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ دکان دار نماز پڑھنے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ اور کوئی بھی درخت پر بیٹھی ہوئی بچی کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ اتنے میں ایک لڑکا آیا اور پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے سنجیدگی سے کہا ”کود جاؤ“۔

یہ ابراہیم کا بیٹا تھا اور یاسمین اس کی مدد سے اترنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سر ہلا کر کہا ”نہیں“۔

”لڑکی“ کہہ کر وہ اچھلا شاخیں پکڑ کر جست لگائی اور یاسمین کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے یاسمین کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور نیچے کود گیا۔ یاسمین ہانپ رہی تھی اور بلی کا بھورا بچہ عمر کے عمامے سے چمٹا ہوا میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ اب وہ زمین پر تھے یاسمین کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ابراہیم کا بیٹا بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی سیاہ

آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ ملکی کو اپنے عمامے سے چھڑاتے ہوئے بولا یا اللہ تم دونوں کی گرفت کتنی سخت ہے!

یاسمین اپنے رخساروں کو پونچھتے ہوئے بولی "میرا مذاق نہ اڑاؤ"۔ پھر وہ کچھ سٹ پٹائی گئی اور بھاگ کر پھیلی ہوئی بیلوں کے سائے میں چلی گئی۔ تمام رات وہ ابراہیم کے بیٹے کی مسکراتی ہوئی آنکھوں اور مچلتے ہوئے بازوؤں کے سوا کچھ نہ سوچ سکی۔

اس دن کے بعد سے یاسمین ابراہیم کے بیٹے کے سوا کسی اور چیز کے متعلق نہ سوچتی۔ اب وہ ان سواروں کو بھی نہ دیکھتی جو گلی کے موڑ پر باغیچے کے پاس سے گزرا کرتے تھے۔ بلکہ ایسی جگہ بیٹھتی جہاں سے مسجد کے مکتب کا دروازہ نظر آتا تھا۔ اور جب وہ بے ہنگم لڑکا دوسرے لڑکوں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا مکتب سے آتا تو یاسمین وہاں سے بھاگ جاتی اور اس کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو جاتا' لیکن پھر بھی وہ کنکھیوں سے اسے دیکھتی رہتی۔ پہلی بار یاسمین نے یہ محسوس کیا کہ وہ لڑکا سرو قد ہے اور ہموار پتھروں پر اپنے قدم مضبوطی سے رکھتا ہوا چلتا ہے۔ اسکے ہونٹ موٹے اور گہرے رنگ کے ہیں جب وہ اسے دیکھ کر مسکراتا ہے تو اس کے سانولے چہرے پر ملائمت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔

یاسمین نے طرح طرح سے اس لڑکے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی بہن کا غازہ اپنے چہرے پر لگایا اور آنکھوں میں سرمہ بھی؟ پھر ایک دن چنبیلی کے پھولوں کا ہار گوندھا اور جس طرح اس کی بہن نے کسی نوجوان کو

دیکھ کر ہار گرایا تھا اسی طرح اس نے بھی ٹھیک اوقت جب عمر دکان پر آیا یہ ہار گرا دیا۔ اس نے ہار اٹھالیا اور جیب میں رکھ کر چل دیا...... اور یاسمین پورے ایک گھنٹے تک ہر شخص کی نگاہوں سے چھپتی رہی۔ کیونکہ اسے یہ سوچ کر شرم محسوس ہو رہی تھی کہ وہ پیش قدمی کرنے میں بہت آگے بڑھ گئی تھی۔

پھر اس نے اپنی ماں کے آئینے میں بغور اپنا چہرہ دیکھا اور خود کو حسین محسوس کیا۔ اپنے تصور میں اس نے اپنے تئیں ایک پردہ دار حسینہ بنالیا جس کے چہرے پر پورا نقاب پڑا ہوا ہے اور وہ کسی امیر زادی کے مانند لوگ اسے حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ رات کے وقت اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے اپنے دل کی سب باتیں بلی کے بچے کو بتائیں۔ گھر کی عورتوں کو تو یہ خیال ہوا ہوگا کہ یاسمین سو رہی ہے لیکن وہ جاگ رہی تھی اور اس کے دل میں یہ تمنا چٹکیاں لے رہی تھی کہ کاش ابراہیم کا بیٹا اس لمحے اس سے باتیں کرتا۔

جب وہ دکان پر آتا تو یاسمین اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھتی۔ کس طرح وہ دھوپ میں چٹائی کے ایک کونے پر بیٹھ کر پڑھتا۔ کن کتابوں کو وہ پسند کرتا ہے۔ اور کتاب پڑھتے وقت بعض اوقات کس طرح پیچ و تاب کھا کر اپنی انگلیوں کو مروڑتا ہے۔ ان سب باتوں کو یاسمین بغور دیکھتی۔ ایک کتاب اسے بہت پسند تھی۔ جب ایک مرتبہ یاسمین دکان میں اکیلی تھی تو اس نے اس کتاب کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ اس میں بہت سی تصویریں ہیں جن میں دائرے لکیریں اور عجیب عجیب شکلوں کے مستطیل اور ان کے ٹکڑے بنے ہوئے ہیں یاسمین اس کتاب کو پڑھ تو نہ سکی لیکن

پہچانتی خوب تھی۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے یہ کتاب بڑے مخطوطوں میں چھپا دی۔ جب ابراہیم کا بیٹا رحیم کے ساتھ دکان پر آیا تو وہ دراز قد طالب علم کو دیکھ کر مسکرائی۔ اور دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ رحیم بولا "یاسمین! ماہ نو اور جنت کی کسی حور کی کیا مجال کہ تیرے حسن کے مقابل آئے۔" یاسمین کو یہ جملہ بہت حسین محسوس ہوا۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور پھر یک لخت اس انداز سے اٹھائیں کہ رحیم انہیں دیکھ کر پسند کرے۔

"یاسمین دیکھو میرے پاس کوئی ڈھال نہیں ہے کہ میں تمہارے تیر نیم کش کا مقابلہ کر سکوں للہ رحم کرو" رحیم مسکرا کر بولا۔

یاسمین بھی مسکرائی لیکن اس کا دھیان ابراہیم کے بیٹے کی طرف تھا جو اس کتاب کو تلاش کر رہا تھا یاسمین نے اس انداز سے جیسے جانے بوجھے ایسا ہوا ہو مخطوطوں کے ڈھیر کو گرا دیا اور تصویروں والی سرخ کتاب اس میں سے نکال لی۔ کتاب نکالتے وقت اس نے کتاب کا ایک صفحہ پھاڑ دیا۔ ٹھیک اس وقت یاسمین کو اپنے باپ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ابراہیم نے کتاب کا صفحہ پھٹتے نہیں دیکھا تھا اور یاسمین کا دل دردو سے تڑپ گیا جب اسے یہ خیال آیا کہ ابراہیم کے بیٹے کو یہ کتاب سب سے زیادہ پسند تھی۔ لیکن اس نے پھٹے ہوئے صفحے کو ج کا کنارہ باہر نکل رہا تھی دیکھ ہی لیا۔ فوراً اس نے یاسمین کے باپ سے کہا کہ "یہ صفحہ میں نے پھاڑا ہے اب میں اسے خریدوں گا۔ اس کی قیمت کیا ہے؟"

یاسمین کے باپ نے متعجب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ اقلیدس

جس میں تمام شکلیں بنی ہوئی ہیں؟" یہ ایک قیمتی نسخہ تھا بوڑھا کتاب فروش اور رحیم دونوں جانتے تھے کہ ابراہیم کے بیٹے کے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ یہ کتاب خرید سکے۔

یاسمین کے باپ نے کہا "نیشاپور کے مدرسے کے کتب خانے میں بھی اقلیدس کا کوئی ایسا نسخہ نہیں جس میں تمام شکلیں ہوں" رحیم نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اچھا اسے میں خرید لوں گا۔ کیونکہ ابراہیم خیال کے اس لاابالی بیٹے عمر کو میں یہ کتاب تحفے میں دینا چاہتا ہوں"۔

عمر شرما گیا اور اس نے کتاب اپنے مضبوط ہاتھوں میں اٹھالی۔ رحیم ہنستے ہوئے بولا "لیکن پرانی کتابیں بیچنے والے بزرگ ﷲ یہ نہ کہنا کہ یہ کتاب سلطان محمود کی ملکیت تھی اور اسے وہ ہمیشہ اپنے سنہرے تخت کے پاس رکھتا تھا۔ یہ کتاب چودہ دینار سے زیادہ کی ہیں کیونکہ یہ ایک کافر یونانی کی لکھی ہوئی ہے جسے مرے ہوئے عرصہ گزرا۔"

یاسمین کے باپ نے جواب دیا "نہیں جناب" بوڑھے نے بھاؤ تاؤ کرنا شروع کیا صرف کتاب بغیر شکلوں کے اس سے دوگنی قیمت کی ہے اور پھر اس کی یہ جلد......"

ایک گھنٹے تک وہ قیمت پر بحث کرتے رہے اور یاسمین اشتیاق سے ان کی گفتگو سنتی رہی اسے یہ معلوم تھا کہ عمر اس کتاب کو حاصل کرنے کا کتنا خواہش مند ہے۔ بالآخر رحیم نے یہ کتاب انیس دینار اور کچھ تانبے کے سکوں کے عوض خرید لی۔ اس کے بعد پھٹے ہوئے صفحے کا کوئی ذکر نہ ہوا۔ جب دونوں طالب علم دوکان سے چل

دیے تو یا سمین نے دیکھا کہ عمر نے چلتے چلتے ذرا ٹھہر کر اس نے اپنی جیب سے ایک قلمدان نکالا جس پر بہت عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ یہ قلمدان اس نے زبردستی رحیم کے ہاتھ میں دے دیا اور واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے بھاگ گیا۔

وہ شام ابراہیم خیام کے بیٹے کے لیے ایک یادگار شام تھی۔ اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور چشمے پر سے اپنے ہاتھ دھو کر بڑی احتیاط سے بھیڑ کی کھال کے تولیے سے انہیں پونچھا اور اس نے مزید ایک چراغ کا بندوبست کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ خام کمرہ مکان کی چھت پر واقع تھا۔ اسے پیاز سکھانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ عمر نے اسے معمولی کرائے پر لے رکھا تھا یہاں وہ رات کی تنہائی میں ستاروں کا نہایت اطمینان سے مطالعہ کرسکتا تھا۔ جب رات کے وقت میدان میں ہوا چلتی تو سوکھی گھاس اور پیاز کے چھلکوں سے ایسی آواز آتی کہ جیسے وہ زندہ ہو گئے ہوں۔ یہاں عمر اپنے بستر پر لیٹ کر مکانوں کی چھتوں اور قصر سلطانی کے مدور گنبد کو دیکھ سکتا تھا۔

اس رات ہوا کچھ ایسی تیز نہ تھی۔ عمر نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہے اور دوسرا چراغ بھی روشن کرلیا دونوں چراغ دیوار کے طاق میں رکھ دیے اقلیدس کے نسخے کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ اس کے صفحے پلٹنے لگا۔ مکتب میں طوطے کی طرح سبق رٹنے کے مقابلے میں اسے یوں مطالعہ کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔

اس نے ابرو جن میں ایک مردانہ حسن تھا۔ سمٹ گئے آنکھوں میں اشتیاق کی چمک پیدا ہوگئی۔ اور اس نے قلم دوات اور روئی کے کاغذ کا ایک ورق لیا۔ جس پر

سے سال ہا سال پہلے کی ایک تحریر کو اس نے مٹا دیا تھا۔ پھر پیانے اور پرکار کی مدد سے اس نے کاغذ پر ایک گاؤ دم شکل بنا کر اس کے ٹکڑے کیے۔ اس کا دماغ حساب لگانے میں مشغول تھا انگلیاں شمار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ اپنے کام میں اتنا غرق تھا کہ کمرہ چراغ بلکہ کتاب کی شکل بھی اس کے ذہن سے محو ہو گئی...... پھر ایک لمحے کے لیے کسی جانی بوجھی آواز نے اس کی محویت میں خلل ڈال دیا۔

یہ عشاء کی اذان کی آواز تھی لڑکے نے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ اسے نماز پڑھنی چاہیے۔ اس نے چراغوں کو گل کر کے ایک نیا سوال حل کرنے میں مشغول ہو گیا۔

آدھی رات کے قریب پھر اس کے انہاک میں خلل پڑا نیچے گلی میں اسے چلنے پھرنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ مشعلوں کی روشنی نظر آئی اور ایک کرخت آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر منڈیر تک گیا اور دیکھا کہ ایک دبلا پتلا شخص سر پر سیاہ عمامہ باندھے مجمع کے بیچ میں کھڑا ہے ''مومنو'' یہ کہہ کر اس شخص نے اپنے بازو پھیلائے عمر پہچان گیا کہ یہ کوئی ''حنبلی'' ہے۔ ''مومنو بہت قریب ہے وہ دن جب تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے عیش و آرام میں زندگی گزاری ہے ایک تنبیہ کرنے والا آئے گا۔ وہ دن آ رہا ہے جب تمہیں کافروں کے خلاف تلوار اٹھانی پڑے گی۔ اور جب وہ دن آن پہنچے گا تو تمہیں آرام دہ بستروں سے اٹھانے کے لیے ڈھول پیٹا جائے گا۔ کہ تم تلواریں سونت کر کافروں کو اس طرح مار بھگاؤ گے جیسے تیز ہوا ریت کو اڑا دیتی ہے۔ اس تنبیہ پر غور کرو!''

شکستہ حال حنبلی اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر اپنی آواز کے تیر رات کی تاریکی میں پھینکتا رہا۔ بیکار لوگ آپس میں گپ لڑاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے عمر نے اس کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سنی کیوں کہ وہ شخص بڑا خوش تقریر تھا۔ لیکن جنگ!

کیا سلطان ہمیشہ جنگ میں مصروف رہتا تھا؟

جب حنبلی آگے بڑھ گیا اور موموں کی صدا مکانوں کی چھتوں سے بلند ہونے والی آوازوں میں مدغم ہو گئی تو عمر نے سر اٹھا کر ستاروں کی ترتیب پر نظر ڈالی۔ یکا یک اسے جماہیاں آنے لگیں۔ انگڑائی لیتے ہوئے اس نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیے۔ اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا مل شانوں تک اوڑھتے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی ایک ہی لمحہ گزرا تھا کہ وہ بے خبر ہو گیا۔

اتفاق سے یاسمین کو وہ موقع مل گیا جس کی اسے تمنا تھی۔ اس کی ماں نے چشمے سے ایک گھڑا پانی لانے کے لیے اسے بھیجا۔ چنار کے درخت کے نیچے چشمے تک خالی گھڑا لے جانا تو بہت آسان تھا مگر جب گھڑا بھر گیا تو یاسمین اپنے چھوٹے سے سر پر گھڑا رکھ اٹھا کر رکھنے کی کوشش سے کسمساتی رہی۔ اسی دوران عمر وہاں آ نکلا اور چشمے پر جھک کر اس نے اوک سے پانی پیا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ وہ اپنے کسی دوست سے حجت میں بھی مصروف نہ تھا۔ اس نے سنجیدگی سے یاسمین کو سلام کیا۔ اس سے پہلے کہ عمر آگے بڑھے۔

''ارے کچھ بات کرو'' بے ساختہ یاسمین کی زبان سے نکلا۔

''میں کیا بات کروں''۔

یاسمین ڈری کہ کہیں عمر چلانہ جائے ''میرے ابا جان کہتے ہیں کہ تم بڑے ظریف ہو۔تم کیوں اپنی عاقبت خراب کرنے کے درپے ہو؟''

عمر نے یاسمین کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی طوطی ہے جسے یک بیک گویائی مل گئی ہو۔

''یہ کہیں بہتر ہے'' اس نے جلدی سے کہا کہ ''تم لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرو ان کا مذاق نہ اڑاؤ۔وہ کبھی کبھی قند کھلائیں گے۔

اچھا بتاؤ تم کتنے بڑے ہو۔جب تم مدرسے سے باہر ہوتے ہو یا کچھ سوچتے وو چتے نہیں یا رحیم کے پاس نہیں بیٹھے ہوتے۔تو اس وقت تم کیا کرتے ہو؟''

''جی'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا ''میں سترہ سال کا ہوں۔کبھی کبھی اپنے ابا کی دکان پر چلا جاتا ہوں جو خیموں کا بیوپار کرتے ہیں۔ان کا انتقال ہو گیا ہے۔لیکن رحیم۔رحیم تو جا رہا ہے''۔

یاسمین کا دل شوق میں چٹکیاں لینے لگا۔شرماتے ہوئے اس نے لڑکے کی طرف دیکھا اور ذرا کھسک کر پتھر پر اپنے پہلے میں اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کی

''اچھا یہ بتاؤ'' اس نے بڑے بیتابانہ انداز میں کہا ''تم کیا کام کرنا جانتے ہو؟''

''اور تم کیا سوچتی رہتی ہو۔جب بچے نہیں کھلاتیں۔پانی نہیں بھرتیں یا جب کپڑے نہیں دھوتیں......؟''

یاسمین نے بڑی مایوسی سے محسوس کیا کہ ایک طالب علم جو مدرسے میں استادوں سے بحث کرتا ہے۔قرآن کی آیات پڑھتا ہے جو اسے حفظ ہے اور جسے اسی قسم کی اور

بہت سی مصروفیات ہیں۔ بھلا اس غریب سے کیا تعلق۔ لیکن یہ اس کی غلط فہمی ثابت ہوئی کیونکہ عمر اسکے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے سوچ کر کہا "میں چاہتا ہوں میرے پاس ایک رصد گاہ ہو"۔

یاسمین کو اگرچہ یہ معلوم نہ تھا کہ رصد گاہ کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن وہ کوئی دوسری غلطی کرنا نہیں چاہتی تھی "اور پھر......"

"اور اس کے ساتھ افقی گلوب۔ اور بطلیموسی نظام ہیئت کی جدول" اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک رصد گاہ کی تعمیر کے لیے بہت کچھ چاہیے۔ یاسمین نے سوچا کہ عمر کو ایک مینارے کی آرزو ہے جو بالکل تنہا ہو۔ جو شاید اس سبزہ زار کی طرح ہوگا جہاں سفید ہنس راج رہتے ہیں اور جو اس کے خوابوں میں بستے ہیں۔

"ہاں ہاں میں جانتی ہوں" اس نے سر ہلا کر کہا "تم سیدی احمد کی طرح جوتشی بن کر ستاروں کی گردش سے لوگوں کی تقدیریں پڑھنا چاہتے ہو۔"

اس کے گھر کی بڑی بوڑھیاں جوتشی سیدی احمد کو بہت مانتی تھیں۔

......عمر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس کی بھویں سکڑ کر ایک دوسرے سے مل گئیں اور اس نے دانت پیس کر کہا۔ "وہ احمقوں کا باپ ڈھینچو ڈھینچو کرتا ہوا گدھا اپنے اوٹ پٹانگ منتر اور زائچے لیے پھرتا ہے"۔

ایسا معلوم ہوا کہ عمر کو تقدیر کا حال بتانے والوں پر اعتقاد نہیں ہے۔ جو وہ کرنا چاہتا تھا وہ یاسمین کی سمجھ سے باہر تھا۔ عمر کو وقت کا تعین کرنے کے لیے ایک رصد گاہ کی ضرورت تھی۔ یاسمین کے دماغ میں وقت کا تصور طلوع آفتاب سے شروع ہوتا

تھا۔ پھر پانچ وقت کی نمازیں اور ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہو جاتا تھا۔ رہا مہینوں کا شمار تو اس کے لیے ظاہر ہے کہ چاند موجود تھا۔

عمر بہر حال اس سلسلے میں چاند سے مطمئن نہ تھا۔ چاند اپنے راستے پر چلتا رہتا ہے اور سال میں وقت کے کئی گھنٹے شمار کرنے سے چھوڑ دیتا ہے۔ آخر انسان سال میں ان گھنٹوں کا نقصان کیوں کریں۔ اس میں چاند کا قصور تھا لیکن اس کے باوجود گھنٹوں کا صحیح شمار کرنے کی غرج سے لوگوں کو چاند سے قطع تعلق کرنا بھی گوارا نہیں۔

یاسمین نے بڑے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔ اس کے دماغ میں اور بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ اگر عمر کو ایسی رصد گاہ میسر آ جائے اور وہ اس سے ذرا بھی محبت کرے تو وہ اس رصد گاہ میں جھاڑو دے گی۔ اس کے کپڑے دھوئے گی اس کے جوتوں پر کشیدہ کاری کرے گی۔ اور دونوں رات دن اس رصد گاہ میں ہی رہا کریں گے۔

یاسمین ابھی گھر واپس جانا نہ چاہتی تھی۔ وہ ابراہیم کے بیٹے کی آواز سے محظوظ ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس کے خوبصورت چہرے کے اتار چڑھاؤ سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ بغیر عمر کے اس کا وجود خالی محسوس ہو گا۔ محض بیکار۔ اور کبھی دنیا کی کوئی چیز اسے خوش نہ کر سکے گی۔ وہ کھسک کر اس کے اور قریب آ گئی۔ اس نے گلاب کے پھول کو زور سے مٹھی میں دبا لیا جو اس نے اپنے بالوں میں لگانے کے لیے توڑا تھا۔

''تمہیں یہ پسند ہے؟'' یاسمین نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ اس وقت عمر خیام

چاند کے ناقابل معافی جرم پر بحث ختم کر چکا تھا۔

"کیا او وہ یہ کیوں......" اس نے پھول اپنی انگلیوں میں لے لیا اور اسے سونگھا

"کیا یہ تمہارا ہے؟"

"میں چاہتی ہوں تم یہ قبول کر لو" بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "اور اسے اپنے پاس رکھو"۔

(ایک مرتبہ اس کی بہن نے بھی اسی طرح ایک پھول جھروکے سے نیچے پھینکا تھا اور یاسمین نے دیکھا تھا کہ بغداد کے ایک نوجوان نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا)۔ ابراہیم کے بیٹے نے اس پھول کو محض دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کا دماغ ابھی تک چاند کے ساتھ بھٹک رہا تھا۔ یاسمین نے ایک مرتبہ پھر عمر کو اس زمین کی اور خود اپنی جانب واپس لانے کی کوشش کی۔

"جب تمہیں اپنی رصد گاہ حاصل ہو جائے گی......" یاسمین نے سوچا کہ وہ رصد گاہ قلعہ کے برج کی سی ہو گی "تو میں...... بہت خوش ہوں گی"۔

عمر یہ سن کر مسکرایا "یاسمین بھلا تمہاری عمر کیا ہو گی"؟

"یہی کوئی تیرہ برس" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اس نے اپنی ماں اور دوسری شادی شدہ عورتوں کو کہتے سنا تھا کہ جب لڑکی تیرہ برس کی ہو جائے تو اس کی شادی کر دینی چاہیے۔

"جب تم پورے تیرہ سال کی ہو جاؤ گی تو میں تمہارے لیے گلاب کے پھول بھیجوں گا بہت سارے"۔

وہ وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔ اسے اس بات پر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ دھاری دار کپڑوں میں ملبوس اور بھوکی آنکھوں سے تکنے والی بچی سے وہ کتنی دیر تک باتیں کر طرح کرتا رہا لیکن یاسمین جہاں تھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں جذبات سے معمور تھیں۔ مسرت سے اس کے تمام جسم میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ اس نے گدھوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنی اور لوگوں کی آوازیں بھی جو اسے دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ساری گلی اسے کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی اور آنے جانے والے تمام مرد اجنبی سے دکھائی دیے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اب یہ تمام کائنات کبھی اپنی عام حالت پر واپس نہ آئے گی...... چشمے کے کنارے اتنی دیر تک بیٹھے رہنے پر جب اسے گھر کی عورتوں نے تھپڑ مارے تو اس نے اس بات کا بھی خیال نہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر وہ بھاگی ہوئی باہر آ گئی اسی جھاڑی سے گلاب کا ایک پھول توڑا اور اسی رات بلی کے بھورے بچے کو اٹھا کر اپنے بچھونے پر آ کر لیٹ گئی۔

''اب وقت آ گیا ہے'' دوسرے دن گھر کی عورتوں میں سے کسی نے تجویز کیا ''یاسمین کو نقاب پہنانی چاہیے اور چار دیواری میں رکھنا چاہیے۔ خدا کی پناہ...... لوگوں نے اسے چشمے کے کنارے گھنٹہ بھر ایک بے ریش طالب علم کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا ہے''۔

''آئندہ وہ دکان میں کام نہیں کرے گی'' اس کی ماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ یاسمین خاموش رہی آخر ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ بہر حال اب وہ شادی کے

قابل عورتوں کی طرح نقاب تو پہنا کرے گی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ دیواروں اور چلمنوں کی ظاہری حدیں اس کی محبت کو مقید نہیں رکھ سکتیں۔

لیکن عمر کہیں باہر چلا گیا۔

شاہراہ خراسان پر پہاڑیوں میں ایک سرائے باربردار اونٹوں کے کاروان کے لیے نیشاپور کے مغربی علاقے تک تین ہفتے کا سفر

آدھی رات تک کوئی سو نہ سکا اوسو ہی کیسے سکتا تھا۔ کھلے ہوئے صحن میں آگ روشن تھی جس میں خاردار جھاڑیاں جل جل کر چیخ رہی تھیں۔ اونٹ بیٹھے بیٹھے بلبلا رہے تھے۔ سرائے کے مختلف گوشوں میں کھڑے ہوئے گھوڑے سوکھی گھاس زور زور سے چبا رہے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ گداگر اپنے ہاتھوں میں کشکول اٹھائے مسلسل یاہو یا حق کی صدائیں لگاتے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

لوگ خالی دیگچیوں کے اردگرد بیٹھے اپنی انگلیاں چاٹ رہے تھے۔ جو کھانے کے بعد چاول اور چکنائی سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ ذرا رک کر کبھی کبھی خشک میوے یا تانبے کے سکے وہ گداگروں کے کشکولوں میں بھی ڈال دیتے تھے۔ ان کے دلوں میں خیرات کا جذبہ اس لیے کارفرما تھا کہ وہ سفر کر رہے تھے۔ اور سفر میں کیسا پرخطر سفر! خیرات کرنا تو ویسے بھی ثواب کا کام ہے۔

سرائے کا مالک چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ پانی کا ایک ایک قطرہ ختم ہو چکا ہے وہ موسیٰ تو ہے نہیں وہ ایسی حالت میں پانی کہیں سے پیدا کر دے۔ اور اس دوران میں

وہ بڑی چالاکی سے اپنے کیسے میں رقم کا شمار بھی کرتا جاتا تھا۔ شاہراہ خراسان پر سرائے میں ان دنوں بڑی گہما گہمی تھی۔ حتیٰ کہ وسط سرما میں بھی روزانہ سینکڑوں آدمی ادھر ادھر سے گزر رہے تھے۔ اور سب کے سب فوج میں شامل ہونے کے لیے مغرب کی سمت سفر کر رہے تھے۔

سرائے کے کشادہ صحن کے چاروں طرف مسقف دالان بنے تھے ان دالانوں میں لوگوں نے قدم قدم پر بھیڑ کی کھالیں بچھا رکھی تھیں۔ کچھ نے انگیٹھیوں میں کوئلوں کی آگ روشن کر رکھی تھی جس کی روشنی میں ان کے باریش چہروں کی جھریاں تک صاف نظر آ رہی تھیں۔ خراسانی ایرانی اور عرب قاقم و سنجاب کے دوہرے لبادے پہنے مسکرا مسکرا کر شگفتہ انداز میں بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ پہاڑوں کی یخ کر دینے والی ہواؤں میں سفر کرنے کے بعد انہیں یہ آرام بہت خوش گوار محسوس ہو رہا تھا۔ صرف چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں والے سپاٹ ترکی چہرے احساس سے خالی نظر آتے تھے۔ وسط ایشیاء کے لق و دق صحراء سے آنے والے ان جفاکش سواروں کے لیے سردی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ جنگ اور آوارہ گردی کے عادی تھے اور بہت ہی کم باتیں کرتے تھے۔

نیشاپور کے زمیندار کے بیٹے رحیم زادہ کے پاس اتفاق سے ایک انگیٹھی تھی۔ وہ سمور کے استر کا ایک نفیس خلعت پہنے انگیٹھی کی گرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ایک رات جب وہ دروازہ بند کر کے شراب پی رہا تھا تو اس وقت ایک پرجوش حنبلی کی صدا اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے اس صدا کو اپنے لیے ایک تنبیہ

تصور کیا تھا۔ رحم علاوہ کھیل تماشوں کے موقعوں کے عموماً بڑا کاہل واقع ہوا تھا۔ لیکن اس تنبیہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسے اس جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے چاہئیں اور اسی جذبہ کے تحت وہ اپنے رضاعی بھائی عمر خیام اور ایک مسلح دستے کے ساتھ مغرب بعید میں سلطان الپ ارسلان کی ٹڈی دل فوج میں شامل ہونے کے لیے چل پڑا تھا۔

''بہر حال'' اس نے کہا ''میدان ایک ہرن کا تعاقب کرنے کے مقابلے میں تو زیادہ جذبات انگیز ہوگا''۔

رحیم قدیم ایرانی شرفا کی نسل سے تھا۔ وہ ایرانی شرفا جو یونانیوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ وہ بڑا نفیس مزاج کا انسان تھا۔ اعلیٰ قسم کی شرابیں پینے کا دلدادہ۔ اسے چوسر اور چوگان کھیلنے کا بڑا شوق تھا مگر وہ ان سے بہت جلد اکتا بھی جاتا تھا۔

''بخدا'' اس کا ایک ساتھی بڑبڑایا ''کیا کڑاکے کی سردی ہے''۔

رحیم نے جماہی لی۔ واقعی سردی تیز تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بستر والی کھال میں کچھ کھٹمل بھی گھس آئے تھے۔ اتنے میں سرائے کا مالک اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اور جانے کا نام نہ لیا تو رحیم نے اسے سر اٹھا کر دیکھا۔

''عالی مرتبت نوجوان امیر کو ناگوار نہ گزرے تو عرض کروں'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا ''سرائے کی پشت کے مکان میں کچھ مسافر عورتیں مقیم ہیں''۔

عالی مرتبت نوجوان امیر نے کسی ناگواری کا اظہار نہ کیا تو سرائے کے مالک نے جھک کر کہا ''کچھ لڑکیاں بغداد سے آئی ہیں بڑی خوش مذاق اور تربیت یافتہ ہیں''

اس نے اس افسانہ طرازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہ اس مکان کے مکین مسافر ہیں۔ رحیم سے صاف صاف کہا ''اگر تیغ زنوں کے امیر کو تفریح کی ضرورت ہو......''

رحیم قدرے ہچکچایا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ ''ابراہیم کے بیٹے سے کہو'' اس نے اپنے ملازم کو حکم دیا ''کہ میں جا رہا ہوں تھوڑی دیر کے لیے کچھ اپنے دوستوں سے باتیں کرنے''

''بسرو چشم'' بڑے ادب سے اس شخص نے کہا۔

جب رحیم سرائے کے مالک کے پیچھے پیچھے زینے کی طرف بڑھا تو تیغ زنوں نے بڑے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ انگیٹھی پر ہاتھ تاپتے ہوئے سو گئے۔

خاصی دیر بعد رحیم واپس آیا۔ مردوں کی طرح سوتے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا۔ وہ تھکا ماندہ اور پژمردہ تھا۔ خدا کرے سرائے کے مالک کی سات پشتیں دوزخ کی آگ میں جلیں۔ رحیم بڑبڑایا۔ ''خدا کرے وہ غلاظت کھائیں'' وہ دھڑام سے بستر پر گر گیا۔ مگر اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عمر جاگ رہا تھا۔ اس نے شکایتاً کہا ''تو کہاں غائب ہو گیا تھا''۔

''یوں ہی گھوم رہا تھا اف اس شاہراہ پر کیا گہما گہمی ہے''۔

عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شاہراہوں کے مناظر اور ان سے بھی زیادہ ریگستانی سڑکیں اس کے اندر ایک ولولہ پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ خود ریگستان میں پیدا ہوا تھا اور اس کی رگوں کے میں عرب خانہ بدوشوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس طرف ایک بڑی خیمہ گاہ ہے اور اس خیمہ گاہ میں اتنا بڑا خیمہ ہے جیسے نیشاپور کا چھوٹا قلعہ

وہاں ترک ہی ترک بھرے ہوئے ہیں مسلح سونے کے خود پہنے۔ میں ان کی گفتگو تھوڑی تھوڑی سمجھتا ہوں۔ وہاں آج رات کو کوئی شہزادہ ٹھہرا ہوا ہے۔ میں اسے خود دیکھ کر آرہا ہوں۔

رحیم نے ایک گہرا سانس لیا عمر کا یہ عمل اس کی شدت جذبات ہر بات میں دخل اندازی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کے خیال کے تحت تھا۔ ابراہیم کے بیٹے کے لیے جنگ بالکل نئی چیز تھی۔ حتی کہ وہ اپنی حد سے باہر اجنبی گھڑسواروں کو دیکھنے بھی گیا۔ پڑاؤ کے بعض حصوں میں جا کر اس نے لوگوں سے سوالات بھی کیے۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اونٹوں سے اتارے ہوئے مال کا جائزہ تک لے ڈالا۔ دریا کو تیر کر عبور کرنے میں عمر کو بڑا مزہ آیا۔ برخلاف اس کے رحیم دریا پار کرنے میں بھیگ کر چوڑا ہو گیا۔ کسے دیکھا ہے؟ رحیم نے عمر سے پوچھا۔

''میں کچھ سن نہیں سکا۔ وہ اپنے خیمے میں آگ کے قریب ایک سرخ جاجم پر بیٹھا ہوا تھا اور حکماء سے بات چیت کر رہا تھا جو شاید اس کے استاد تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں کوئی دو سال چھوٹا ہو گا۔ وہ دھاری دار سمور کا سفتان پہنے تھا۔ حکیم اور عالم اس سے کہہ رہے تھے کہ جو ستارہ اس نے دیکھا تھا وہ سہیل تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بات غلط تھی۔ اس مقام سے اس وقت سہیل کسی کو نظر نہیں آسکتا''۔

''ارے یہ تو میں بھی جانتا ہوں'' رحیم نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا ''وہ کیا ضرب المثل ہے......''

کہ ''سہیل دیکھنا خوش نصیبی کی نشانی ہے......ہاں''

"ترکوں کے سامنے بولنے کی تو نے جرات کی؟ آخر کس طرح"؟

"میں نے عربی میں بات چیت کی" عمر نے شگفتہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا "وہ ترخان بچہ ستاروں کا جھمکا (عقد ثریا) دیکھنے کے لیے میرے ساتھ خیمے سے باہر تک آیا۔ وہ سب عالم بے وقوف تھے اور بے وقوفی کی باتیں کر رہے تھے......"

"نہیں نہیں تو بڑا غیر ذمہ دار ہے۔ تو نے انہیں جھٹلا کے بیوقوفی کی۔ تیری سمجھ میں یہ بات کب آئے گی کہ اس شخص کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولنی چاہیے جو تیرے منہ پر جوتا مار سکتا ہے" رحیم کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ ڈر بھی لگا۔

"شہزادے نے کیا کہا؟"

"اس نے پوچھا کہ کیا یہ ستارے جنگ کے متعلق کوئی نشاندہی کرتے ہیں؟"

"بیشک کرتے ہیں"۔

نوجوان طالب علم اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور خشت زمین پر تلوار میان سے کچھ شکلیں بنانے لگا رحیم اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا "تو ہم مع...... ایران کے قدیم پجاری...... سے بھی زیادہ عقل مند تصور کیے جائیں گے۔ اگر ہم انسانی تقدیر پڑھ سکیں۔ اس کے باوجود میں نے اس لڑکے کو دکھایا کہ کو سا ستارہ کس برج میں مقیم ہے......"

"مجھ سے یہ سب بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" عمر کے دودھ شریک بھائی نے بڑی بے صبری سے چلا کر کہا "کیا شگون نکلتا ہے؟"

عمر نے اپنا سر ہلایا' زرتشت کی گفتگو کان لگا کر سنو۔ بادشاہ برسر جنگ ہیں۔ اور آسمانوں سے یہ ندا آتی ہے کہ مشرق کے بادشاہ کا مقدر عروج پر ہے اور مغرب کے حکمران کا زوال پذیر ہے۔...... لیکن پیشن گوئی سنو...... موت کا سایہ دونوں پر چھایا ہوا ہے' وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑا "یہ سب بے معنی باتیں ہیں لیکن شیر بچے نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے وہ کسی بھوت کو دیکھ رہا ہو"۔

"شیر بچہ" رحیم کی آنکھیں جیسے پھٹ گئیں "کیا کہا......؟"

"وہی شہزادہ جو سفید کفتان پہنے تھا سب لوگ بہر حال اسے اسی نام سے مخاطب کر رہے تھے"۔

"برلیش پدرم" رحیم نے گہرا سانس لیا "تو نے اس سے پہلے کبھی شیر بچے کا نام نہیں سنا تھا؟"

"نہیں"۔

"خدائے رحمان و رحیم تیرا ساتھ دے شیر بچہ صرف ایک ہی ہے وہ سلطان الپ ارسلان شیر بہادر کا سب سے بڑا فرزند ہے۔ تو نے شہزادہ ولی عہد سے فتح کی پیشن گوئی کی ہے"۔

"میں اسے نہیں جانتا تھا"۔

"مگر اس کا یقین کون کرے گا کہ اس کے علاوہ تو نے اس کے باپ کی موت کی پیشن گوئی بھی کر دی ہے" جو...... رحیم نے مختلف امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا "کوئی سمجھدار نجومی کسی حالت میں مجمع عام میں ایسی پیشن گوئی نہیں کرے گا ......

تاہم شیر بچے کے لیے صاحب تاج وتخت ہونے کے مترادف ہے۔ اچھا پھر اس نے کیا کہا؟

''اس نے میرا نام پوچھا۔ اور میں نے بتا دیا۔ اس نے پوچھا کہ تم کس کے ملازم ہو میں نے کہا کسی کا بھی نہیں۔ میں تو نیشاپور کے مدرسے کا طالب علم ہوں''

'ہوں اگر مجھے اپنے ترک آقاؤں کو غلط اندازہ نہیں ہے اور اگر واقعی الب ارسلان مر گیا تو سیدھا اس شیر بچے کی خدمت میں حاضر ہو کر شاہی منجم کا اعزاز طلب کرسکتا ہے۔ اگر تجھے یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو ایک معقول تنخواہ پر مجھے اپنا فراش مقرر کر دینا''۔

عمر نے سر ہلایا۔

'میرا خیال ہے'' رحیم نے اصرار کرتے ہوئے کہا ''باوجود بے پراوئی کے تو ایک عمدہ جوتشی بن سکتا ہے۔ ہر شخص تیری بات کا اعتبار کرتا ہے'' اویر ماق......'' اس نے ایک سوئے ہوئے ملازم کو ٹھوکر ماری۔ یرماق۔ چمڑے کے تھیلے سے صراحی نکال کر لا۔ اور ایک جام بھی''۔

رحیم نے ہاتھ میں جام لیا تو یرماق نے اس میں شراب انڈیل دی۔ شراب جو حرام ہے رحیم جو اس کا دلدادہ تھا سرگوشی کے انداز میں کہا کہ مقدس جنگ لڑ کو جو ثواب عظیم حاصل ہونے والا ہے اکے مقابلے میں اس چھوٹے سے گناہ کی کیا حیثیت ہے۔ عمر نے سنی ان سنی کر دی۔ اسے اپنے دودھ شریک بھائی سے بڑی محبت تھی۔ وہ خاموش رہا۔

''تاہم'' رحیم نے جیسے ہی جام خالی کیا تو عمر بولا ''مجھے خوف ہے کہ کہیں ہمیں جنگ میں شکست نہ ہو جائے''

''نہیں نہیں ہمیں شکست نہیں ہو سکتی'' رحیم نے بلند آواز سے کہا۔

''بفرض محال ہمارا سلطان ایک معمولی سپاہی ہے لیکن اسے آج تک ہر معرکے میں فتح نصیب ہوئی ہے۔ بہر کیف یہ ایک قابل یقین پیشن گوئی تھی'' خوش ذائقہ شراب سے اس کی طبیعت ذرا سنبھل گئی۔ اس نے دوسرا جام پیا۔ اور تصور کیا کہ جیسے وہ میدان جنگ میں ہے اور سلطان کے سرخ پرچم کے ساتھ ساتھ اپنے قد آور ابلق گھوڑے پر سواری بڑی بے خوفی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ دونوں فوجوں کی پہلی صفوں کے درمیان مسیحیوں نے ایک یگانہ روزگار سورما ایک آہن پوش جنگجو سے دست بدست نبرد آزما ہے۔ اس نے تصور ہی تصور میں اپنے تئیں کافر جنگجو کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا کہ مسلمان ہر طرف اس کی تعریف کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس نے اپنے دشمن کا سر اتار کر اپنے سلطان کے گھوڑے کے قدموں میں ڈالنے کا خیال باندھا......''

''ذرا لینا اے عمر'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کا دودھ شریک بھائی اپنے اونٹ کے بالوں والے کمبل میں لپٹا ہوا بالکل بے خبر سو رہا تھا جیسے جنگ فتح اور رعایات شاہی کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

نیشاپور لیس مغربی کی سمت ایک باربردار اونٹ کی پانچ ہفتے کی مسافت پر دریائے ارسناس کی وادی جو آرمیبیا کے پہاڑوں کی نیلی جھیل وان سے نظر آتی ہے 1071ء کے موسم بہار کا آغاز

شاہی مسخرا جعفرک اپنے سفید گدھے پر بیٹھا سوچ رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں گدھے کے پیٹ کے دونوں طرف لٹک رہی تھیں۔اس کا جسم ایک سرخ چغے میں ڈھکا ہوا تھا۔صرف اس کی بھوری آنکھیں بے چینی سے جلد جلد گردش کر رہی تھیں۔وہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے فکر مند آقا سلطان الپ ارسلان کو تنہا چھوڑے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے جو جنگ کرنی ہے وہ کوئی معمولی جنگ نہیں ہے۔

لوگوں نے جعفرک سے کہا تھا کہ وہ سامان کے پاس اور مولویوں کے ساتھ بیٹھے کیونکہ ان کی رائے میں یہ انتہا محفوظ جگہ تھی۔لیکن جعفرک نے انہیں جواب دیا ''میرے لیے سب سے محفوظ جگہ اپنے سلطان کی رفاقت ہے کیونکہ مسلمان ادھر تیر نہیں پھینکیں گے اور عیسائیوں کے فرشتے بھی کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتے......''

جعفرک کی اس بات سے مخدوم عالمیان فرمانروائے شرق وغرب سلطان الپ ارسلان سلجوقی بہت خوش ہوا چنانچہ جعفرک اس سرخ پرچم اور شاہی چتر کے قریب ہی ڈٹا رہا جو مسلح غلام الپ ارسلان کے سر پر لگائے ہوئے تھے۔الپ ارسلان نے ان دنوں ہنسنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ جنگ طول کھینچ گئی تھی اور مسلمان فوجوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔

الپ ارسلان نے ملاذگرد کی شہر پناہ کے قریب اور وادی کے فراز میں اپنا جھنڈا

گاڑ دیا تھا۔ اس کے خیمے کے سامنے وسیع اور زرخیز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وادی میں ملعون رومیوں کا عیسائی فوجوں کے دل بادل بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کثیر فواج کی کمان قسطنطنیہ کا شہنشاہ خود کر رہا تھا...... وہ شہنشاہ جس کے آباؤ اجداد چار سو سال سے اسلام کے ساتھ سخت دشمنی کرتے چلے آ رہے تھے۔

اس سے قبل الپ ارسلان اس شہنشاہ کی سلطنت میں محض چھاپے مارنے پر اکتفا کرتا رہا تھا اور ایشیائے کوچک کے اہم علاقوں میں جو ایشیا میں سلطنت روما کے مرکزی علاقے تصور کیے جاتے تھے سلطان کے سوار وقتے یلغار کرتے تھے' لیکن اب سلطان کے ان حملوں نے رومیوں کو غضب ناک کر دیا تھا اور بالآخر شہنشاہ روم نے اس جنگجو ترک پر جس نے اسے بڑی جرات سے چیلنج کیا تھا اور بآخر شہنشاہ روم نے اس جنگجو ترک پر جس نے اسے بڑی جرات سے چیلنج کیا تھا اور جس کے آباؤ اجداد نے جو توقاق ماںڈر کی اولاد سے تھے وسط ایشیاء کے میدانوں سے نکل کر قریباً قسطنطنیہ تک دھاوے مارتے تھے' جوابی حملہ کے لیے اپنی پوری طاقت کو یکجا کر لیا تھا اب یہ شہنشاہ کثیر التعداد سوار اور پیادہ فوجوں کے ہمراہ بھاڑے کے یلغاری تیر اندازوں' جارجیا کے خوفناک نیزہ بازوں اور ارمنی سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا جو اپنے ملک کو مسلمانوں کے حملے سے بچانا چاہتے تھے۔ چیونٹی کی چال بڑھنے والی ٹڈی دل فوجوں میں نسل در نسل کے لوگ تھے۔ یہ ستر ہزار کی فوج وادی میں آہستہ آہستہ اس ترک فوج کا تعاقب کر رہی تھی جس کی تعداد کل پندرہ ہزار تھی۔

عیسائی شہنشاہ جو خود ایک عمدہ سپاہی تھا ان ترک سواروں سے جو اسے مہینوں

سے چکمے دے رہے تھے، دست بدست جنگ کرنے کے لیے بے تاب تھا لیکن اب خود شہنشاہ کے افسروں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سلطان الپ ارسلان نے زمین پر اپنا پرچم گاڑ دیا تھا اور اپنے سوار دستوں کو شہنشاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے وادی میں تعینات کر دیا تھا۔

جعفرک کو اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ پندرہ ہزار نفوس ایسی صورت میں جنگ کا انتظار کر رہے ہیں جبکہ ستر ہزار فوجیں ان کے تعاقب میں ہیں۔

اس نے بعض امیروں کو اس وقت جبکہ ان کے خیال میں ان کی باتیں درباری مسخرے کے علاوہ کوئی نہیں سن رہا تھا' یہ کہتے سنا تھا کہ رومیوں کے کثیر التعداد نیزہ بازوں کی تاب جنگ آزمودہ ترک سوار نہیں لا سکتے۔ اس نے سوچا کہ پھر بھی الپ ارسلان اپنے سواروں کے لیے جنگ کا منتظر ہے۔ اور عیسائیوں کی فوجیں دلدلوں میں آہستہ آہستہ بڑھتی اور ترک فوجوں کے قریب آتی جا رہی تھیں۔ جعفرک جانتا تھا کہ بہت سے ترک افسر ایک جگہ جم کر لڑنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ انہیں تو حملہ اور تعاقب کرنے یا تیزی سے پسپا ہو جانے کی عادت ہے۔

الپ ارسلان نے اپنی بھاری آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا ایسا نہیں ہو گا...... رومیوں کے خیمے وادی کے اس نشیب میں لگ چکے ہیں اور وہ ہمارے تعاقب میں آگے بڑھ آئے ہیں اور ہم یہاں موجود ہیں۔ تقدیر کا فیصلہ لکھا جا چکا ہے اور جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا''۔

جعفرک نے جو بڑے شہزادے کے قریب بیٹھا ہوا تھا دیکھا کہ شہزادے نے سر

اٹھا کر اپنے باپ کی طرف اس طرح نگاہ کی جیسے وہ ان الفاظ سے ڈر گیا ہو۔ درباری مسخرے نے دل میں سوچا کہ شاید کل کی جنگ کے نتیجے کا جیسا کہ مولویوں نے اعلان اور عاقل نجومیوں نے پیشن گوئی کی ہے فیصلہ ہو ہی چکا ہے۔ اس نے اپنے خیال میں عیسائیوں کے عظیم شہنشاہ کا بھیگے ہوئے وسیع و عریض میدان جنگ کا اور ان بے حس تلجوق سواروں کا تصور کیا جو جنگ میں شکست قبول کرنا نہیں چاہتے تھے اس نے غالباً اس جنگ کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے اور کل کی جنگ تصفیہ شدہ بازی کی مانند ہو گی اور ہم نے اس کی بساط پر مہروں کی طرح ادھر ادھر نا چیں گے اور بس۔

لیکن الپ ارسلان رات بھر نہ سویا۔

صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے رحیم اٹھ بیٹھا۔ وہ مارے سردی اور جوش کے کانپ رہا تھا۔ اس نے یارہویں مرتبہ یرماق کو اپنی تلوار آب رکھنے کے لیے دی اور دوسرے نوکروں کو اپنا ابلق گھوڑا کسنے کا حکم دیا۔ جلدی جلدی اس نے کچھ کھجوریں اور بھیگے ہوئے جو کھائے۔ اب جنگ کا ہنگام آ پہنچا تھا یہ وقت اس سے قطعی مختلف تھا جو ہرن کا تعاقب شروع کرنے سے پہلے آتا تھا جس کا نقشہ رحیم نے اپنے ذہن میں کھینچا تھا۔ بجائے اس کے کہ اسے طلوع آفتاب کے وقت سوار ہونے کا حکم دیا جاتا اور وہ نعرہ مار کر میدان میں بڑھتا رحیم مجبوراً گھنٹوں اپنے گھوڑے کے قریب بے قرار پھرتا رہا۔ کہر آلود فضا کا وہ دھندلکا جو اسے چھپائے ہوئے تھا۔ آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا اور اس کے ملازم آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے پانسے پھینک رہے تھے۔

جب رحیم اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو اسے ان سواروں کے نیزے اور سر نظر آئے جو

آہستہ آہستہ سڑک سے گزر رہے تھے۔ کبھی کبھی اسے ایسی ہوا کی سنسناہٹ سنائی دیتی جو دور کسی جنگل میں چل رہی ہو اور ایک بار وادی کے اس پار سے اس نے ایک زبردست شور سنا۔ بالکل ایسا شور جیسے کسی لنگر کے دن نیشاپور کی مسجد پر لوگوں کے ہجوم سے ہوتا تھا۔

ایک اجنبی سوار رحیم کے قریب سے گزرا تو اس نے چلا کر اس سے جنگ کا حال پوچھا۔ یہ سوار ایک ترک تھا اور اس نے صرف منہ پھیر کر رحیم کی طرف دیکھا اور اپنی راہ چلا گیا۔ رحیم بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اپنے دستے کی کمانڈر کے پاس پہنچا۔ وہ ایک امیر تھا جس کے دستے میں نیشاپور کے رضا کار سپاہی شامل تھے۔

رحیم نے بڑے اشتیاق سے امیر سے کہا "ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیجیے ورنہ ہم پہلا حملہ نہ دیکھ سکیں گے" اسے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وادی میں کئی گھنٹے سے جنگ ہو رہی تھی خراسانیوں کو عجیب عجیب خبریں پہنچی تھیں۔ انہوں نے سنا تھا کہ عیسائیوں نے آہن پوشوں دیووں کو مسلمانوں سے لڑنے بھیجا ہے۔ ایک پورا فوجی دستہ دریا میں ڈوب گیا ہے......سلطان دائیں طرف پہاڑوں میں گھس گیا ہے۔ جارجیا اور آرمینیا کی کثیر التعداد فوجیں اس پر حملہ کر رہی ہیں۔ اور وادی میں میلوں تک عیسائی فوجیں پٹی پڑی ہیں۔

اتنے میں ایک شخص چلایا لیکن غلطی سے سامنے دیکھو وہ ہمارا بادشاہ سلطان الپ ارسلان آرہا ہے......"۔

رحیم گھوڑوں کی رکابوں میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان ایک ٹیلے پر سواروں کے دستے کے جلو میں جا رہا ہے۔ اس دستے کے آگے جو سوار ہے وہ ایک سبزے (گھوڑے) پر بیٹھا ہے۔ وہ ایک لمبا چوڑا اور قوی انسان معلوم ہوتا ہے اس کے سال خوردہ چہرے پر دونوں طرف بل دی ہوئی مونچھیں ہیں اور سر پر بھیڑ کی سیال کھال کی اونچی ٹوپی ہے۔ جس ہاتھ میں لگام ہے اسی میں ہاتھی دانت کی چھڑی ہے اور پہلو میں ترکش بالکل اس انداز سے لٹک رہا ہے جیسے وہ شاہی محافظ دستے کا کوئی تیر انداز ہے۔

افسروں کی طرف دیکھ کر رحیم نے آہستہ سے پوچھا "سلطان کہاں ہے؟"

"واللہ! وہ سلطان ہی تو ہے جو سب سے آگے ہے" کسی نے جواب دیا۔ رحیم کو توقع تھی کہ سلطان وہ ہوگا جو گھوڑے پر سرپٹ دوڑاتا اور اپنا ریشمی لباس ہوا میں اڑاتا گزرے گا۔ اس کے زریں خود میں رنگین پر لگے ہوں گے...... ایک پرچم ساتھ ہوگا۔ آگے آگے نقارے بجتے ہوں گے اور نہ معلوم اس کے علاوہ کیا کیا ہوگا۔ جب اسنے ان خاموش معمولی انسانوں کو دیکھا جن کے پیچھے سفید گدھے پر ایک بونا چلا آ رہا تھا تو اسے بے حد مایوسی ہوئی اور وہ خاموشی سے اپنی جگہ واپس آ گیا۔

دوپہر کے وقت جب وہ بھوکا اور تھکا ہوا تھا تو عمر نے اسے بلا کر کہا "رحیم ادھر آؤ اب جنگ کے شعلے قریب تر آتے جا رہے ہیں۔ میں ترمانوں کے ساتھ ٹیلے پر سے جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا"۔

جب وہ اس ٹیلے پر پہنچے جہاں سے سلطان گزرا تھا تو رحیم نے ایسی آواز سنی

جیسے ہزارہا شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ اس کے کانوں میں ہتھیاروں کے ٹکرانے اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ سورج کی شعاعوں نے کہر کا پردہ بالکل چاک کر دیا تھا۔ دھوپ سے پوری وادی چمک رہی تھی اور اس کے دامن میں سواروں کی ہزارہا چھوٹی چھوٹی شکلیں ادھر ادھر دوڑتی نظر آ رہی تھیں بعض اوقات یہ شکلیں چرتے ہوئے مویشیوں کی مانند آہستہ آہستہ آگے بڑھتی اور پھر وہ اس طرح ٹیلے کی طرف پلٹ آتیں جیسے ہوا کی کسی شدید جھونکے نے انہیں دھکیل دیا ہو۔

عمر نے چلا کر کہا ''دیکھو!''

خود ان کے ملازمین کھڑے، خوشی سے ان کی طرف اشارے کر رہے تھے اور خراسانیوں کے دستے نے اسے آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

رحیم چیخ کر بولا ''بالآخر اب وہ حملہ کریں گے'' اتنے میں ایک لڑکے نے نیزہ تان کر رحیم کی رکاب پکڑ لی اور چیخا۔

''اللہ! الا اللہ! اسکی پشت میں ایک نیزہ پیوست تھا اور وہ رحیم کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتا تھا۔

رحیم کے خیال میں یہ وہی لمحہ تھا جس کا اسے انتظار تھا اس نے اپنی تلوار کھینچ لی لیکن پھر اسے نیام میں رکھ لیا کیونکہ دوسرے لوگوں نے اپنی ڈھالیں سنبھالنے کے علاوہ تلواریں نہیں کھینچی تھیں۔ نیزے والے لڑکے سے جب گھوڑے کے ساتھ بھاگا نہیں گیا تو وہ زمین پر یہ کہتا ہوا گرا ''قتل کر دو۔ قتل کر دو!'' اب یہ سوار جتے ہوئے کھیتوں میں دوڑتے اور نالے پھاندتے آگے بڑھ رہے تھے۔

انہیں وادی کے میدان میں دوڑتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا لیکن اب یہاں ان کے گھوڑے مقتول سپاہیوں کے ان جسموں کو دیکھ کر بھڑکتے تھے جو آدھے کیچڑ کے اندر اور آدھے باہر تھے۔ ان کے پاس بہت سے ایسے گھوڑے بھٹکتے پھر رہے تھے جن کے سوار غائب تھے اور عرب قبائل مال غنیمت لوٹنے میں مصروف تھے۔

رحیم نے جو جنگ کے شوق میں بے تاب ہو رہا تھا بے ساختہ کہا "اب یقیناً سلطان ہمیں نبرد آزمائی کے لیے طلب کرے گا" لیکن دشمن سے دوچار ہونے کے بجائے انہیں اپنے سامنے ترک فوج کا ایک دستہ نظر پڑا۔ جو ایک ویران باغ میں پڑاؤ ڈالے تھا۔ رحیم نے ساتھیوں کو بھی اپنی جگہ سے شب گزاری کا حکم ملا۔ اگرچہ ترکوں کو کہیں سے سوکھی گھاس مل گئی تھیں اور وہ خوب آگ جلا رہے تھے۔ لیکن خراسانیوں کے پاس نہ تو آگ جلانے کے لیے ایدھن تھا اور نہ کھانے پینے کی کوئی چیز۔ صرف تھکن کی وجہ سے ان پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ سحر کی سفیدی نمودار ہو گئی تھی اور دور میدان میں طبل جنگ کے شور نے انہیں اس غنودگی سے بیدار کر دیا۔

یہ طبل عیسائی فوج کے کیمپ میں بج رہے تھے جہاں روم کا شہنشاہ اپنی فوج کے ہزیمت خوردہ قلب کو لے کر پسپا ہو گیا تھا..... شہنشاہ کی فوج جو عقب میں متعین تھی یا تو کسی غلط فہمی کی بنا پر یا اسے دھوکا دے کر رات کی تاریکی میں فرار ہوئی تھی اور پہاڑوں میں شہنشاہ کے میمنے اور میسرے کی جو پیادہ فوج تھی اس نے الپ ارسلان کے سواروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لیکن رحیم اور عمر کو اس کا کچھ علم نہ تھا۔

ان کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل تھیں اور جسم زمین کی نمی اور سردی سے اکڑ گئے تھے۔

ملازموں نے ان کے گھوڑوں پر زین کس دی تھی اور اس سے پہلے کہ انہیں صورت حال کا پورا احساس ہو وہ دونوں کثیر التعداد سواروں کے غول میں چیختے اور نعرے لگاتے' اپنے گھوڑوں پر سرپٹ دوڑنے لگے۔

عمر کے ہاتھ باگ پر تھے اور سر میں ایسا درد تھا کہ جیسے بخار ہو گیا ہو۔ اسے اپنے اردگرد کی افراتفری میں محض جزوی مناظر نظر آ رہے تھے۔ کسی سوار کے سر پر پگڑی کا اڑتا ہوا طرہ..... ننگے پاؤں اور منہ پھیلائے دوڑتا ہوا کوئی شخص..... کوئی الٹی ہوئی گاڑی جس کے نیچے کوئی رینگ رہا تھا۔

یکا یک اسے ایک طرف کوئی شخص گھٹنوں کے بل چلتا نظر آیا۔ ایک سوار اسکے پاس پہنچا اور اس زخمی آدمی کے نیزہ مارا۔ نیزے کی انی زرہ سے ٹکرائی اور پھر اس زخمی شخص کے پہلو میں گھستی چلی گئی۔ اس کے منہ سے خون ابلنے لگا۔ اور اس کا سر نیوڑھا گیا' حالانکہ وہ اب بھی رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمر نے دل میں سوچا کہ یہ کوئی عیسائی سپاہی ہو گا۔

اس نے اپنا منہ پھیر کر رحیم کی طرف دیکھا۔ ڈھیلی پگڑی والا سوار ایک تیر کو جو اسکے کولہے میں گھسا ہوا تھا پکڑے تھا' عمر نے اس کے کراہنے کی آواز سنی۔ پھر اس نے اپنے دونوں طرف خیمے دیکھے۔ اس کے بعد عمر نے لوہے کی جھنکار اور چیخنے کی آواز سنی۔ اس نے باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ وہ جنگ میں

شریک بھی ہوا لیکن اسے ایک بار بھی تلوار کھینچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

رحیم ایک بڑے خیمے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے گرد خراسانی سوار اپنے گھوڑوں سے اتر اتر کر مال غنیمت تلاش کر رہے تھے۔ انہیں مال غنیمت لوٹنے کا حکم کسی نے نہ دیا تھا' لیکن وہ بچوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ رحیم کے تین سپاہی دمشق کا کپڑا اور چاندی کے برتن لیے خیمے سے نکلے۔ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو بھی کلائی پکڑے لا رہے تھے۔

یہ لڑکی سراسیمگی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور اس کے حسین سنہرے بالوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر نقاب نہ تھا اور اس کی نازک کمر پر زربفت کی پیٹی کسی ہوئی تھی۔ سپاہی حیرت سے اس کی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی عیسائی عورت نہ دیکھی تھی۔

رحیم نے چیخ کر کہا ''عمر اللہ نے ہمیں فتح دی'' فتح کا لفظ بھی کتنا عجیب تھا! سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے رحیم نے کہا ''یہ لڑکی کسی عیسائی امیر کی کنیز ہوگی۔ میں نے ابھی پیچھے ایک کافر کے بچے کو قتل کیا ہے آؤ خیمے میں چلیں''۔

یکا یک یرماق چیخا ''ہوشیار ہو جاؤ اللہ اکبر! سامنے خیموں کے درمیان سے سواروں کا ایک دستہ ہانپتا اور کیچڑ میں لت پت گھوڑے دوڑائے چلا آ رہا تھا۔ یہ سوار اپنے ہاتھوں میں تلواریں اور تبر لیے ہوئے تھے۔ وہ ایسے بگٹٹ چلے آ رہے تھے جیسے جناب ان کا پیچھا کر رہے ہوں۔ وہ سیاہ خود پہنے تھے اور ان کے چہروں سے غم اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔ یہ سوار عیسائی تھے۔

عمر نے اپنی باگ ڈور سنبھال کر گھوڑا موڑا ہی تھا کہ سوار اس پر ٹوٹ پڑے۔

گھوڑا کود کر الف ہو گیا اور عمر زمین پر آ رہا۔

اس کے کندھے میں گرد بھر گئی۔ جب اس نے آنکھیں صاف کیں تو اسے محسوس ہوا کہ وہ زمین پر پڑا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ایک ملازم زمین پر اپنے جسم کو اس طرح مروڑ رہا ہے جیسے وہ کسی پوشیدہ دشمن سے لڑ رہا ہے۔ اس کے قریب ہی یرماق جھکا ہوا رحیم کو دیکھ رہا تھا جو زمین سے اٹھنے کی کوشش میں تھا۔

عمر دوڑ کر وہاں پہنچا اور اس نے رحیم کے بازو پکڑے۔ رحیم عجیب انداز سے مسکرا رہا تھا۔

عمر چلایا "میرے بھائی کیا تیرے چوٹ لگ گئی کیسے؟ اس کے رضاعی بھائی نے اس انداز سے اس کی جانب دیکھا جیسے اس کے جواب دینے کے لیے اس کے پاس کوئی لفظ نہ ہو۔ عمر نے یرماق کو ایک صاف کپڑا لانے کو کہا رحیم کے زخمی جسم کو نرمی سے زمین پر لٹا دیا اور زرہ ہٹا کر وہ زخم دیکھنے لگا۔ جس سے خون جاری تھا۔ اس کے ہاتھ نے خون کی گرمی محسوس کی جس سے دھیمی دھیمی بھاپ نکل رہی تھی۔

یرمان نے عمر کے کان میں کہا " آقا! تم کیا کرو گے؟ اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔ اس کے حلق سے جو آواز نکل رہی ہے سنو"۔

عمر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے خون آلود ہاتھ دیکھے اس کے ہاتھوں پر اور زمین پر سورج کی تیز شعاعیں پڑیں اس نے دیکھا کہ رحیم کا چہرہ کپڑے کی طرح سفید تھا۔

اور اب اس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک اس کے حلق سے خرخر کی آواز آتی رہی اور پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

یرماق ایک جانور کی طرح غرایا۔ اس نے میان سے خنجر نکال لیا۔ غصے سے اسس کے ہونٹ سکڑ گئے اور اچانک اس نے قید لڑکی پر جو رحیم کے لمحات نزع میں ان کے قریب بے حس و حرکت کھڑی تھی حملہ کر دیا۔

یرماق نے عیسائی لڑکی پر حملہ کرتے ہوئے کہا ''جان کے بدلے جان''۔

لڑکی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ خنجر کے وار سے اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ وہ عمر کے قدموں مین گر پڑی اور خوف کے مارے اس نے اپنی ٹانگیں ہاتھوں میں دبالی تھیں اور اس کا جسم لرز رہا تھا۔ وہ خاموش کھڑی اور بڑی درد بھری نظروں سے عمر کو دیکھ رہی تھی۔

''بیوقوف'' عمر نے ملازم سے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

یرماق زمین پر مردے کی مانند گر گیا اور سسک سسک کر کہنے لگا ''یا اللہ! یا اللہ!''

عمر نے رومی لڑکی کو خیمے میں جانے کے لیے کہا۔ لیکن وہ اس کی زبان نہ سمجھی۔ پھر اس نے خیمے کی طرف اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ خیمے کے اندر چلی گئی۔ عمر دوسرے ملازم کی مدد سے رحیم کی لاش خیمے کے اندر لے گیا اور اسے قالین پر رکھ دیا۔ اس نے ایک کپڑے سے اپنے ہاتھ پونچھے اور نوکروں کو پانی لانے کا حکم دیا۔

اس پانی سے عمر اپنے رضائی بھائی کا منہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد

لڑکی نے قریب آ کر عمر کے ہاتھ سے کپڑا لے لیا اور خاموشی سے رحیم کے سر اور گلے سے مٹی صاف کرنے لگی۔ جیسے اسے یہ امید ہو کہ اس کی حرکت سے عمر خوش ہو گا۔ پھر اس نے لاش کے کپڑے ٹھیک کیے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس کو بہت سے کام کرنے ہیں ایسا نہ ہو کہ رحیم کی تجہیز و تکفین میں کوئی کسر رہ جائے۔

اس روز رات کو ایک سفید ریش مولوی نے عمر سے مغموم انداز اور سنجیدہ آواز میں کہا "میرے بیٹے زم زم کا متبرک پانی بھی زمین میں جذب ہو جاتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بے شک جان اس کی دی ہوئی ہے اور مومنوں کی پاک روحیں قیامت کے دن اسی کی طرف واپس ہو جائیں گی"۔

عمر کی چشم تصور میں رحیم کی صورت پھر رہی تھی۔ اس جسد خاکی کا چہرہ جو کیچڑ سے لت پت زمین پر کفنایا ہوا قبلہ رو پڑا تھا۔ اس کے بعد رحیم کو لحد کی آغوش میں اتر کر اس پر مٹی ڈال دی گئی

اس رات مولوی کو اور بھی مردے دفنانے تھے چنانچہ وہ چلا گیا اور عمر ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ یرماق وفادار کتے کی طرح عمر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ وہ آگے پیچھے چل رہا تھا۔ اب جبکہ اس کا آقا دفن ہو چکا تھا یرماق مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن عمر کے لیے جو اپنے اس ساتھ کے کھیلے دودھ شریک بھائی کو کھو چکا تھا اس پتھر کو چھوڑ کر جانا اندوہناک تھا۔ اس پتھر کے قریب رحیم کو ہمیشہ کے لیے لیٹے رہنا ہے۔ اس جگہ بارشیں ہوں گی گھاس اگے گی کھیتیاں بوئی

جائیں گی۔ ……اور رحیم بے شمار برسوں تک جن کے گزرنے کے بعد قیامت کے دن روحیں پھر اپنے جسموں میں داخل ہوں گی غیر مرئی پردے کی آڑ میں منتظر پڑا رہے گا۔

عمر ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے گھنٹوں اس پتھر پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ سحر کی سفیدی نمودار ہوگئی پچھلے دو دن اور رات کی تھکن کے بعد عمر کو کچھ ذہنی سکون محسوس ہوا۔ اس نے آہستہ سے زیر لب کہا۔ ''رحیم! جسم ایک عارضی مکان ہے جس میں انسان کی روح کچھ دیر کے لیے رہتی ہے۔ جب یہ عارضی مکان بن جاتا ہے تو روح اپنے طویل سفر پر روانہ ہو جاتی ہے رحیم اس سفر میں تجھ سے میری ملاقات ہوگی''۔

''امان!'' یرماق بولا۔

عمر خیمے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ چراغ جل رہا ہے۔ وہ چراغ کو تکنے لگا یہاں تک کہ قیدی لڑکی جو ایک کونے میں پڑے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر پر سو رہی تھی اور اس نے بوتل سے جام میں شراب انڈیلی۔

عمر چاہتا تھا کہ ہاتھ مار کر اس جام کو زمین پر گرا دے۔ لیکن اسے وہ رات یاد آ گئی جب نیشاپور کی سڑک والی سرائے میں وہ رحیم باتیں کر رہے تھے۔ اور رحیم نے اسے شراب کا ایک جام پیش کیا تھا۔ عمر نے جام سے شراب پی لی۔ اس کے سرد جسم میں حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکی نے پھر جام بھرا اور عمر پھر پی گیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور کمبل پر لیٹ گیا تھکن کی وجہ سے اس پر جلدی ہی غفلت طاری ہوگئی۔

قیدی لڑکی نے چراغ گل کر دیا اور اس کے قریب بیٹھ کر آسمان پر صبح کی سفیدی

کا انتظار کرنے لگی..... جب روشنی نمودار ہوئی اور ہر چیز صاف نظر آنے لگی تو اس نے آئینہ اٹھا کر اپنے بالوں میں کنگھی کی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر غور کرنے لگی۔

دور وادی کے نشیب میں بالآخر سلطان الپ ارسلان کا خیمہ نصب ہو گیا تھا۔

خیمے کے دروازے پر ترک امیروں کا ہجوم تھا۔ ان میں سے ہر شخص قالین پر بیٹھے ہوئے تین آدمیوں کو ایک نظر دیکھنے کا مشتاق تھا۔ جعفر کو جسے درباری خاص مراعات حاصل تھیں ایک صندوق پر ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے وہ ان تینوں اشخاص کو دیکھ سکتا تھا جن میں ایک خود سلطان الپ ارسلان دوسرا رومیوں کا شہنشاہ رومانوس دیوجانس اور تیسرا شخص وہ چھوٹا سا مسلمان غلام تھا جس نے میدان جنگ میں رومیوں کے شہنشاہ کو بے ہوش پڑا دیکھا تھا اور اسے لا کر الپ ارسلان کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

تماشائیوں نے پہلے یہ دیکھا کہ رومانوس کو جو ابھی تک زرہ پہنے تھا۔ سلطان کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا گیا۔ الپ ارسلان نے ایک بار اس مقید شہنشاہ کی گردن پر اپنا پاؤں رکھا اور پھر رومانوس کو اٹھا کر اپنے دائیں طرف قالین پر بٹھا دیا۔

سامعین وہ بات چیت سننے کے منتظر تھے جو پہلی بار مشرق اور مغرب کے ان دو حکمرانوں کے درمیان ہوگی۔

الپ ارسلان نے اپنے معمولی لہجے میں کہا "اگر میں تیرے سامنے قید کر کے اس طرح لایا جاتا تو تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتا؟"

رومانوس نے اپنا سر اٹھایا اور جب سلان کے جملے کا مطلب مترجم نے اسے بتایا

تو اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر وہ بولا ''میں تیرے ساتھ سختی سے پیش آتا''۔

سلطان کے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے پوچھا ''اور تو مجھ سے کس سلوک کی توقع کرتا ہے؟''

مقید شہنشاہ نے اپنے دشمنوں کے چہروں کو سنجیدہ دیکھا اور کہا ''ممکن ہے تو مجھے یہیں قتل کر دے۔ یا بیڑیاں پہنا کر مجھے اپنی سلطنت میں پھرائے یا مجھ سے تاوان جنگ قبول کر لے''۔

الپ ارسلان کو یہ عیسائی بادشاہ پسند آیا۔ جس میں جرات کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنی فتح پر اور قیصر روم کی گردن پر پاؤں رکھنے کے بعد مسرت سے سرشار تھا ایک لمحے کے بعد وہ بولا ''جان لے کہ تیرے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیے میں نے اس کے متعلق فیصلہ کر لیا ہے''۔

شیر بچہ جو اس باپ کے پیچھے بیٹھا تھا آگے کو جھکا۔ وہ اپنے مٹھیاں باندھے بیٹھا تھا۔ اسے وہ پیشن گوئی یاد تھی کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گی اور دونوں بادشاہ ختم ہو جائیں گے۔

الپ ارسلان نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھ سے تاوان جنگ لوں گا تیری رعایا سے سالانہ خراج وصول کروں گا اور تجھے عزت سے تیرے محل میں پہنچاؤں گا''۔

شیر بچہ نے گہری سانس لی اور وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اگر رومانوس اسی جگہ جلا دے کے

ہاتھوں قتل ہو جاتا تو نیشاپور کے اس نوعمر طالب علم کی پیشن گوئی پوری ہو جاتی۔

عمر کو نیند نہ آئی۔ جسمانی تھکن کے باوجود دیر تک اسکے ذہن کو سکون نہ ملا۔ جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرتا رحیم کا چہرہ اس کی عجب مسکراہٹ اس کے سامنے آ جاتی۔ رحیم کا جسم مرنے کے بعد ایک لکڑی کے صندوق کے مانند ہو گیا تھا جسے خیمہ کے فرش پر کبھی ایک جگہ رکھا گیا تو کبھی دوسری جگہ اور پھر اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔ عمر نے لاکھ کوشش کی لیکن رحیم کا جنازہ لے جانے اور سفید کفن کی تہوں میں اس کی لاش لپیٹنے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے سے نہ ہٹا۔

رحیم کی جگہ ملازموں کو احکام دینا عمر کے لیے آسان کام نہ تھا۔ جہاں تک اسے یاد تھا معمولی بھائیوں کی طرح نہیں بلکہ جڑواں بھائیوں کی طرح وہ دونوں ہر چیز میں حصے دار تھے پھر بھی کھانے' اور ملازموں اور گھوڑوں وغیرہ کا انتظام ہمیشہ رحیم کرتا تھا۔ لیکن اب قدرتی طور سے ملازمن عمر سے احکام پانے کی توقع رکھتے تھے۔

اب وقت آ گیا تھا کہ یہ لوگ نیشاپور واپس روانہ ہوں۔ ان پہاڑوں میں صرف سلجوق ترکوں کو ٹھہرنا تھا عرب سپاہی اور بے قاعدہ فوجیں تو مال غنیمت اور غلام لے کر واپس بھی ہو چکے تھے

جب یرماق اور باقی دوسرے ملازموں نے خیمہ اکھاڑا تو عمر نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص کے پاس بڑے بڑے بورے ہیں جو ان کے سامان میں شامل نہیں تھے۔ جنگ کے آخری ایام میں یہ لوگ لوٹ مار اور ان چیزوں کو فروخت کرنے میں مصروف رہے تھے۔ جن کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ اور اب وہ یہ دولت لے کر اپنے

گھروں کو جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ لیکن ابراہیمن کے بیٹے نے میدان جنگ سے ایک تلوار تک نہ لی تھی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہ لینا چاہتا تھا جو اسے جنگ کی یاد دلائے۔

یرماق نے رحیم کے ابلق گھوڑے پر زین کس دی تھی اور اپنے مرحوم آقا کی زرہ اور اسلحہ کی جنہیں وہ اپنے زین سے لگایا کرتا تھا ایک گٹھڑی باندھ لی تھی۔ عمر نے سیاہ گھوڑے کو دیکھا اور دل میں سوچا کہ تمام راستے اس گھوڑے کو خالی زین کے ساتھ وہ کس طرح لے جائے گا، دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ اس گھوڑے کو رحیم کے باپ کے پاس واپس پہنچایا جائے۔

یرماق نے کہا "آقا یہ ٹھیک رہے گا ہم اس رومی لڑکی گھوڑے پر سوار کر دیں۔ ہمارے پاس اس کے لیے کوئی سواری بھی نہیں ہے۔"

قیدی لڑکی رحیم کی ملکیت تھی۔ اس لیے اسے بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ اسے نیشاپور کے بازار میں اچھی قیمت پر فروخت کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ نوجوان تھی اور اس کے بال ریشم کی طرح نرم و حسین تھے۔ عمر ان یونانی الفاظ کی مدد سے جو اس نے مکتب میں افلاطون کے مکالمات میں پڑھنے کے دوران سیکھے تھے اس لڑکی کے متعلق کچھ باتیں معلوم کر لی تھیں۔

اس کا نام زونی تھا۔ دنیا میں اس کا کوئی اور نہ تھا' کیونکہ وہ قسطنطنیہ میں ہمیشہ کنیز کی زندگی گزارتی رہی تھی اس جنگ میں وہ ایک عیسائی افسر کے ساتھ آئی تھی جس کا اپنے شہنشاہ کی طرح یہ خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کو کسی دشواری کے بغیر شکست دے کر

مشرق کی جانب بھگا دیا جائے گا۔

عمر نے کہا ”ابلق گھوڑے پر میں سوار ہوں گا اس رومی لڑکی زوئی کو میرا گھوڑا دے دو۔“

حالانکہ وہ لڑکی اب نقاب پہنے تھی اور عمر کے پیچھے بار بردار جانوروں کی طرح چل رہی تھی۔ لیکن سڑک پر جو شخص بھی ملتا تھا اس لڑکی ک لابس اور اس کے سنہرے بالوں سے یہ سمجھ جاتا تھا کہ وہ عیسائی کنیز ہے اور اس خراسانی سپاہی کی ملکیت ہے۔ جو خاموش اور تنہا اپنے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔

پہلی منزل پر عمر کو دشواری پیش آئی۔ سرائے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اسے مجبوراً اپنا خیمہ اس کنوئیں کے قریب نصب کرانا پڑا جہاں ایک بڑے لاؤ لشکر والا امیر پہلے سے خیمہ زن تھا۔ ملازمین عمر کی ہدایت کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ عمر ہی کو انہیں یہ ہدایات دینا پڑی کہ گھوڑے کہاں باندھے جائیں اور یہ بھی کہ جو اور روٹی امیر کے ہمراہیوں سے خریدی جائے لیکن عمر نے اس مصروفیت کو غنیمت جانا کیونکہ اس طرح اس کا دھیان بٹ گیا لیکن جب سب کام ہو چکا تو پھر رحیم کی یاد اسے ستانے لگی۔

وہ اپنے بستر پر بیٹھا جاگتا رہا۔ یہاں تک کہ انگیٹھی کی آگ بجھ کر راکھ ہو گئی۔ اسے وہ شراب کا جام یاد آیا تھا جس پی کر جدائی کی صبح چند گھنٹوں ک لیے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ لیکن تمام شراب ختم ہو چکی تھی۔ صرف جام باقی تھا۔ عمر نے اطمینان کرنے کے لیے سامان کا تھیلا ٹٹولا۔ چاندی کا جام اس کے ہاتھ مس تھا وہ سوچ رہا

تھا کہ رحیم کی زندگی کا جام اتنی جلدی خالی کر دیا اور اب وہ موت کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔

عمر کے قریب لیٹی ہوئی عیسائی لڑکی اپنے بستر میں کلبلائی اور اس نے ایک گہری سانس لی۔ عمر نے جھک کر اسے کے چہرے کے بال ہٹا دیے زونی کے بال تر تھے اور جانے وہ کس وجہ سے رو رہی تھی۔

عمر نے نرمی سے پوچھا ''ارے کیا بات ہے؟'' زونی نے لب ہلائے وہ مسکرائی۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی ہے۔ عمر کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ اپنے وطن سے دور اس طویل سفر کے دوران میں یہ لڑکی کس چیز کے متعلق سوچتی ہوگی۔ جذبات تو سلطان بھی رکھتا ہے اور غلام بھی۔ لیکن غلام کو شکایت کرنے کی اجازت کہاں!

زونی کے ریشمی بال اس کے گلے سے لپٹ رہے تھے اور جب عمر نے ان پر ہاتھ پھیرا تو بال پھیل گئے۔ زونی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک طرف کو ذرا سا کھسک گئی جیسے عمر کے لیٹنے کے لیے جگہ کر رہی ہو۔ عمر کے چھونے سے اس لڑکی کی کمزور نبضیں بہت تیز ہوگئی تھیں۔

عمر لڑکی کے قریب لیٹ گیا دیر تک وہ لیٹا ہوا خیمے کی چھت پر انگیٹھی کی اس روشنی کو تکتا رہا جو بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن سے جنگ کے میدان رات کی اس ہوا اور رحیم کی عجب مسکراہٹ کا خیال محو نہیں ہو سکتا۔

اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی پھر کلبلائی جب اس نے اٹھ کر اپنے لمبے بالوں کو کندھے کے نیچے سے نکالا تو عمر کے ہونٹ اس کے گلے سے مس ہو گئے۔ لڑکی کے جسم کی حرارت اور اس کے بالوں کی خوشبو نے عمر کو کچھ سکون دیا اور پھر عمر نے محسوس کیا کہ اس کا جسم لڑکی کے بازوؤں کی گرفت میں ہے۔ زوئی کے جسم کی حرارت نے عمر کی تھکن دور کر دی اور اس پر ایسا نشہ طاری کر دیا جو ہر لڑکی کے جسم کی ہر جنبش سے تیز ہو رہا تھا۔

اس رات زوئی کے بازوؤں میں عمر موت کو بھی بھول گیا تھا اور وہ جنگ کے میدان کو بھی۔ دنیا کی ہر شے سے بے خبر ہو کر وہ سکون و اطمینان کی نیند سو گیا۔

☆☆☆

باب دوم

نمک زار کو جانے والی سڑک پر استاد آئینہ دانش کا مکان عیسائیوں پر سلطان الپ ارسلان کے فتح پانے کے ایک سال بعد

استاد علی کا سن تقریباً ۳۷ سال تھا۔ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ استاد کو ریاضی سے بھی عشق تھا۔ اس کے مکان میں ہر کام اسی پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ ہوتا تھا جس پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ مچھلیوں کے حوض کے قریب صحن میں گھڑیال سے پانی کے قطرے ٹپکتے تھے۔

شاگرد ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے "اب استاد وضو کر رہا ہے" "اب ظہر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے یا وہ یہ کہتے کہ اب سہ پہر ہو گئی ہے اب استاد اپنی کتاب کا مسودہ لکھے گا۔

پانی کا گھڑیال پنجگانہ نماز دو وقت کا کھانا' بارہ گھنٹے کا کام' استاد کے مکان میں اسی باقاعدگی سے عمل پذیر ہوتے تھے۔ جس باقاعدگی کے ساتھ سیارے آسمان پر گردش کرتے ہیں۔ ہر کھانے پر ہمیشہ مقررہ غذا آتی۔ استاد علی سے جس کا لقب آئینہ دانش تھا۔ کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ تھی کہ ممکن ہے کہ اس کے نوجوان شاگردوں کی طبیعت کوئی اور چیز مثلاً کھجور' اخروٹ یا انار کھانے کو چاہتی ہو چنانچہ یہ شاگرد بھی کبھی کبھار چوری چھپے قریب کے کسانوں سے انار خرید لاتے اور مکان

سے دور جا کر کھاتے تھے۔

گاہے گاہے استاد علی اپنی شاندار سنہری عبا پہنے اپنے ٹٹو پر سوار ہو کر نیشاپور جایا کرتا' اپنے ساتھ وہ ایک چھتری اور حبشی غلام کو لے جاتا جو راستہ میں ٹٹو کو ہنکاتا تھا۔ استاد کا مکان نیشاپور کے میدان سے جنوب میں ایک جگہ واقع تھا جہاں مزروعہ علاقہ ختم ہو جاتا تھا۔ یہاں سے نمک کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ اس مکان میں استاد علی کو اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کے لیے پوری خلوت اور سکون حاصل تھا۔

استاد علی الجبر و المقابلہ پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اسے سلطان کے وزیر نے کئی سال ہوئے یہ کتاب لکھنے کا حکم دیا تھا۔ استاد کے شاگرد سہولت کے لیے اسے الجبرا کہتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ کام تھا کہ استاد انہیں اپنی تشریحات املا کراتا اور وہ اس کی خواہش کے مطابق تجربے کے طور پر سوال نکالتے اور اپنی معلومات کے لیے اسے جن دوسرے جوابوں کی ضرورت ہوتی انہیں تلاش کرتے۔ اس کام کے صلے میں استاد علی سہ پہر کو تین گھنٹے ان شاگردوں کو لیکچر دیتا اور انہیں دو وقت کھانا کھلاتا تھا۔

استاد کو اپنے آٹھوں شاگردوں کے نام اور ان کی دماغی کمزوریوں کا علم تھا۔ چونکہ وہ عقل مند آدمی تھا اس لیے یہ کوشش کرتا تھا کہ اپنی معلومت کا زیادہ سے زیادہ حصہ ان کے ذہن نشین کر دے تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس شرزمین میں ریاضی کا علم فنا نہ ہو۔

اپنے آٹھ شاگردوں میں اسے عمر خیام کے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ عمر خیام کو اس کے پاس آئے صرف دس مہینے ہوئے تھے۔ استاد کا خیال تھا کہ عمر میں پیچیدہ مسائل

حل کرنے کا قدرتی ملکہ ہے اور اس کا تصور خطرناک حد تک زرخیز ہے۔

استاد علی نے بارہا اپنے شاگردوں کو اس امر کا یقین دلایا تھا کہ ریاضی وہ دروازہ ہے جس سے گزر کر آپ نامعلوم سے معلوم تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں''۔

کافر یونانیوں کی خالی خولی قیاس آرائیوں سے استاد کو اتنی ہی نفرت تھی جتنی ان قدیم مصریوں کے حساب سے محبت تھی جنہوں نے سب سے پہلے اعداد سے کام لیا ہے۔ اس کی رائے میں مصریوں کی حساب دانی نے عالیشان عمارتوں کی تعمیر میں مدد دی تھی۔

ایک شاگرد نے سوال کیا خواجہ امام سیاروں کی گردش کا سراغ لگانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق مبارک کے مطابق ہم چاند کی مدد سے مہینوں کا حساب لگاتے ہیں۔ سورج ہمیں روشنی پہنچاتا ہے۔ پھر ستاروں کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟

استاد علی نے متفکرانہ انداز میں اپنا سر ہلایا۔ وہ حاجیوں کا سا سبز عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ اس نے اپنی سفید مونچھ کو سنجیدگی سے تاؤ دیا۔ اسے نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر اعتقاد تھا۔ لیکن چونکہ سلطان اور دوسرے تمام امراء ان پر اعتقاد رکھتے تھے اس لیے وہ کسی مخالف رائے کا اظہار بھی نہ کرتا تھا۔ شاگرد نے اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ''لیکن استاد کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ وہ سیارہ جسے یونانی عطارد کہتے ہیں پارے پر اثر ڈالتا ہے سورج سے سونا اور اسی طرح چاند سے

چاندی متاثر ہوتی ہے؟ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے"۔

یہ ہر وقت ممکن تھا کہ سلطان کا وزیر جو استاد علی کا سرپرست تھا یہ معلوم کرنے کے لیے آیا کہ استاد کا فروں یا ساحروں سے تو کوئی تعلق نہیں ہے اس کے مکان میں اپنا کوئی جاسوس چھوڑ دے۔ اول تو عمر نیشاپور سے بھٹکتا ہوا تھا اور پیدل اس کے پاس آیا تھا اور اس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ریاضی کا ے فاضل استاد سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ پھر تعجب انگیز طور پر وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس کا کوئی سرپرست نہیں ہے دوسرے یہ کہ فاضل یہ نوجوان جس کا جسم سپاہیوں اور چوٹ کھائے ہوئے شیر کی طرح مستعد تھا استاد یا معلم بننے کے لیے نہیں پڑھنا چاہتا ہوں گا۔ پھر کس وجہ سے اس نے نمک زار کے کنارے خود کو اس ویرانی میں مقید کرنا پسند کیا؟

استاد علی نے عمر خیام کے سوال کا جواب اپنے ذہن میں سوچ کر خشک لہجے میں کہا "علامہ ابوریحان البیرونی نے اپنی فلکیات کی پہلی کتاب کے پہلے باب میں لکھا ہے کہ ستاروں کا علم ایک سائنس ہے اور واقعات سیاسی کوائف اور شہروں بادشاہزادوں اور عوام الناس کی قسمت میں تبدیلیوں کے متعلق پیشن گوئیاں کرنے میں اس کا سائنس سے خصوصی استفادہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تم پیشن گوئیاں کیے بغیر بھی ستاروں کے علم میں مہارت حاصل کر سکتے ہو لیکن اس مہارت کے بغیر پیشن گوئی نہیں کر سکتے"۔

عمر خیام نے اپنا سر ہلایا گویا وہ استاد کے دانشمندانہ قول کو سمجھ گیا۔ اب تک وہ استاد کی کتابوں میں کسی ایسے نسخے کی تلاش کرتا رہا تھا جس کی مدد سے وہ کیمیا بنا سکے'

لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی تھی۔

عمر نے دبے الفاظ میں کہا "المجسطی میں لکھا ہے کہ سونے پر سورج کا اثر ہونا واضح امر ہے کیونکہ سورج کی آگ ہے اور سونے کی ماہیت دریافت کرنے کا واحد ذریعہ ہے بھی آگہی ہے۔ کاش ہم آگ کی روح کو مرکوز کر سکتے......"۔

"کسی بھٹی میں" دوسرے شاگرد نے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

ایک قدرے معمر شاگرد نے سنجیدہ انداز میں کہا "دہکتی ہوئی بھٹی میں"۔

استاد علی نے جواب دیا "یہ چیز کائناتی علم سے متعلق ہے جو فلکی اور ارضی اشیاء کی ماہیت سے بحث کرتا ہے۔ یہ علم ریاضی کے مانند ایک قطعی سائنس نہیں ہو سکتا۔ کون ایمان والا اس میں شبہ کرے گا۔ کہ جب خدائے بزرگ و برتر نے آگ کو اور اس کی ہوا کو پیدا کیا جو پانی کو محیط ہے ج کے حلقے میں ہماری یہ بے حس و حرکت دنیا گھری ہوئی ہے تو اس نے وہ سونا بھی پیدا کیا جو زمین کے سینے میں پایا جاتا ہے؟ کون سچا ایمان رکھنے والا عقل سے اس قدر محروم ہو گا کہ اس چیز کو جسے اللہ نے پیدا کیا ہے خود پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

"درست ہے۔ درست ہے!" شاگردوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

استاد علی نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہی۔ وزیر کو بلکہ خود سلطان کو بھی یہ علم تھا کہ بہت سے جاہلوں نے اس اعلان کے باوجود کہ اس کا راز معلوم ہے۔ کوئی شخص گھٹیا چیزوں سے سونا نہیں بنا سکتا۔ پھر بھی استاد انکھیوں سے عمر کو دیکھتا رہا تھا جو بے توجہی سے استاد کی باتیں سن رہا تھا۔ اور اپنی گود میں رکھے ہوئے ایک کاغذ پر کوئی شکل بنا رہا

تھا۔ جب دوسرے شاگردوں اور استاد کے درمیان بحث ہوتی تھی تو بسا اوقات عمر اپنے کاغذوں پر لکھنے میں مصروف رہتا۔

شروع میں استاد علی سوچتا تھا کہ عمر اپنی یادداشت کے لیے نوٹ کرتا ہے۔ لیکن اب اسے یہ شبہ ہو چلا تھا کہ کہیں عمر یہ نوٹ وزیر کو دکھانے کے لیے تو نہیں لکھتا، عمر اپنے کاغذ صندل کے ایک صندوقچے میں بند کر کے اپنے بستر کے قریب رکھا کرتا تھا۔

بوڑھا ریاضی دان یکا یک اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے شاگرد کے پاس جا کر اس کے کاغذوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ کاغذ پر دو مکعب بنے ہوئے تھے۔ جنہیں بہت سے خطوط کاٹ رہے تھے اور بہت سے ہندسے تحریر تھے۔

استاد نے متعجب ہو کر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

عمر نے فوراً جواب دیا "مکعب کی بنیادوں کا مسئلہ" استاد علی کو یاد آیا کہ اس ہفتے خیام کے اس لڑکے کو اس نے مکعب کے اصول کے متعلق ایک شکل تعدیل حل کرنے کے لیے دی تھی۔

تو نے اسے کہاں تک حل کیا؟ استاد نے پوچھا۔

استاد علی کو شک تھا کہ عمر اسے حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ یونانیوں نے اس کا حل معلوم کیا تھا، لیکن وہ خود اسے حل نہ کر سکا تھا۔ استاد نے دوسرے شاگردوں کو چھٹی دے دی اور عمر کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گیا۔

جب استاد علی آرام سے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا تو اس نے عمر کے کاغذ کو

آنکھوں کے قریب لے جا کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ استاد بولا ''ابھی میری سمجھ میں تو اس کا مطلب نہیں آتا۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ تو نے مکعبوں کو انتہائی حدود تک دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور تو یونانیوں کے حل کو پہنچ گیا ہے۔

''وہ اس حل پر کیسے پہنچے تھے؟'' عمر نے اشتیاق سے پوچھا۔

استاد نے آہستہ سے جواب دیا ''ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا''۔

اسے یاد تھا کہ اس نے عمر کو اس تعدیل کا جواب نہیں بتایا تھا اور یہ کہ اُکے کاغذوں کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر کلام پاک کے سات رکھے ہوئے تعدیل کا یہ مسئلہ اور اس کا جواب لکھا ہوا ہے۔ وہ ان کاغذوں کو کمرے سے باہر نہیں لے گیا تھا ۔اور اس کی غیر حاضری میں کسی شاگرد کو کمرے میں گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے ظاہر تھا کہ یا تو عمر نے یہ مسئلہ اپنی عجیب وغریب شکلوں اور خطوط کی مدد سے حل کیا ہے یا پھر چوری سے اس کے کاغذوں کو دیکھ کر اس کا حل کا پتا چلا لیا ہے۔

استاد نے کہا ''مجھے تو صرف اتنا نظر آتا ہے کہ تو نے ان ٹھوس چیزوں کے اضلاع کے ذریعہ مکعب کے اصول کا پتا چلایا ہے۔ تو بتا کہ کس طریقے سے اس حل کو پہنچا؟

''جواب تو موجود ہے'' عمر نے کاغذ پر جھکتے ہوئے کہا ''اس ٹکڑے کو گھٹا دو پھر اسے اور اسے بھی اسے جوڑ دو......''

''میں اندھا نہیں ہوں۔ لیکن رب کعبہ کی قسم یہ کافر یونانیوں کی اقلیدس کی تعدیل میں مساحت ہے یہ الجبرا بالکل نہیں''۔

''نہیں...... لیکن حل یہی ہے۔ اصولوں کے مسئلے کو میں الجبرے کی تعدیل میں حل نہیں کر سکتا تھا''۔

استاد علی نے مسکرا کر کہا ''کیا یہ الجبرے کی تعدیل نہیں تھی؟''

یقیناً۔ اور یہاں سے اسے الجبرے کے ہندسوں میں لکھا جا سکتا ہے۔

''دیکھیے اس طرح سے'' عمر نے استاد کے قریب سر جھکا کر مکعبوں کو غور سے دیکھا اور ریاضی کی عام شکلیں اور خطوط کھینچتا چلا گیا۔ استاد علی نے شکلوں ہی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے اور اب وہ اسے اپنی کتاب میں شامل کر سکے گا۔

استاد کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خوارزمی جیسے استاد نے بھی اپنی کتاب میں یہ مسئلہ حل کرنے کی جرات نہیں کی تھی وہ سوچ کر پھولا نہ سماتا تھا کہ بغداد کے مدرسے کا استاد اس کی اس کامیابی پر کتنے دانت پیسے گا!

''کیا تو نے اس طریقے سے دوسرے مسئلے بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے''؟ استاد نے جلدی سے پوچھا۔

عمر نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا ''ہاں اکثر''۔

''اور انہیں حل بھی کیا ہے؟''

''ہمیشہ تو نہیں...... لیکن عام طور پر''۔

''کیا تو مجھے ان کے عمل دکھائے گا۔ استاد نے غیر متوقع اور بالکل عاجزانہ انداز سے کہا۔

عمر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا ''استاد میں نے آپ کا نمک کھایا ہے آپ

کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا ہے اور آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے جو کام آپ نے دیا وہ کیا' لیکن ان دوسرے مسئلوں کے حل میرے اپنے ہیں اور میں انہیں اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہوں''۔

استاد علی کی داڑھی کے بال سمٹ گئے اور ابرو سکڑ گئے وہ بولا ''ابراہیم کے بیٹے! تو انہیں کس غرض سے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے''؟

''ابھی مجھے اس کا علم نہیں'' عمر نے جواب دیا وہ کھڑکی کے باہر خزاں زدہ باغ کو دیکھ رہا تھا' اسے یہ جواب دینے میں کوئی شرمندگی محسوس نہ ہوئی اور نہ تکلف۔

استاد علی کو اس جواب کی بالکل توقع نہ تھی۔ جوں جوں وہ سوچتا تھا اس کے دل میں عمر کے متعلق جس نے بہت زیادہ بے پروائی سے جواب دیا تھا شبہات پیدا ہو رہے تھے۔

بوڑھے ریاضی داں نے کہا ''کیا ان مسئلوں کے حل تیرے اس صندوقچے میں رکھے ہیں جو مقفل ہیں؟''

''جی ہاں!''

''لیکن میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا اور میرے کاغذوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے دیکھا نہ جا سکے۔ بلکہ اس مسئلے کا جو یونانیوں نے حل کیا تھا وہ بھی تیرے پاس فرش پر پڑا ہے''۔

عمر نے نہ تو اس میز کی طرف دیکھا جس پر قرآن شریف اور اس کی تعدیل کا حل واقعی رکھا تھا اور نہ ہی اپنے چہرے پر کسی تعجب کا اظہار کیا۔ اگر وہ سیاست داں یا

جاسوس ہوتا تو استاد علی کے کمرے کی تلاشی لے سکتا تھا۔

اپنے نوجوان شاگرد کو رخصت کرنے کے بعد استاد علی گھنٹوں مکعب کے مسئلے کو حل کرنے میں لگا رہا۔ شاگردوں کو تعجب ہو رہا تھا کہ اس انہماک میں وہ سہ پہر کا لیکچر دینا بھی بھول گیا۔ عمر کی طرح وہ دوسرا مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں تھا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اس کا تربیت یافتہ ذہن اقلیدس سے الجبرے کا کام نہ لے سکا...... اس کا دماغ ٹھوس شکلوں پر غور کرنے سے قاصر تھا۔

تھک کر وہ سوچنے لگا؟ بو علی سینا بھی اسے نہ کر سکا اور پھر بھی......

یہ ایک مبہم سا خیال تھا۔ الجبرا جس کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ان مسائل وک حل کرنے میں مددگار ثابت ہوا تھا جنہیں صرف حساب کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اگر یونانیوں کی یہ بے ہودہ اقلیدس بھی اسی طرح وہ مسئلے حل کر دے جو الجبرے کے دائرے سے باہر ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اگر ہندسوں پر انتہائی حد تک بحث کرنے کے لیے اقلیدس کے سہ اطرافی علم سے ماورا کوئی ایسا فن پیدا ہو جائے جس کا ابھی قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا تو کیا ہوا؟ استاد علی نے بیزار ہو کر اپنا قلم اور کاغذ پھینک دیا۔

اس نے ایک سہ پہر ضائع کر دی تھی ۔ یہ تمام قیاس آرائیاں لغو تھیں ان کا ریاضی کے قطعی علم سے کوئی تعلق نہیں۔ استاد نے اپنے دل میں یہ نتیجہ نکالا کہ عمر اس کے کمرے میں گھس گیا ہوگا اور اس نے یہ حل وہاں سے حاصل کر کے اس کی مدد سے یہ جھوٹے مکعب بنائے ہیں۔ غالباً اس کے علاوہ عمر کے صندوقچے میں اور کوئی حل نہ ہو

گا۔ شاید وہ جاسوس ہے اور اپنی رپورٹیں صندوقچے میں چھپا کر رکھتا ہے تاکہ انہیں اپنے ساتھ نیشاپور لے جائے یا کسی اور ذریعے سے وہاں سے بھیج دے۔

استاد علی نے اپنے دل مین یہ نتیجہ نکالا کہ عمر کا حل علیحدہ رکھ دیا۔ کھڑکی سے گھڑیال کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک آہ بھری کیونکہ گھڑیال میں یہ دیکھ کر اسے ملال ہوا کہ مغرب کی نماز میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ وہ جلدی سے حوض پر گیا اور وضو کرنے لگا۔

ایک ہفتے بعد بوڑھے ریاضی دان کو ایک بار پھر عمر خیام کی موجودگی سے پریشان ہونا پڑا۔

اس روز سہ پہر کے وقت استاد علی کے مکان پر ایک سوار پہنچا۔ اس سوار کے ہمراہ تقریبا ایک درجن پیادے تھے۔ فوراً فراش نے دروازے سے مکان کی اندرونی دروازے تک ایک قالین بچھا دیا۔ اور ایک غلام جلدی سے اندر جا کر یہ بتایا کہ توتوش استاد علی سے ملاقات کرنے آیا ہے۔

ساتھ ہی توتوش مکان میں داخل ہوا۔ توتوش کا جسم گول اور موٹا تھا وہ ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا اس کے سر پر ایک نیلا عمامہ اور اس کی آواز میں عجیب اتار چڑھاؤ تھا۔ وہ اپنے غلاموں کو ضروری ہدایات دے کر تو استاد علی کے غلاموں سے بار بار اس کے آقا کی خیریت پوچھنے لگا۔ اور جب استاد علی اپنی بہترین سیاہ عبا پہنے باہر آیا تو توتوش اسے دیکھتے ہی مسرت سے چیخ اٹھا۔ اور علی کو اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''خالق دو جہان کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور احسان ہے کہ نامور استاد آئینہ دانش کی صحت برقرار ہے خدا کرے یہ آئینہ سینکڑوں سال تک چمکتا اور ہم جاہلوں کو اس عہد اور اس صدی کے دانشمندانہ خیالات دکھاتا رہے''۔

اس پر خلوص استقبال اور دعا کے جواب میں علی نے مناسب حال عاجزی دکھائی۔ لیکن توتوش نے اس کی ہر عاجزی کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں استاد! تمام نیشا پور جانتا ہے کہ استاد کا درجہ خوارزمی اور بغداد کے اس احمق استاد سے بلند ہے میں کہتا ہوں کہ کیا بوعلی سینا کو استاد علی سے زیادہ علم حاصل تھا؟ نہیں ہرگز نہیں''۔

وہ مہمان خانے میں قالین پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شربت اور پھل رکھے تھے استاد علی توتوش کی چرب زبانی کے آگے گونگا معلوم ہوتا تھا۔ اول تو وہ توتوش کو بولنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ دوسرے توتوش کے متعلق اسے زیادہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس وزیر کا ایجنٹ ہے جو استاد علی کا سرپرست تھا۔ نیشا پور میں یہ مشہور تھا کہ توتوش فیروزہ، نازک چینی کے برتن اور قیمتی قلمی نسخے جمع کرتا ہے لیکن توتوش نہ کوئی خطاب قبول کرتا تھا اور نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟

استاد علی اور توتوش ایک گھنٹے تک استاد کی زیر تصنیف کتاب کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد توتوش نے عمر خیام نامی طالب علم سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ استاد علی کے کان کھڑے ہو گئے۔ جب عمر باغیچے سے کمرے میں آ کر قالین کے ایک کونے میں بیٹھ گیا تو استاد ان دونوں کو کنکھیوں سے

دیکھتا رہا عمر نہایت تمیز کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر رکھے قالین پر دوزانو بیٹھا تھا۔

توتوش نے باتوں باتوں میں کہا "پچھلے ماہ ہمیں مشرق سے یہ خبر ملی تھی کہ عیسائیوں کے بادشاہ رومانوس دیوجانس کو اس کی رعایا نے گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں سلائی پھری دی اور وہ اسی صدمے سے مر گیا"۔

یہ سن کر عمر مغموم ہو گیا۔ اسے وہ جنگ اور اپنے رضاعی بھائی کی موت یاد آ گئی۔

توتوش نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "تعجب ہوتا ہے ہمارے آقا سلطان الپ ارسلان کا سایہ خدا ہمیشہ ہم پر قائم رکھے اسنے اس بادشاہ کی جان بخشی کر دی تھی...... اور پھر اسے خود ہی اس کی رعایا نے قتل کر دیا۔ اس بات کا کسے اندازہ ہو سکتا تھا"۔

یہ کہہ کر اس نے عمر کی طرف دیکھا۔

"کسی کو نہیں" عمر نے جواب دیا کیونکہ توتوش اس سے جواب پانے کا متوقع معلوم ہوتا تھا۔

عمر کو بزرگوں کی اس مجلس سے رخصت کی اجازت مل گئی اور توتوش کی زبان پہلی مرتبہ بولنے سے رکی۔ وہ ہاتھی دانت کی اس تسبیح سے جو اس کے گلے میں پڑی تھی اس انداز سے کھیل رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہے......

توتوش نے بےتوجہی سے کہا "کیا تم پیشن گوئی کے علم پر اعتقاد رکھتے ہو؟ کیا ائندہ کا حال بتانا ممکن ہے؟"

لیکن استاد علی کسی ایسی بحث میں نہیں الجھ سکتا تھا اور پھر وہ بھی اپنے طاقتور

سرپرست کے خفیہ ایجنٹ کے ساتھ۔

وہ بولا ''ایمان کی قسم! اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہیچمداں تو اپنی کتاب کی تکمیل میں منہمک ہوں''

توتوش نے منہ ہی منہ میں استاد کے جواب سے اتفاق رائے کا اظہار کیا اور پھر پوچھا۔ ''فرض کرو ایک شخص تین پیشن گوئیاں کرتا ہے تو اسے آئینہ دانش کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ اس کی تینوں پیشن گوئیاں محض اتفاق سے صحیح ثابت ہو جائیں؟''۔

اس سوال نے بوڑھے استاد کی فطری صلاحیتوں کو جگا دیا وہ بولا ''دو پیشن گوئیاں تو اتفاق سے صحیح ثابت ہو سکتی ہیں لیکن تینوں ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ لیکن کون جوتشی اتنا بیوقوف ہوگا کہ بیک وقت تین باتوں کی پیشن گوئی کرے؟''

''ارے خود تمہارے شاگردوں میں سے ایک ایسا شخص موجود ہے جو زائچہ بنانے کا ماہر ہے اور یہ وہ نوجوان طالب علم ہے جس سے میں ابھی ابھی باتیں کر رہا تھا''۔

استاد علی کی داڑھی کے بال ایسے ہلنے لگے جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔ اس نے حیرت سے کہا ''عمر کم از کم اس چیز کی تو مجھے اس سے بالکل توقع نہیں ہے''۔

''واللہ! پھر وہ کیا کرتا ہے؟''

''معزز مہمان! وہ مکعب کی تعدیلوں کو اتنی ہی آسانی سے حل کر لیتا ہے جتنی آسانی سے آپ اپنے ریشمی دھاگے کی تسبیح پر دانے گنتے ہیں''

''اوہو تو پھر تو اسے ایک کام میں مہارت حاصل ہے۔ فرصت کے اوقات میں

وہ کیا کرتا ہے؟"

وہ میری سب کتابیں پڑھا کرتا ہے۔ ریگستان میں تنہا گھوما کرتا ہے۔ انار کھاتا چوسر کھیلتا اور بہت کم بولتا ہے اور کچھ ایسے وسوال بھی حل کرتا ہے جسے وہ ایک صندوقچے میں چھپا کر رکھتا ہے" یہ آخری جملہ کہتے وقت استاد علی کے لہجے سے کچھ عداوت ٹپک رہی تھی۔

"کوئی نوجوان ریگستان میں مارا مارا کیوں پھرے واللہ اے آئینہ دانش معمر ہو جانے کی وجہ ہمارے ولولے سرد پڑ گئے ہیں لیکن نوجوانوں کے خون میں حرارت ہوتی ہے۔ غالباً آپ کے اس شاگرد کو ریگستان کی ویرانی میں کوئی حسین محبوبہ مل گئی ہے"

"یہاں تو کوئی عورت نہیں سوائے ان بدصورت دھوبنوں کے جن کے بدن پر جوئیں سرسراتی رہتی ہیں"۔

جتو توش نے منہ بنالیا۔ اس کے چہرے سے ایسی افسردگی ٹپک رہی تھی کہ جیسے وہ چمن کی تلاش میں کسی ریگستان میں پہنچ گیا ہو۔ اور پھر بھی چمن کو دیکھنے کا متمنی ہو۔ وہ اپنی انگلیوں سے تسبیح پھرا رہا تھا اور آنکھیں جلدی جلدی سے جھپکا رہا تھا۔ وہ کہنے لگا "اوہو یہ تو عجب طالب علم ہے جو اتنا لائق اور پھر اتنا خاموش ہے۔ صرف اس عالم الغیب ہی کو علم ہوسکتا ہے کہ آیا یہاں کو شخص چھپا کر سفلی عمل کرتا ہے استاد کیا تم خیمہ دوز کے اس لڑکے کی قابلیت کی پوری جانچ کرو گے اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے لکھ کر اسے ایک لفافے میں سربمہر کرکے ایک ماہ کے نادر اسی کے ہاتھ میرے پاس

بھجوا دو گے تا کہ وہ جمعے کی شام یہ لفافہ مجھے نیشا پور کے باب حاقین پر پہنچا دے۔

اچھا اب...... تو توش نے گہری سانس لی اور مسکراتا ہوا اٹھا اور پھر بولا۔

''اب میں جسے علم کی تلاش ہے آپ کے مکان میں جو علم کا گھر ہے جاتا ہوں افسوس کہ میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے''۔

مہمان کے جانے کے بعد استاد کچھ دیر بہت متردد رہا۔ وہ تعجب کر رہا تھا کہ اسے عمر کی نگرانی کے لیے کہا گیا ہے حالانکہ اسے یہ شبہ تھا کہ عمر خود اس کی نگرانی پر مامور ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے عمر کے متعلق اپنی رائے لکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ کہیں اس کی نگاہوں کے سامنے ہی ان دونوں نے آپس میں کوئی خفیہ بات چیت تو نہیں کی۔ پھر وہ اس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ عمر کو نیشا پور کیوں بلایا گیا ہے۔ استاد علی ان تمام باتوں کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ایک ماہ گزر گیا۔ لیکن استاد علی عمر کا راز معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عمر خیام الجبرے کے عام مسائل پر توجہ کیوں نہیں دیتا اور نئے مسائل حل کرنے کا کیوں متمنی رہتا ہے۔ یقیناً اسے کسی روحانی طاقت کی تائید حاصل نہیں ہے عمر ان مسائل کو خود اپنے ریاضی کے ضابطوں کی مدد سے حل کرتا ہے۔ بات تو یہی تھی۔ لیکن استاس کو عمر پر تعجب ہوتا تھا اور حسد بھی، لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔

شام کے وقت استاد علی نے عمر سے اچانک کچھ باتیں تسلیم کرانے کی کوشش کی جیسا کہ وہ اس سے قبل ملعبوں کے معاملے میں کر چکا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

"عمر تو نظام الملک کے پاس کب واپس جائے گا؟"

نظام الملک سلطان الپ ارسلان کا وزیر اعظم تھا ملک میں اس کا طوطی بولتا تھا اور وہ استاد علی اور توتوش کا بھی سرپرست تھا۔

عمر نے تعجب سے جواب دیا "واپس ہوں گا؟ میں نے تو اسے کبھی دیکھا تک نہیں"

"پھر خدا کے لیے بتا کہ تو یہاں کس لیے ہے؟"

اس کے جواب میں عمر نے کہا کہ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد میں اپنے رضاعی بھائی رحیم کے یہاں رہنے لگا تھا۔ لیکن جب میدان جنگ سے واپس آیا تو رحیم کے گھر والوں نے مجھے منحوس قرار دیا جیسے رحیم کے مرنے کے بعد مجھے ان کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں رہا۔ انہوں نے زوئی کو بھی مجھ سے لے لیا تاکہ غلاموں کے بازار میں اسے فروخت کر دیں۔ اس کے بعد میرے لیے نیشاپور کی گلیوں میں جہاں میں نے رحیم کے ساتھ مسرت کے دن گزارے تھے آوارہ پھرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ میں آپ کے پاس یہاں اس امید پر تعلیم حاصل کرنے چلا آیا ہوں کہ ایک نئے کام میں لگ جاؤں۔

استاد علی نے کہا "اور وہ کام کون سا ہے؟ تو مکتب سے کون سا علم حاصل کر کے عرصہ حیات میں داخل ہو گا؟ لیکن تو پہلے اس بات پر غور کر کہ اس عالم سفلی میں عقل و دانش کیسے آئی اور دنیا کو عقل و دانش پیغمبروں نے سکھائی ہے جنہوں نے خود بھی تعلیم نہیں پائی، لیکن انہیں عالم باطن کے متعلق علم لدنی حاصل تھا عقل کی روشنی پھیلانے

والوں میں سب سے پہلے پیمبروں کا درجہ ہے اور ان کے بعد فلسفیوں کا۔ وہ پیمبروں کی تعلیمات کا مطالعہ اور اس کے بعد دوسرے علوم کا اکتساب کر کے عوام الناس کو وہ باتیں سمجھاتے ہیں جن تک ان کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔

''ممتاز پیمبروں میں زمانے کے لحاظ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام ہوئے دوسرے حضرت عیسی علیہ السلام اور تیسرے ہمارے پیغمبر جناب محمد علیہ التحیہ والتسلیم۔ یہ امر یقینی طور پر معلوم ہے لیکن جہاں تک فلسفیوں کا تعلق ہے لوگوں میں اختلاف رائے ہے۔ افسوس کہ میری معلومات کم ہیں اور میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پہلے افلاطون اور ارسطو اور پھر ہمارے استاد بوعلی سینا نے ہمارے تاریک ذہنوں کو عقل کی جلا دی''۔

''فلسفیوں کے بعد شاعروں کا درجہ ہے۔ شاعری کا فن خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ شاعر کا کام تخیل انسانی کو بیدار کرنا ہے اور بڑی چیز کو حقیر اور حقیر کو بڑا بنا کر پیش کرتا ہے غصے اور محبت، مسرت اور نفرت کے جذبات کو بھڑکا کر وہ اس دنیا سے بڑے اور حقیر سے حقیر سے کام کرا لیتا ہے''

''چونکہ وہ تخیل کو مہمیز کرتا ہے اور عقل کو روشن نہیں کر سکتا اس لیے شاعر کا فن فلسفی کے علم سے پست ہوتا ہ۔ آج تک ایسا کون شاعر گزرا ہے جس کے کلام نے کسی معنی کے فن کو حیات جاوید بخشی ہو''۔

''ریاضی داں کی محنت اکارت نہیں گئی۔ روشن حقیقت تک صرف وہی پہنچتا ہے۔ اور نامعلوم سے معلوم تک پہنچنے والے واحد راستے کو وہی دریافت کرتا ہے۔

الجبرا ریاجی کی بلند ترین شاخ ہے اور مجھے امید ہے کہ تو الجبرا کی تیسرے درجے کی تعدیلوں کو حل کرنے میں اپنی لیاقت کام میں لائے گا"

بوڑھے استاد کے الفاظ نے عمر پر بہت اثر کیا اور وہ اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا "میرا مطلب ...... یہ ہے کہ اور بھی مسائل موجود ہیں کاش ہماری عقل انہیں حل کر سکتی۔ کاش ہم ستاروں کی گردش کے راستے ناپ سکتے......"

"ستاروں کے راستے؟ لیکن یہ تو فلکیات کا کام ہے جس کا مقصد انسان کے معاملات پر سیاروں کے اثرات کا تعین کرنا ہے"۔

"پھر بھی مسائل یکساں ہیں"

"میرے شاگرد کیا تو یہ کہتا ہے کہ میری کتاب کے مسائل شاہی منجم کے مسائل کی مانند ہیں؟ یہ احمقانہ بات ہے...... یہ بات سن کر مجھے افسوس ہوا......"

"لیکن حقیقت تک رسائی ہو جائے تو ایک مسئلے کے دوسرے کے مسئلے کی حقیقت سے مختلف نہیں ہے"

استاد علی نے ایک آہ بھری اور کہا "میرے بیٹے! تو ایسی فضول خواہشوں کے لیے بہت کم عمر ہے وقت آنے پر تجھے لازمی طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایک فن جس حقیقت کا اظہار کرتا ہے وہ دوسرے فن سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر سلطان کا نجومی اپنی کوششوں کو ریاضی کی حقیقت تک محدود رکھتا تو......" اس وقت استاد علی کی داڑھی ہلنے لگی اس کی آواز بھر کر حلق میں پھنس گئی وہ ہنسنے لگا لیکن فوراً ہی وہ اپنی اس

فروگزاشت پر نادم ہو گیا اور سنجیدگی سے بولا ''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دماغ مختلف راہوں پر چل رہے ہیں میری خواہش تھی ...... کہ میں ریاضی کے ذریعے حقیقت کا مطالعہ کرنے میں تجھے مدد دیتا۔ نامعلوم سے معلوم تک پہنچنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اچھا کل میں تجھے ایک خط دوں گا۔ اسے تو نیشاپور لے جانا۔ ممکن ہے وہاں تجھے کوئی سرپرست مل جائے۔ خدا کرے تیرا سفر خوشگوار گزرے!''

عمر اٹھا تو وہ سوچ رہا تھا۔ اس بوڑھے استاد کو وہ بہت سی باتیں بتانی چاہتا تھا۔ لیکن اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس پر ایک اور دروازہ بند ہو گیا۔

عمر چلا گیا تو استاد علی نے قلم لیا اور ایک قیمتی سفید کاغذ پر حسب ذیل عبارت لکھنی شروع کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا شاگرد عمر خیام لیاقت میں بغداد کے استاد تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے پاس وہ راز ہے جس کی مدد سے وہ تمام مسائل حل کر لیتا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ وہ راز کیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس راز سے کام لے گا کیونکہ وہ ابھی تک اپنے تخیلات کا غلام ہے۔

''میں درخواست کرتا ہوں کہ اسکا یہ علم جو اس نے میرے گھر سے حاصل کیا ہے میرے اس سرپرست اور مربی کو پسند آئے جس کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ وہ اس نالائق علی سے زیادہ وفادار غلام نہیں رکھتا''۔

جب تحریر کی روشنائی خشک ہو گئی تو استاد علی نے کاغذ کو تہہ کیا اور تہوں پر پگھلا ہوا

موم لگا کر اپنی مہر لگا دی اور اس خط پر ''آقائے توتوش باب طاقین نیشاپور'' کا پتہ لکھ دیا۔

جمعے کے دن مغرب کی نماز سے قبل باب طاقین اور مسجد ابنائے حسین کے درمیان شیرینی فروشوں کی گلی

عمر گلی میں اکڑوں بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سیخ تھی جو ابھی ابھی آگ پر سے اتاری گئی تھی۔ اس گرم سیخ سے عمر بکری کے کباب اور لہسن کے ٹکڑے نوچتا اور اپنے گھٹنے پر رکھی ہوئی روٹی کے لقموں کے ساتھ چٹخارے لے لے کر کھاتا جاتا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی وہ نمک زار کے کنارے سے صبح ہی چل پڑا تھا راستے میں کہیں نہ ٹھہرا تھا بیشتر مسافت اس نے اس گدھے پر طے کی تھی جو نمک کی بوریاں لانے والے ایک اونٹ کے قافلے کے ساتھ آرہا تھا۔ اونٹ والوں سے باتیں کرنے اور ان کے گیت سننے میں عمر کو دھوپ کی گرمی بھی زیادہ محسوس نہ ہوئی اور راستہ اچھا کٹ گیا۔

مخالف ہواؤں میں دن بھر سفر کر کے ابراہیم کا بیٹا ہمیشہ مسرت محسوس کرتا تھا۔ گلی میں بیٹھا وہ ان آخری مسافروں کو دیکھ رہا تھا جو میدان طے کر کے باب طاقین سے نیشاپور پہنچ رہے تھے...... کھٹ پٹ دوڑتے ہوئے کچھ گدھے در درویش اور ان کے پیچھے ایک لاوارث بھیڑ کمہاروں کے چاک کے لیے چکنی مٹی سے لبالب بھری چوں چوں بولتی ہوئی ایک گاڑی اور ان کے بعد گھوڑوں کی شاندار قطاریں جن کی پیٹھ پر

بھاری بوجھ لدا تھا اور جو چلتے میں ایک ساتھ سر ہلاتے تھے۔

کباب والے نے عمر سے کہا ہاں یہ سمرقند سے آرہے ہیں۔ آج کل سمرقند کی سڑک سے آنے والے مسافروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے''۔

''اور وہ کیا لاتے ہیں؟'' عمر نے پوچھا۔

''خدا بہتر جانتا ہے ہاتھی دانت' ریشمی دھاگا' مشک' بلور' پیتل اور ریوند چینی' غرض کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کے ساتھ نہ آتی ہو''۔

''لیکن ایسے کباب نہیں جیسے یہ ہیں'' عمر نے مسکرا کر کہا اور خالی سیخ دکان دار کو واپس کر دی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین پیسے گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

۔ماشاء اللہ ہماری بھیڑیں توانا ہوتی ہیں۔

دکان دار عمر کا جملہ سن کر مگن ہو گیا۔ اور اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا ''ابے نالائق کے بچے اونگھ رہا ہے دیکھتا نہیں کہ نواب صاحب کو پیاس لگی ہے پانی پیش کر''۔

ان کے قریب ایک لڑکا اپنے کاندھے پر پیتل کا ایک بڑا سا برتن لادے کھڑا تھا۔ پھل والے کی دکان کے سامنے ایک قصہ گو جو کہانی سنا رہا تھا۔ لڑکے کا دھیان اس کی طرف تھا۔ دکان دار کی ڈانٹ سن کر وہ مڑا اپنی پیٹی سے چینی کا ایک پیالہ نکالا اور اس میں پیتل کے برتن سے پانی بھر کر عمر کو دیا۔ عمر نے خوش ہو کر پانی پیا پیالے میں دوبارہ پانی ڈال کر ہاتھ دھوئے اور لڑکے کے دیے ہوئے تولیے سے ہاتھ پونچھے۔

''خدا کے نام پر'' لڑکے نے آہستہ سے کہا اور عمر نے اس کے ہاتھ پر ایک پیسہ رکھ دیا۔ ادھر کباب والا بڑبڑایا اور کہنے لگا یہ ستے بڑے لالچی ہیں پیسہ لیے بغیر کسی مسلمان کو پانی تک نہیں پلاتے۔

''اور بھوکے مسلمان کو کھانا کھلانے کے متعلق کیا خیال ہے؟'' عمر نے مسکرا کر پوچھا۔

''جناب مجھے کوئی ایسا شخص بتا دیجیے جو مجھے ایک بھیڑ بھی مفت دے اور پھر جلانے کے لیے کوئلہ تیخ گھمانے کے لیے ایک چھوکرا بھی مفت مل جائے تو میں بڑی خوشی سے مفت کباب بانٹوں''۔ کباب والے نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور پھر بولا۔

''لیکن غالباً آپ زائر ہیں اور مشہد مقدس کی زیارت کو جا رہے ہیں۔ پھر وہ عمر کے دیے ہوئے تین پیسوں کو گننے لگا۔ اسے یہ نوجوان طالب علم شان اور مزاج کے لحاظ سے عرب معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے جسم پر اونٹ کے بال کی صرف ایک عبا اور ایک خرجی تھی اس کے باوجود اس کی باتیں......

عمر نے کہا ''مجھے معلوم نہیں کہ میں کہاں جا رہا ہوں''۔

بس یہ وہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہ بھی اس ہجوم میں شامل ہے جو شیرینی فروشوں کی گلی سے گزر کر قریبی مسجد کو جا رہا ہے جمعے کا دن تھا اور بہت سے نمازی مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے تھے۔

گلی میں اب زیادہ دھوپ نہیں رہی تھی۔ لنگوٹیاں باندھے کچھ ننگے لڑکے مشکوں سے گلی میں چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ راہگیروں کے چلنے سے شور ہو رہا تھا۔ لیکن اندھے

قصہ گو کی بلند آواز اس شور میں بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ ان عاشقوں کا حال بیان کر رہا تھا جو ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے تھے۔

عمر کے سامنے سے ایک نازک اندام لڑکی گزری اس کی چال آہستہ ہو گئی۔ اس نے لڑکی کی سرمگیں آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے اور وہ سنہری زلف جو نقاب سے باہر چمک رہی تھی عمر کو جانی پہچانی سی نظر آئی۔ اسے زونی کا خیال آنے لگا۔ وہ اپنے کاغذ اور کتابیں لے کر فوراً کھڑا ہو گیا اور اس لڑکی کے پیچھے چل دیا جس نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔

کباب فروش نے اطمینان کی سانس لی اور پیسے اپنی صندوقچی میں ڈال دیے ''وہ زائر نہیں معلوم ہوتا'' دکان دار بڑبڑایا اور پھر چیخنے لگا ''آؤ کسے بھوک لگی ہے کون عمدہ گوشت کھانا چاہتا ہے۔ آؤ کباب کھائی ان میں نہ ہڈیاں ہیں اور نہ یہ باسی ہیں''۔

دور مسجد کے مینار سے موذن کی آواز آ رہی تھی۔

حی علی الصلوۃ۔ حی الصلوۃ۔ الا الہ الا اللہ

سجود کے بعد قیام اور قیام کے بعد سجود عمر نماز کے مقرر ارکان ادا کر رہا تھا۔ اوپر لٹکے ہوئے فانوسوں سے روشنی آ رہی تھی اور نمازیوں کی آواز سے مسجد میں عجب سی گونج پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے قریب صف میں کھڑے ہوئے نمازیوں کے کپڑے سرسراتے جاتے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر عمر دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد سے باہر نکلنے لگا تو اس

کی نگاہیں عورتوں کی اس ٹولی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

نیلے نقاب والی لڑکی ان عورتوں کے پیچھے چل رہی تھی اور ایک موٹا سا نوکر اس کے ساتھ تھا۔ صحن میں جا کر اس نے اپنے جوتے اس طرح بے پروائی سے باندھے کہ چند قدم چلنے کے بعد ان میں سے ایک گر گیا۔

وہ پیچھے دوڑ کر آئی اور عمر کے بالکل قریب جھک کر اپنا جوتا اٹھانے لگی۔ راہگیروں کے قدموں کی آواز کے شور میں اس نے لڑکی کو آہستہ سے یہ کہتے سنا ابراہیم کے بیٹے! میری سالگرہ پر گلاب کے پھول نہیں تھے۔

عمر جواب نہ دینے پایا تھا کہ لڑکی چل دی اور پھر بڑی شان سے نگاہیں نیچی کر کے ملازم کے ہمراہ چلنے لگی۔ تب عمر کو یاد آیا کہ آج سے تین سال پہلے یاسمین نام کی ایک بچی نے اسے گلاب کا پھول دیا تھا۔

جب وہ شیرینی فروشوں کی گلی سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ باب طاقین بند ہو چکا ہے اور چند ترک نیزہ باز وہاں پہرہ دے رہے ہیں۔ جھٹ پٹا وقت تھا اور دکان دار اپنی دکانوں میں چراغ جلا رہے تھے۔

''خدا کی پناہ خیال زیادہ جلدی نہ کرو''۔

ایک پستہ قد اور موٹے شخص نے جو چمکدار اور زعفرانی رنگ کی ریشمی عبا پہنے ایک خوبصورت ٹٹو پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا عمر نے کہا عمر نے پہچان لیا کہ وہ توتوش ہے۔ اس نے جیب سے استاد علی کا خط نکال کر اسے دیا۔ موٹے توتوش نے فوراً خط کھولا اور ایک چراغ کے قریب جھک کر اسے پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے بعد خط کو

تہ کر کے اس نے اپنی جیب میں رکھا اور عمر کو ایک نقرئی درہم دیا معلوم نہیں توتوش

اس خط سے خوش ہوا تھا یا نہیں۔ پھر بھی استاد علی نے عمر کو کنایتاً یہ بتا دیا تھا کہ توتوش

جو ایوان دانش میں استاد علی سے ملنے آیا تھا اس کا دوست بن سکتا ہے۔

توتوش نے اپنی تسبیح کے دانے گنتے ہوئے کہا ''نیشاپور میں تمہارا گھر کہاں

ہے؟''

''خواجہ علی کے دوست! اب میرا کوئی گھر نہیں ہے''توتوش نے اس نوجوان کی

پھٹی عبا اور بوسیدہ خرجی کو غور سے دیکھا اور ایسی لاپروائی سے جیسے وہ کسی کتے کو ٹکڑا

ڈال رہا ہو کہا ''شاید میں ایک زین ساز کے مکان میں تیرا ٹھکانہ کر سکوں بشرطیکہ تو

اس کے آٹھ بچوں کو قرآن پڑھا سکے''۔

توتوش کے لہجے اور رویے میں سراسر بدتمیزی تھی۔ عمر کو تاؤ آ گیا۔ اس نے بگڑ

کر کہا۔ ''غریبوں کے محافظ آپ کسی خوجے کے لڑکے کے لیے جس نے مکتب میں

کچھ تعلیم حاصل کی ہو ٹھکانا تلاش کیجیے اب مجھے اجازت دیجیے''۔

یقیناً توتوش نے لاپروائی سے کہا اور اپنے ٹٹو کی باگ موڑ کر ایک طرف چل

دیا۔ آگے چل کو وہ رکا اور ایک فقیر کے کاسے میں جو یا حق کی صدا لگا رہا تھا ایک سکہ

ڈال دیا۔

اس نے چپکے سے فقیر سے کہا ''بھوری عبا والے اس نوجوان کا پیچھا کرو۔ دیکھو وہ

کیا کرتا ہے اور اس وقت تک اس کا پیچھا کیے جاؤ جب تک اس کی قیام گاہ کا پتہ نہ

چل جائے''

فقیر نے آہستہ سے جواب دیا ''حضور کا جو حکم'' اس نے سکہ اٹھا کر زور سے جماہی لی اور اپنا لبادہ اس طرح سمیٹا کہ گویا اس امیر کی خیرات پانے کے بعد اسے آج کی روزی پہنچ گئی ہو۔

عمر راہ گیروں کے ہجوم کے ایک سائے کی مانند چل رہا تھا۔ گو ہر دھوئیں اور پیاز کے بگھار کی خوشبو سونگھ کر اسے عجب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر تو توش نے مجھے حقارت سے دیکھا تو کیا ہوا؟ میری جیب میں دو درہم ہیں اور کچھ عرصے کے لیے تو میں ٹاٹ سے گزارا کر سکتا ہوں۔ میں اپنے پرانے مکان میں جا کر اسی چھت پر سو جاؤں جہاں گھاس کی بھینی خوشبوئیں ہوں گی اگر اس محلے کے بھلے لوگوں کو دنیا کی کچھ خبریں سناؤں تو وہ یقیناً میرے سامنے کھانا رکھیں گے۔ کاش رحیم یہاں ہوتا''۔

کتب فروشوں کی گلی میں پہنچ کر عمر اس پرانے چشمے کے پاس ٹھہرا۔ اس نے اپنے تصور میں دیکھا کہ وہ لڑکی جو پانی کا گھڑا لیے کھڑی تھی جھکی اور اس نے گھڑے کا منہ پانی کی دھار کے نیچے کر دیا۔ پھر عمر پتھر پر اس کے قریب بیٹھ گیا لیکن اب جبکہ وہ اس کے پاس لوٹ آیا تھا وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی تھی۔ چنار کے درخت کے نیچے اندھیرا تھا اور نقاب کے گوشوں سے لڑکی کی آنکھیں اسے دیکھنے کی کوشش میں تھیں۔ بے تابی سے لڑکی نے اپنے ماتھے سے بالوں کی لٹ ہٹائی۔ عمر نے اس کی تیز سانسوں کو سنا اس تاریکی میں یاسمین موجود تھی۔ وہ بالکل بدل گئی تھی وہ خاموش تھی اور نقاب پوشوں بھی اس کا جسم گلاب سے معطر تھا۔ گھڑا بھر گیا۔ اور اس میں

سے پانی بہنے لگا۔لڑکی نے حرکت نہ کی۔وہ بڑی ہو گئی تھی۔اور اس کا عریاں سفید بازو اندھیرے میں چمک رہا تھا۔

بوجھل آواز میں عمر بڑبڑایا"یاسمین تو یہاں کس کا انتظار کر رہی ہے"؟

لڑکی چونک پڑی جیسے اسے چوٹ لگی ہو۔بیوقوف وہی احمق...... میں کسی کا انتظار نہیں کر رہی!"

گھڑے کو ہاتھ سے گرا کر وہ اٹھی اور گلی میں غائب ہو گئی وہ بے تحاشا بھاگی کیونکہ تین سال تک روزانہ اس نے اس کا انتظار کیا تھا اور اس کی راہ تکی تھی اور خود کو یقین دلایا تھا کہ عمرو واپس آئے گا۔

چنار کے درخت کی آڑ سے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک فقیر لنگڑاتا ہوا اس کے پاس پتھر کے قریب آیا۔اور گڑگڑا کر کہنے لگا خدا کے نام پر محتاج کو کچھ دو!۔

نیشا پور کے مزار پر قبرستان......سرو کے جھنڈ میں دریا کے کنارے دوپہر کا وقت

قبرستان کی منتشر قبروں پر وہ پھولوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا اور انسانوں کی اس آخری آرام گاہ پر ایک دلفریب قالین بچھا دیا تھا۔خوشگوار دھوپ کی روشنی میں مزاروں کی لوحیں چمک رہی تھیں۔کسی پر عماموں کے نقش تھے کسی پر پھولوں کے گچھوں کے اور کسی پر کوئی نقش نہ تھا...... یہ سب قبریں عورتوں کی تھیں۔

سرو کے درختوں تلے نقاب پوش عورتیں سر جوڑے آپس میں باتیں کر رہی

تھیں۔ وہ قبروں کے قریب حلقے بنائے بیٹھی تھیں۔ انہیں بچوں کی زیادہ فکر نہ تھی۔ جو گھاس پر کھیلتے پھر رہے تھے۔

یہ جمعے کا مبارک دن تھا۔ اس دن عورتیں فاتحہ پڑھنے ٹولیاں بنا کر قبرستان آتی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ مزے مزے کی باتیں کرتیں۔ کچھ بڑی عمر کی لڑکیاں عورتوں کی ٹولیوں میں ٹہلتی پھرتیں اور سرو کے اس جھنڈ میں نکل جاتیں جہاں انہیں کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ عورتوں کی موجودگی میں کوئی مرد قبرستان میں آنے کی جرات نہ کرتا تھا۔ پھر بھی دریا کے قریب کچھ پگڈنڈیاں اور سبزہ زار تھے جہاں مجبور عاشق اپنی من موہنیوں کا انتظار کرتے۔

یاسمین ٹہلتی ٹہلتی آگے نکل گئی تھی۔ ایک چٹان پر لیٹی ہوئی وہ ان کبوتروں کو تک رہی تھی جو اس کے سر ہی پر اڑ رہے تھے۔ اس کے قریب ایک کھنڈر کی دیوار تھی اور ان کبوتروں کے گھونسلے اسی دیوار میں تھے۔ دیوار پر کوئی چھت نہ تھی اسے اس بلند مینار کی چاردیواری کے طور پر بنایا گیا تھا۔ جس کی تعمیر غایت یہ تھی کہ وہ دریا اور قبرستان کے قریب میدان کی پاسبانی کے لیے چوکی کا کام دے لیکن پچھلے کئی سال سے ملک میں امن و امان تھا اور یہ مینار بیکار پڑا تھا اس میں کبوتروں نے گھونسلے بنا لیے تھے اور عمر کی طرح جو رات کو یہاں اکثر ستاروں کا مطالعہ کرنے آتا تھا بھولے بھٹکے لوگ یہاں ٹھہر جاتے تھے۔

یاسمین نے اپنے دل میں کہا ”ارے میں یہاں کیوں آئی ہوں؟“ دھوپ میں اڑتے ہوئے کبوتروں کی طرح اس کے خیالات بھی آزادی سے پرواز کرنے لگے

یاسمین نے بڑی احتیاط سے اپنے دل میں ایسے موقع کے لیے جب اسکے پہلو میں کوئی مرد ہو' منصوبہ بنایا تھا اس نے اپنی بہن کی طرح اس مرد کو ساحرانہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کے سامنے ایسے جذبات انگیز جملے کہنے کی مشق بھی کی تھی جو بالآخر اس مرد کو اپنا دیوانہ بنالیں گے لیکن جمعے کے اس ماتمی لباس کے اندر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اپنی زبان سے مہمل الفاظ کہے جا رہی تھی۔

اور اس کے پہلو میں لیٹا ہوا شخص اتنی دیر سے خاموش تھا لیکن اس کی آنکھوں مین پیاس تھی۔

''ارے کچھ تو بولو' یاسمین نے اس شخص سے کہا۔

''ننھی یاسمین! میں کیوں بولوں؟'' عمر نے یہ کہتے وقت اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا' لیکن اسے یاسمین کی بلوریں گردن' یاقوتی ہونٹوں اور حسین آنکھوں کی قربت کا احساس تھا۔

''کیا تم جنگ میں شامل نہیں ہوئے اور تم نے سلطان کو نہیں دیکھا؟'' اور...... پھر دوسرے شہروں میں اور بہت سی لڑکیوں کے حسن سے تم نے اپنی آنکھیں نہیں سینکیں۔ بتاؤ! تم نے اور کیا کیا دیکھا؟''

عمر اس وقت زوئی اور خراسان کی لمبی سڑک کے متعلق سوچنے لگا اس نے بے ساختہ کہا'' وہ جنگ کچھ بھی نہ تھی۔ واللہ ہم بساط کے مہروں کے مانند گردش کرتے اور پھر اپنے خانوں میں پہنچ جاتے تھے۔ جنگ کے متعلق کئی کیا بتا سکتا ہے؟''

ایک بہت پرانی یاد کی طرح یاسمین کو سبزے پر سوار اس فاتح امیر کا خیال آیا جو

اپنے جلو میں نیزہ بازوں کا دستہ لیے آئے گا اور اسے اپنے ہمراہ سفید بطوں والے خیمے میں لے جائے گا۔

''نیشاپور میں تم کیا کرو گے؟'' یاسمین نے تعجب سے پوچھا۔

''کون جانے؟''

''کیا تم پھر واپس جاؤ گے؟''

عمر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ نہ واپس جانا چاہتا تھا اور نہ یاسمین کے علاوہ جو گزشتہ برسوں میں ایک سنجیدہ بچی کے بجائے حسین اور دلکش عورت بن گئی تھی کسی اور چیز کے متعلق سوچنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بدلی نہیں تھی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے عمر کسی خیال میں غرق تھا اور قبرستان سے واپس جانے والوں کے ان چھوٹے چھوٹے سایوں کو تک رہا تھا جو دور شہر کے دروازوں تک پہنچ رہے تھے۔

یاسمین نے کہا ''لوگ کہتے ہیں کہ تم آئینہ دانش کے محبوب شاگرد تھے اور اب تم خود استاد جیسے معلوم ہوتے ہو''۔

عمر کو یہ بات سن کر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ یاسمین نے کتب فروشوں کی گلی میں یہ ذکر سنا ہوگا جہاں مدرسے کی باتوں کا چرچا رہتا ہے۔

اس نے ہنس کر کہا ''لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ نہ میرے پاس کام کے لیے جگہ ہے نہ میرا کوئی سرپرست ہے' اور نہ کوئی اپنی چیز ہے۔ درویش کو اپنا پیٹ بھرنے کے ڈھنگ آتے ہیں اور معلم کو اس کی روزی ملتی ہے لیکن میرے پاس کیا ہے؟''

یاسمین گھاس پر اس کے اور قریب لیٹ گئی۔ اگر واقعی عمر فقیر ہوتا تو اسے کوئی اس

سے نہ چھینتا۔ یہ اور اچھا ہوتا۔ غیر ارادی طور پر وہ عمر سے کہنے لگی۔ ''عقلمند ہونے کی بجائے تم احمد جوتشی سے بھی زیادہ بے وقوف ہو گئے ہو۔ احمد ستاروں کا حال بتا کر بہت کچھ کما لیتا ہے۔ اس کے پاس ریشمی عبا اور ایک حبشی غلام ہے...... دیکھو اب سب عورتیں جا چکیں مجھے اب جانا چاہیے!''

لیکن عمر نے اس کی کلائی پکڑ لی تو یاسمین نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ کبوتر مینار کے طاقوں میں بسیرا کر رہے تھے اور اب کوئی کبوتر آسمان پر اڑتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ یاسمین نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا ''دیکھو چاند نکل آیا ہے اب مجھے جانا چاہیے''

''جلد ہی اس ہلال کے درمیان ایک ستارہ دکھائی دے گا'' یاسمین نے قہقہہ لگا کر کہا ''نہیں میں اسے نہیں دیکھوں گی''۔

''اپنے اس عظیم مینار میں تنہا بیٹھ کر تم ہی اس ستارے کو اور دوسرے تمام ستاروں کو دیکھو گے۔ کیا تمہیں ان مردوں سے ڈر نہیں لگتا جو کفن پہنے اپنی قبروں سے باہر نکل کر یہاں بیٹھے رہتے ہیں''؟

''نہیں وہ میرے دوست ہیں۔ وہ میرے لیے فلکیات کا سازو سامان اور ستاروں کی روشنی لاتے ہیں اور مجھے وہ علم سکھاتے ہیں جو کلدانیوں کو معلوم تھا''۔

خوف کے مارے یاسمین اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ عمر تعجب انگیز عقل رکھتا ہے اور اس کی مدد سے وہ راز معلوم کرتا ہے۔ غالباً وہ مردوں سے بھی بات چیت کر سکتا ہے۔

"لیکن تم کلدانیوں کی زبان کیسے بات چیت کر لیتے ہو؟"

"نہیں یاسمین! خدا کا ایک فرشتہ اس دیوار پر آ کر بیٹھتا ہے اور مردے جو کچھ کہتے ہیں وہ مجھے سمجھاتا ہے۔ کیونکہ فرشتے دنیا کی سب زبانیں جانتے ہیں"۔

"یہ مزاق ہے! فرشتوں کے متعلق مذاق کرنا گناہ ہے۔ کیا واقعی یہاں بھوت آتے ہیں؟"

وہ عمر کے اور قریب بیٹھ گئی اور قبرستان کی قبروں کے تاریک سایے دیکھنے لگی۔ عمر نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور وہ کانپ گئی اور ایک طرف کو کھنچنے لگی۔ اس پر غنودگی سی چھا گئی ار اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

عمر اس کے دل کی دھڑکن اور تیز سانسیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "مجھے ڈر لگ رہا ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے!" الفاظ عمر کے جذبات کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ یاسمین نے اس کے چہرے کو ہاتھوں سے دبایا۔ عمر بولا "میری طرف دیکھو!" لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔

آسمان پر ہلال کی باریک نیم محراب کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی اور اسکے بیچ میں ایک ستارہ چمک رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے سیاہ پردے پر کسی نے چاند کا ور ستارے کی تصویر بنائی ہے۔ عمر کو ایک عجب تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کا تمام جسم دکھ رہا تھا۔ لیکن یہ درد اس وقت رک گیا جب اسنے یاسمین کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ مس کر دیے۔

"نہیں اس سے تکلیف ہوتی ہے نہیں میں......" یاسمین نے گہری سانس لے کر

کہا۔

ستاروں کی ملگجی روشنی میں سیاہ دوپٹے نے یاسمین کے گورے بازوؤں کو اور چمکا دیا تھا۔یاسمین نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے اس کو اپنے سینے سے لگایا اور اپنے گرم ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔محبت کے جوش میں وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد بہت دیر عمر اور یاسمین آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے پھر شہر کے دروازے پر پہنچے نہ انہیں اس راستے کا احساس تھا جس پر وہ چل رہے تھے اور نہ اس ماہ نو کا جو چیچے کی طرح آسمان پر چمک رہا تھا جب وہ کتب فروشوں کی گلی میں چنار کے درخت کے نیچے چشمے پر پہنچے تو یاسمین عمر سے لپٹ گئی روتے روتے اس کا نقاب آنسوؤں سے بھیگ گیا۔وہ بولی "جان جان! میں تجھے کس طرح چھوڑ سکتی ہوں؟"
یاسمین نے زندگی میں صرف ایک ہی بار محبت کی تھی اور اس کا ایک ہی محبوب تھا۔جدائی کے غم سے اس کا تمام جسم شل تھا۔یقیناً خدا کا وہ فرشتہ ویران مینار کی دیوار پر آ کر بیٹھا ہوگا۔اور اس نے یاسمین کے جسم کی طاقت کھینچ لی ہوگی

عمر کو نہ کھانے کی خواہش ہوئی اور نہ وہ سو سکا۔اس پر غنودگی طاری تھی لیکن اس کے حواس فسون شب سے مسحور تھے عمر اس فقیر پر جو اس کی قیام گاہ کے دروازے پر پڑا تھا مسکرایا۔یہ وہی فقیر تھا جسے اس نے پچھلے دنوں شہر کی گلیوں میں پھرتے دیکھا تھا۔وہ بہت دیر تک آوارہ پھرتا رہا پھر اس کے قدم خود بخود باغ کی جانی پہچانی سڑک کی طرف اٹھ گئے یہاں اس باغ میں چوکی دار مدور قندیلیں ہاتھ میں لیے خدا

کے نام پر لوگوں کو چیخ چیخکر ہر گھنٹے پر وقت بتاتے تھے۔ عمر پر مدہوشی سی طاری تھی اور شب کی تاریکی میں اسے تعجب شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ایک سایہ دیکھا جو اس کے پیچھے درختوں سے نکل کر تالاب تک گیا جہاں خانماں لوگ سو رہے تھے اور رات کے اس سحر آفریں سماں سے بے خبر نیند میں خراٹے لے رہے تھے۔

ایک کبڑے آدمی کے قریب ایک سفید گدھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یہ کبڑا اپنے بدن پر کپڑا لپیٹتا ہوا تالاب کے کنارے تک سرک کر آیا۔ عمر کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے انہیں کبھی خواب میں دیکھا ہے...... جیسے اس وقت سے پہلے اس نے ان کو کبھی دیکھا ہو لیکن اس صورت سے نہیں......

عمر اس کبڑے کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ کبڑے نے پانی کی طرف اشارہ کر کے کہا بھائی چاند آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گیا ہے۔ عمر نے پانی میں ہلال کا نیمچہ نما عکس دیکھا۔ اس رات عمر کے نزدیک رنج کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ لیکن اسے علم تھا کہ کبڑا رنجیدہ ہے۔

''تو کیا کرتا ہے؟'' عمر نے نرمی سے پوچھا۔

''میں پہرا دیتا ہوں۔ دیکھو! یہ دوسرے لوگ کس طرح سو رہے ہیں یقیناً میں اس چاند کی نگرانی کرتا ہوں جو پانی میں ڈوب گیا ہے۔ کیونکہ اصل چاند وہی ہے اور یہ آسمان کا دوسرا چاند غیر تغیر پذیر اور بے پرواہ ہے۔ ہاں یہ ڈوب جائے گا اور پھر نکلے گا۔ گویا یہ رات بھی دوسری راتوں کے مانند ہے''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے'' عمر نے کہا۔

کبڑے نے خوابیدہ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان لوگوں کا آقا موجود ہے ایک نیا آقا لیکن میں جعفرک ہوں اور میرا آقا مر چکا ہے۔ واللہ وہ عنایتوں کا آفتاب تھا واللہ وہ بدنصیبوں کا محافظ تھا۔ واللہ وہ جعفرک جیسے بدصورت اور انتہائی ذلیل غلام سے محبت کرتا تھا۔ اب سورج کی اس زمین سے سورج اٹھ گیا۔ وفاداروں کا محافظ اور جعفرک کا محبوب چھن گیا۔ واللہ سلطان ارسلان قتل ہو گیا"۔

عمر پانی پر چاند کے رواں عکس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے جعفرک کی کوئی بات سنی اور کوئی نہ سنی وہ بولا مجھ معلوم نہیں"۔

"تمام نیشاپور جانتا ہے کہ آج ہم سمرقند سے اس کی لاش لے کر آئے ہیں۔ یہ اس کی قسمت تھی۔ میرے بھائی دیکھو اس کا اقتدار زبردست ہے! میرے اس آقا کے سامنے مرقند میں ایک ذلیل قیدی لایا گیا اور جب یہ قیدی میرے آقا کے روبرو پیش کیا گیا تو دو مضبوط جلاد اس کے بازو پکڑے ہوئے تھے۔ اس ذلیل شخص نے میرے مرحوم سلطان کو گالی دی۔ سلطان غصے سے سرخ ہو گیا اس نے اپنا تیر مان نکالا اور جلادوں کو الگ کھڑا ہونے کا حکم دیا وہ چاہتا تھا۔ کہ اس ذلیل کتے کو اپنے تیر سے ہلاک کرے۔ وہ تیر انداز سلطان ج کا تیر کبھی خطا نہیں ہوا" جعفرک کو پسینہ آ گیا اس نے اپنا منہ پونچھا اور آہ بھر کر کہا کہ "لیکن اس کو وہ تیر خطا ہو گیا اور اس ذلیل کتے نے جس کے پاس دو خنجر چھپے ہوئے تھے میرے آقا پر اچھل کر حملہ کر دیا اور میرے آقا مرحوم کے پیٹ پر تین وار کیے۔ چار دن کے بعد میرا آقا اللہ کو پیارا ہو گیا"۔

''الامان''عمر نے منہ ہی منہ میں کہا۔

جعفر ک جو فرط غم سے آگے پیچھے ہل ہل کر رو رہا تھا کہہ رہا تھا۔

''میں آنسوؤں کی چاندنی میں بیٹھا ہوں اور رو رہا ہوں''۔ عمر کو دور رات کی تاریکی مُں رحیم کی قبر دکھائی دے رہی تھی اور وہ وقت یاد آ رہا تھا جب رحیم کا غلام اس کے قریب بیٹھا اسی انداز سے رو رہا تھا۔

زخمی فقیر بڑبڑایا'' دیگ کا اندازہ ایک چاول سے ہو جاتا ہے۔ نہیں وہ ابھی جوان ہے اور اس کے جسم میں شب بیداری کی طاقت ہے۔ افوہ مجھ پر تو نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ کیا گوشہ جمعے کی شام سے میں اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہو؟ نہیں وہ مشکوک نہیں ہے۔ سر دست تو اس کی یہ حالت ہے کہ وہ بیل اور گدھے کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا''۔

توتوش نے اس سے پوچھا'' کیا وہ لڑکی کنیز ہے؟ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟''

فقیر نے عیاری سے آنکھ مار کر کہا'' رات کے وقت بلی سائل نظر آتی ہے۔ لیکن وہ کنیز نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے گھر کی مستورات اس سے خاصا کام لیتی ہیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے''۔

''اور اس کا نام کیا ہے؟''

''لوگ اسے یاسمین کہتے ہیں شان حسین حمام کا مالک کہتا ہے کہ مشہد کے ایک کپڑے کے تاجر ابوزید نے اس اندھے کتب فروش کو اس لڑکی کے لیے اپنا پیام بھیجا

ہے''۔

ابو زید تاجر ہے؟

''ہاں میرے آقا''۔

اس کے پاس ایک بڑا خیمہ اور اونٹ ہیں۔ توتوش یہ کہہ کر کچھ سوچتا رہا اور فقیر جسے اب تک اپنی اجرت نہیں ملی تھی ادب کے ساتھ منتظر رہا۔ پھر توتوش بولا ''کم ازکم ہمارا نوجوان خیام کتب فروشوں کی گلی سے نہیں جائے گا۔ تو جا اور جب تک پیغام پہنچے نگرانی کر''۔

''لیکن میرے آقا میں پیامبر کو کیسے پہچانوں گا؟''

''وہ تجھے اس طرح اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار کر کہے گا ''خیال کہاں گھوم رہا ہے؟'' اس وقت تو گہری نیند نہ سونا۔ دوسرے لوگوں کے بھی آنکھیں ہیں اور وہ تیرے خراٹے بھی سن سکتے ہیں''۔

''آقا وہ تیرے غلام کے نہیں ہیں......''

توتوش چل دیا۔ اس نے زمین پر تانبے کے چند سکے ڈال دیے اور فقیر جلدی جلدی اٹھانے لگا تاکہ کہیں وہ شریر بچے جو قریب ہی کھیل رہے تھے جھپٹ کر لے نہ جائیں۔ فقیر بڑبڑا رہا تھا بغدادی درہم سے زیادہ کے پیسے نہیں...... اتنی سخت محنت کا کتنا کم معاوضہ ہے اف وہ یہ امیر کا بچہ تو اپنی مٹھی سے پانی بھی نہ بہنے دے''

لیکن توتوش سے ڈرتا تھا' اور اس لیے اور بھی زیادہ اسے یہ علم نہ تھا کہ یہ موٹا اور پستہ قد آدمی کسی کا ملازم ہے۔ چنانچہ وہ جلد چنار کے درخت کے نیچے چشمے کے

قریب پتھر پر اپنی مخصوص جگہ پہنچنے کے لیے روانہ ہوگیا۔

اس نے دیکھا کہ مدرسے کے دروازے پر بڑی گہما گہمی ہے۔ لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے لوگ اپنے غلاموں کے ہمراہ آ جا رہے ہیں اور گلی کے آخر میں میدان کے قریب سے سواروں کے قافلے گزر رہے ہیں۔ نیشاپور کے باشندوں میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہوگئی تھی اور وہ یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ اب قسمت کیا رنگ لاتی ہے۔ سلطان تو مر چکا تھا حالانکہ شہر میں اس کا معقول سوگ منایا جا رہا تھا۔ لیکن جامع مسجد میں مولوی اپنے خطبوں میں نئے سلطان یعنی ملک شاہ کا نام لے رہے تھے۔ ملک شاہ نوجوان اور خوبصورت شہزادہ تھا۔ اور لوگ اسے شیر زادہ کہتے تھے۔

ملک شاہ جس کے چہرے پر ابھی پوری طرح سبزہ آغاز بھی نہ ہوا تھا اور جو ابھی مدرسے کتابوں اور شہسواری کے ماحول میں زندگی گزار رہا تھا یک ناصر الملۃ والدین سلطان الشرق و الغرب اور دنیا کا آقا بن گیا تھا امرائے خراسان اسے نذریں پیش کرنے کے لیے بے تاب تھے۔

فقیر یہ سب تماشا بے توجہی سے دیکھ رہا تھا' کیونکہ اسے تو عمر اور یاسمین کی فکر تھی۔ دن میں وہ شاذ ہی نظر آتے تھے لیکن جب چشمے پر رات کی تاریکی چھا جاتی تو آنے جانے والوں کی نگاہوں سے بے نیاز باہر اندھیرے میں دو سائے نظر آئے۔

فقیر سوچتا تھا کہ جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے وہ اچھی طرح نقاب میں چھپی ہوئی ہے اور وہ بھی ان سینکڑوں انسانوں کے مانند ہوگی جو شام کے وقت غپ لڑانے' تفریح کرنے اور قسمت کے کرشمے دیکھنے کے لیے نکلتے ہیں ورنہ اسے دیکھتا

اور پہچانتا۔

عمر کے متعلق اس کا یہ خیال تھا کہ یہ بلند قامت نوجوان ہوش و ہواس کھو چکا ہے۔صرف بھولے سے کبھی کبھی مسجد کے ہجوم میں زائروں کے ساتھ کھانا کھانے کا خیال آ جاتا تھا۔وہ چشمے پر پانی پیتا تھا اور کسی سے بات نہ کرتا تھا۔

فقیر کو عمر کی حالت پر رشک آتا تھا وہ سوچتا تھا کہ ''عمر اس شرابی کی مانند مست رہتا ہے جو ہر رات شراب کا قرابہ پی جاتا ہو۔لیکن اسے اس نشے کے لیے پھوٹی کوڑی بھی خرچ نہیں کرنی پڑتی''۔

دوسرے دن ایک قلی آیا اور اس نے فقیر کے سینے پر ٹھوکر مار کر کہا کہ ''جوؤں کو پالنے والے وہ تیرا خیام کہاں گھومتا ہے؟''

''اے آوارہ گرد! میں کسی کا پالنے والا نہیں'' فقیر نے غصے کی نظر سے نووارد کو دیکھا اور یہ اندازہ لگایا کہ وہ صرف ایک ایسا ملازم ہو سکتا ہے جسے کسی بھنگی نے ایک بے حیا اور چڑیل خصلت کمینی......عورت کے بطن سے پیدا کیا ہے......''۔

قلی نے فقیر کو ایک ٹھوکر اور لگائی تو وہ خاموش ہو گیا وہ بڑبڑایا ''تجھے کس نے بھیجا ہے؟''

''اس نے جو تیری لاش کو محل کے دروازے پر لٹکا کر چیل کوؤں کو کھلا سکتا ہے''

''عمر خیال سامنے شان حسین نام کے حمام میں ہے۔خدا گواہ ہے اگر میں حمام والے کو ایک درہم دے سکتا تو میں بھی اس حمام میں جاتا......''

قلی نے اسے یہ انعام دیا کہ اس کے کاسے میں تھوک کر چلتا بنا اور فقیر غصے

میں پیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔

"خدا کرے تیری قبر پر کتیا بچے دے! خدا کرے عقاب تیری ہڈیاں کھائیں! خدا کرے جہنم کی آگ تیری چربی پگھلائے!" فقیر گڑگڑا کر اسے بددعائیں دینے لگا۔

عمر اس قلی کے ہمراہ قصر سلطانی کے پہلے صحن میں پہنچا۔ جہاں تقریباً نصف درجن امراء کے مسلح دستے اپنے سجے ہوئے گھوڑوں کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے یہاں توتوش کو دیکھا جو انتہائی بے صبری کے عالم میں تھا۔ وہ عمر کو دیکھتے ہی چیخ پڑا۔ اس نے جلدی سے عمر کو آستین پکڑی اور محافظوں اور چوبداروں کے درمیان سے نکلتا ہوا جو سب اس نیلے عمامے اور لمبی عبا والے انسان کو خوب پہچانتے تھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں بیٹھنے کے لیے میز کرسی نہیں تھی۔

اس نے عمر سے کہا "خدا کی قسم مقررہ وقت گزر چکا ہے۔ لیکن ابھی اس نے تجھے بلایا نہیں ہے" پھر اس نے عمر کو تعجب کی نظروں سے دیکھا اور بولا "کیا تجھے معلوم ہے کہ نظام الملک نے تجھے کس لیے اپنے حضور میں یاد کیا ہے؟"

عمر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا...... اسے بہت زیادہ تعجب ہو رہا تھا۔ نظام الملک...... دنیا کا ناظم"۔ اس شخص کا خطاب ہے جو الپ ارسلان کا وزیر تھا اور جس کا مقتول سلطان کے جانشین ملک شاہ پر بھی انتہائی اثر تھا۔ پھر سلطان کے عہد حکومت میں نظام الملک کو تقریباً سیاہ و سفید کے اختیارات مل گئے تھے۔ وہ ایک ذہین اور دانشمند ایرانی تھا۔ جس نے فوج کے علاوہ بتدریج ملک کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں

لے لیا تھا۔ یہ تعجب انگیز بات تھی کہ اس نے مدرسے کے ایک طالب علم کو اپنے حضور میں کیوں یاد کیا ہے؟

توتوش نے اس راز پر کوئی روشنی نہ ڈالی۔ وہ کچھ سوچ کر بولا "میں نے باب طاقین پر تیری خودداری کو ٹھیس لگائی تھی یہ ایک آزمائش تھی۔ اور نظام الملک کے حکم سے میں نے تیری نگرانی بھی کرائی تھی"۔

عمر نے اس کو تیز نگاہوں سے دیکھا وہ کہہ رہا تھا...... "اور میں نے تجھ پر پہرا بھی لگایا تو نوجوان اور بے نیاز ہے لیکن اب اس وقت نظام الملک خود تیرا امتحان لے گا اس لیے ذرا احتیاط سے کام لینا"۔

عمر اس کی باتیں تو سن رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ یہ بیکار سی باتیں معلوم ہوتی تھیں...... تاوقتیکہ شیرزادہ جواب سلطان بن گیا تھا اسے طلب نہ کرتا لیکن شیرزادہ تو دور جنگلوں میں شکار کھیل رہا تھا اور خلا میں یاسمین کی پیاسی نظریں اسے دیکھ رہی تھیں۔

یکا یک ایک غلام نے سامنے سے بھاری پردہ گھسیٹا۔ اب عمر کو معلوم ہوا کہ یہ خالی کمرہ اصل میں ایک بڑے دیوان خانے کا بیرونی حصہ تھا جس کے اندر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ دالان کے وسط میں ایک ۶۰ سالہ انسان تنہا بیٹھا ان کاغذوں کو دیکھنے میں مصروف تھا جو اس کے سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی کھچوری ڈاڑی کے بال جن میں سلیقے سے کنگھی کی گئی تھی اس کی ریشمی عبا پر پڑے تھے اور وہ کچھ لوگوں سے مختصر باتیں کرتا اور ان میں سے ایک شخص کو جو اس کا معتمد معلوم ہوتا

تھا کاغذات دیتا جاتا۔ جو لوگ اس سے رخصت ہو کر سر جھکائے الٹے قدموں دیوان خانے کے دروازے کی طرف جاتے وہ ان کا سلام قبول کرتا۔

توتوش اپنے ساتھ عمر کو لے کر آگے بڑھا۔ وہ ایک بار سلام کرنے رکے اور پھر نظام الملک کے سامنے پہنچ کر قالین پر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

کچھ دیر تک نظام الملک اپنے گھنے ابروؤں میں سے عمر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کے کاغذوں کو دیکھا۔ اور کہا "تم ابراہیم خیام کے بیٹے ریاضی کے طالب علم اور استاد علی کے شاگرد ہو؟ اور بچپن میں تم نے امام موفق سے فلسفہ پڑھا تھا؟"

نظام الملک ایسی جچی تلی اور چست آواز میں بول رہا تھا کہ جیسے وہ شخص بولتا ہے جو بڑے مجمعوں میں گھنٹوں تقریر کر سکتا ہے۔ توتوش خاموش علیحدہ بیٹھا ہوا تھا۔

"استاد علی نے لکھا ہے کہ تم میں ایک عجیب و غریب طاقت کے مالک ہو۔ اللہ کے سوا کوئی طاقتور نہیں۔ میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کسی روحانی طاقت کے زور سے ہمارے آقا سلطان ملک شاہ سے اس زمانے میں جب وہ شہزادے تھے ملازگرد جنگ کے انجام اور قیصر روم اور ہمارے مرحوم سلطان دونوں کے مارے جانے کی پیشن گوئی کی تھی؟"

عمر کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ کاش اس کے جواب میں وہ کوئی قرین قیاس قصہ سنا سکتا لیکن عمر کو اس بات کا احساس تھا کہ یہ شخص جس کی نگاہیں تیز اور آواز سخت ہے کسی من گھڑت بات کو فوراً مسترد کر دے گا۔

اس نے ہمت کر کے کہا "عالی جاہ حقیقت میں ...... یہ پیشن گوئی ایک مذاق

تھی‘‘۔

نظام الملک نے بے چینی سے پہلو بدل کر سوال کیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ سمجھاو یہ مذاق نہیں ہو سکتا تھا۔

عمر کو اب اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے جو واقعہ ہوا تھا وہی بتایا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ’’لیکن یہ مذاق ہی تھا عالی جاہ! اس رات میں خیموں کے باہر گھوم رہا تھا اور اتفاقاً اس خیمہ کی طرف جا نکلا جہاں ترکوں کا پہرا تھا۔ میں ان کی باتیں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا...... اور نہ یہ مجھے احساس تھا کہ اس خیمے کا نوجوان امیر شہزادہ ہے۔ اس کے پاس جو استاد تھے انہوں نے سہل ستارہ دکھانے میں سخت غلطی کی۔ اس وقت اتفاق سے مجھے یہ خیال آ گیا کہ انہی کی طرح سنجیدہ انداز میں ایک پیشن گوئی بھی کر ڈالوں یہ تھی ساری بات‘‘۔

نظام الملک گاؤ تکیے سے کمر لگاتے ہوئے بولا ’’تم بدتمیزی کی حد تک صاف گو ہو۔ تم اس بات کا کیا جواب دو گے کہ اس مذاق میں تین واقعات کے متعلق صحیح پیشن گوئی کی گئی۔ یعنی جنگ اور دونوں بادشاہوں کے مارے جانے کے واقعات؟‘‘

عمر ایک منٹ کے لیے سوچتا رہا اور اس نے کہا ’’عالیجاہ میں اس کی تشریح کر سکتا ہوں اللہ کی مرضی کے بگیر کچھ نہیں ہوتا لیکن واقعہ یہی ہے!‘‘

نظام الملک نے عمر کو اس انداز سے دیکھا جیسے وہ ایک بے جان شے ہے اور اس کی جانچ کی جا رہی ہے ’’اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا میں جاننا چاہتا ہوں کہ کس چیز نے تجھے یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔ یقیناً تجھے قیصر روم کی پیدائش کا دن اور وقت معلوم

نہ تھا۔ تجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت کون سا ستارہ غالب تھی۔ پھر تو نے سلطان الپ ارسلان کا زائچہ کس طرح ترتیب دیا ہوگا؟''

توتوش نے خود ہی آنکھ ماری جیسے وہ نظام الملک کی چال کو سمجھ رہا ہو۔

عمر نے جواب دیا ''میں نے زائچہ نہیں بنایا تھا''۔

''لیکن تم میں زائچہ بنانے کی قابلیت ہے''۔

''یقیناً یہ قابلیت تو اور بھی سینکڑوں انسان رکھتے ہیں''۔

نظام الملک کی بھنویں سکڑ گئیں اس نے کہا ''ممکن ہے لیکن مجھے ابھی تک ایسا کوئی نجومی نہیں ملا جو بیک وقت تین پیشن گوئیاں کر سکے۔ اور پھر استاد علی کی رائے ہے کہ تم کسی عجیب و غریب طاقت کے مالک ہو''۔

توتوش اپنی جگہ نظام الملک کے اس جملے کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اسے نظام الملک نے یہ حکم دیا کہ عمر خیام کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرے۔

نظام الملک نے اچانک عمر سے یہ سوال کیا ''ابراہیم کے بیٹے کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد ملک شاہ تجھے کئی مرتبہ پوچھ چکا ہے؟''

''نہیں میں نے نہیں سنا''۔

نظام الملک اور توتوش دونوں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ نظام الملک مطمئن نظر آتا تھا حالانکہ اس نے اس کا کوئی اظہار نہ کیا۔ وہ بولا ''ابھی تو نو عمر ہے اور سلطان کے حضور پیش ہونے کا اہل نہیں اور چونکہ تیری پیشن گوئی صرف ایک مذاق تھی اس لیے تجھے اس کے حضور نہایت احتیاط برتنا پڑے گی۔ میں تجھ سے یہ بات

چھپانا نہیں چاہتا کہ ملک شاہ تجھ سے عنایت سے پیش آئے گا۔ لیکن وہ باتیں جو تو نے مجھے اس کمرے میں کہی ہیں تیری موت کا باعث نہیں تو تیری ذلت کا باعث یقیناً بن جائیں گی...... اپنی اس عجیب وغریب پیشن گوئی کے صلے میں تو سلطان سے کیا انعام مانگے گا؟''

عمر اس سوال پر شرما گیا وہ سوچ رہا تھا کہ اس رات کا ایک درہم اس کے لیے عذاب جان بن گیا ہے۔ اس نے جواب دیا ''مجھے سلطان کے دربار سے کیا واسطہ؟ مجھے کسی انعام کی تمنا نہیں ہے''۔

نظام الملک کو عمر کی اس بات پر پورا یقین نہ آیا۔ وہ سلطان کے دربار کے طور طریقوں سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ اس نے مناسب سمجھا کہ اس ضدی نوجوان کو سمجھائے۔ وہ بولا ''میں وزیر ہوں اور ملک شاہ کا خادم! مجھے تجھے اپنا دوست بناؤں گا...... کیونکہ تجھے کسی انعام کی تمنا نہیں ہے۔ ابراہیم خیام کے بیٹے! بتا کہ کیا تجھے اپنی زندگی اور اپنے علم کے لیے نظام الملک کی حفاظت اور سرپرستی قبول ہے؟''

اس سنجیدہ اور شریف انسان کو عمر نے انتہائی تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اس پر آئینہ دانش کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور پچھلے دنوں وہ فقیروں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا اس کے دل میں یہ تمنا تھی کہ کاش یاسمین کو رکھنے کے لیے اس کے پاس مکان ہوتا۔

عمر کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ جلدی سے بولا ''جی ہاں یقیناً''۔

پھر بتا تجھے کس چیز کی ضرورت ہے''؟

''ایک رصدگاہ بغداد کا بنا ہوا 1-1/2 گز قطر کا اسطرلاب افلاطون کی جدول

''اور کیا بتائے جاؤ''۔

''اگر عالی جاہ مناسب سمجھیں تو چمکدار پیتل کا ایک کرہ جس کے گرد افقی حلقے ہوں ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے لالٹین اور اگر ہو سکے تو پانی کی گھڑی جو دو دو منٹ کا وقت ٹھیک ٹھیک بتا سکے''۔

توتوش تعجب سے آنکھیں پھاڑے ان قیمتی اور کمیاب آلات کی فہرست سن رہا تھا۔لیکن نظام الملک نے اسے ان چیزوں کی فہرست بنانے کا اشارہ کیا۔

پھر نظام الملک نے مسکرا کر پوچھا''اور یہ رصدگاہ کہاں ہو گی؟

کیا کسی اونچی چھت کے اوپر؟''

عمر نے جلدی جلدی سانس لیے بغیر کہا''عالیجاہ کی دانشمندی سے نیشاپور جنگ کے خطرے سے محفوظ ہو گیا ہے اور اس کی سڑکوں کے کنارے پاسبانی کے پرانے مینار ویران پڑے ہیں۔قبرستان اور دربار کے قریب شہر پناہ سے آگے ایسا ہی ایک منارہ ہے اور میں نے اکثر اس منارے سے رات کے وقت ستاروں کا مطالعہ کیا ہے۔کیا یہ منارہ مجھے مل سکتا ہے۔اور کیا اس کے دروازے پر ایک عمدہ تالا بخارا کے چند اچھے قالین تکیے اور ایک چینی پردہ اور چاندی کی ایک صراحی بھی مجھے مل سکے گی؟

نظام الملک نے متعجب ہو کر کہا واللہ فلکیات کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مجھے اس چیز کا اندازہ نہیں تھا۔پھر بھی ......عمر کی تعریف سے وہ

خوش ہو گیا اور اس کی درخواست کے خلوص سے بھی متاثر تھا...... تجھے یہ سب چیزیں عطا کی جائیں گی مگر ایک شرط پر......"

عمر نے جھک کر نظام الملک کے دبلے ہاتھ اپنے ماتھے پر رگڑے اور نظام الملک نے کہا "اس شرط پر کہ تم کسی شخص سے بھی یہ نہ کہو گے کہ تم نے ملازگرد میں جو پیشن گوئی کی تھی وہ مذاق تھا"

"عالی جاہ! میں ایسا کبھی نہیں کہوں گا"۔

توتوش نے لقمہ دیتے ہوئے کہا "اگر تم کسی سے بھی اس کا ذکر کرو تو یہ کہنا کہ وہ پیشن گوئی ایک وجدان کا نتیجہ تھی"

عمر نے ہنس کر کہا بہتر جیسا آپ کا ارشاد۔ نظام الملک مزاحیہ انداز میں بولا "تجھے چینی پردہ اور چاندی کی صراحی تو یاد رہی لیکن کھانے اور ملازموں کا کوئی خیال نہ آیا لے یہ چاندی کے سکوں کا کیسہ ہے۔ اور توتوش تیرے لیے وہ ملازم تلاش کر دے گا"

یہ واقعہ تھا کہ عمر کو ان چیزوں کی پرواہ نہ تھی۔ اس نے تعجب سے اس خوبصورت کیسے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ آج سے پہلے اس نے اپنی زندگی میں مٹھی بھی روپے نہ دیکھے تھے اور اس وقت اسے عجب اطمینان و مسرت محسوس ہو رہی تھی۔

عمر نے پوچھا منارہ مجھے کب ملے گا؟

نظام الملک نے توتوش کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ بھینچ کر بولا "کل عصر کی نماز کے وقت تک"۔

عمر سوچ رہا تھا کہ یہ اقتدار کا زور جادو رکے کرشمہ دکھا سکتا ہے اس نے خوش ہو کر بلند آواز سے کہا ''خدائے رحیم لائق تحسین ہے'' وہ قالین پر مودبانہ کھڑا تھا جب نظام الملک نے اسے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ تو وہ نقدی کے کیسہ کو بھول کر چلنے لگا۔ تو توش نے آہستہ سے اسے یاد دلایا اور وہ جلدی سے کیسہ لینے واپس آیا تو توش نے اسے آہستہ سے یہ بھی یاد دلایا کہ واپس ہوتے وقت دروازے پر پہنچ کر اسے پھر سلام کرنا ہے۔

جب توتوش اور نظام الملک تنہا رہ گئے تو توش نظام الملک کے قریب جھک کر بولا ''آفتاب عنایات کیا میں نے آپ سے عرض نہیں کیا تھا کہ یہ نوجوان صحیح آلہ کار ثابت ہوگا اور وہ آپ کے قبضے میں آچکا ہے؟ کیا ہمیں تمام نیشاپور میں اس جیسا دوسرا آدمی مل سکتا تھا؟ اس کی عجیب وغریب لیاقت' سچ بولنے کی اس سے بھی زیادہ عجیب عادت ستاروں کے مطالعے کے علاوہ اور تمام باتوں سے بے پروائی اور پھر اس کی وہ ناقابل یقین پیشن گئی کی صحت کیا اس نوجوان کو وہ کام انجام دینے کا اہل نہیں بتاتیں؟ معاذ اللہ اس نے تو استاد علی سے یہ قسم بھی کھائی کہ شاہی منجم کو حقیقت حال کا تعین کرنا چاہیے'' نظام الملک مسکرایا تک نہیں وہ بولا۔ ''کاش میں اس کا راز جان سکتا ...... اور پھر وہ کچھ چھپاتا بھی تو نہیں''۔

نظام الملک کے جاسوسوں کے سربراہ نے جواب دیا'' کچھ نہیں! اور پھر اس کا ہر قول صحیح ثابت ہوتا ہے اور ہر لفظ سچ میرے خدا'' توتوش نے بے پروائی سے اپنی تسبیح گھمائی اور بولا میں اسے حجتہ الحق کہا کروں گا۔ اسے استادوں کی سی عبا پہناؤ

تھوڑا سا پراسرار بنا سکھاؤ اور سب سے زیادہ اسے خاموش رہنا بتاؤ پھر اسے ملک شاہ کے حضور یہ کہہ کر پیش کرو کہ یہ ہے عمر خیام جس نے ملازگرد کی پیشن گوئی کی تی...... خدا کی شان ہے کہ میں نے اسے دنیا میں ڈھونڈ نکالا خدا میرے گناہ معاف کرے یہ بات کتنی مناسب نظر آتی ہے۔

نظام الملک جو کچھ سوچ رہا تھا ''آخر وہ بے لگام بچھیرے کی طرح عمل کر رہا تھا لیکن ایک بر مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ہماری مخالفت کرے گا''۔

''نہیں نہیں وہ لڑکا تو عشق میں مبتلا ہے...... جب اس کی محبوبہ اس کے پہلو میں نہیں ہوتی تو وہ اس کے تصور میں غرق رہتا ہے......''

توتوش بولتے بولتے ایکدم رک گیا کیونکہ نظام الملک نے اس کی گفتگو میں دلچسپی لینی ختم کر دی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسلامی عقائد کا سختی سے پابند تھا۔

نظام الملک نے کہا غالباً اس کی خفیہ طاقت خدا کی دین ہوگی۔ ایسے لوگوں کو یہ جانے بغیر کہ انہیں کس طرح علم ہوا حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے''۔

''درست ہے درست ہے اللہ غیب کا علم رکھتا ہے''۔

''میری سمجھ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا کہ اس کی پیشن گوئی معجزہ تھی''۔

''صحیح ہے بالکل درست ہے۔ توتوش نے فوراً جواب دیا وہ معجزوں پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ اپنے ممتاز عربی کے سامنے اپنے ان خیالات کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ وہ سوچ کر تعجب کر رہا تھا کہ اگر حجۃ الحق یعنی عمر پیشن گوئیاں کرنا سیکھ لے اور اس کی پیشن گوئی درست ثابت ہو تو کیا نتیجہ ہوگا۔ پھر اس نے اپنے دل

میں کہا کہ عمر خود یہ تسلیم کر چکا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا اور اس وقت بوڑھا نظام الملک خود کو یہ باور کرا رہا تھا کہ ایسا ممکن ہے ماشاءاللہ ماشاءاللہ......

''......میرا دماغ خالص ذہنی مسائل کو حل کرنے کے لیے نہیں بنا ہے''۔

تو توش نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ جذامی فقیر کو کسی اور جگہ بھیجے گا اور عمر کے منارے میں ملازم رکھنے کے لیے کسی سمجھدار شوہر اور بیوی کو جو معتبر جاسوس بن سکیں منتخب کرے گا۔

کتب فروشوں کی گلی میں چشمے پر یاسمین پانی کا گھڑا بھرنے کے بہانے آئی ہوئی تھی اور عمر بڑے اشتیاق کے عالم میں آہستہ آہستہ اس کے کان میں کہہ رہا تھا ''جان من بالآخر اور انجام کار میرے پاس تیرے رہنے کے لیے ایک مکان کا بندوبست ہو گیا ہے جس کا تنہا مالک میں ہی ہوں۔ تیرے ہونٹوں کے لیے جو شراب سے زیادہ رسیلے ہیں میرے پاس شرا ناب میں بھیگے ہوئے انگور اور تجھ کھلانے کے لیے ختائیاں موجود ہیں......اور......خدا کا شکر ہے کہ تو میرے پاس ہو گی''

یاسمین نے آہستہ سے جواب دیا لیکن وہ تو ویران جگہ ہے'' اور وہاں کھانا بھی تھوڑا ہے۔ لیکن اس ویرانے میں بھی تو میرے قریب ہو گا تو میں اتنی خوش رہوں گی کہ سلطان بھی اپنے محل میں اتنا خوش نہ رہتا ہو گا''۔

دریا کے ساحل پر قبرستان کے نزدیک منارہ جواب رصدگاہ بن گیا ہے

جہاں تک منارے کا تعلق تھا توتوش نے اپنے وعدے کی پابندی کی۔ دوسرے روز مغرب سے پہلے اس نے عمر کو اس کی نئی رصدگاہ کی کنجیاں دے دیں۔ اور اس کے بعد کئی دن تک بڑھئی اور معمار اس منارے اور اس کی بیرونی دیوار کی مرمت کرنے میں مصروف رہے...... وہ دریا کے کنارے اینٹیں بناتے اور انہیں دھوپ میں سکھاتے تھے۔

عمر کو دلی خوشی ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ جب یاسمین پہلی بار اس سے منارے میں ملنے آئے تو وہاں اور کوئی نہ ہو۔ اس نے مزدوروں کو منارے کی پہلی منزل پر دیواروں پر سفیدی کرنے کا حکم دیا اور اس منزل میں ایک بڑی دری بچھا دی گویا اس کی رصدگاہ میں اس منزل کو ملاقات کے کمرے کی حیثیت حاصل ہوگی۔

دوسری منزل پر اس نے بہترین قالین بچھا دیا۔ اور ایک چینی پردہ جس پر ایک اژدھے کی تصویر بنی تھی دیوار پر ٹانگ دیا۔ اس جگہ اس نے اپنا بستر بچھایا اور ایک کونے میں صندل کی لکڑی کا ایک نقشین صندوق قرینے سے رکھ دیا۔

تیسری منزل کو اس نے خالی رکھا۔ بجز اس کے کہ وہاں کچھ تپائیاں اور چند خانہ دار میزیں مسودے کے لیے ڈال دیں۔ آلات پہنچنے کے بعد عمر کو اس منزل میں اپنا تحقیقی کام شروع کرنا تھا۔ توتوش عمر کے لیے بہت سی کتابیں بھی لایا تھا جو نظام الملک نے تحفتاً بھیجی تھیں لیکن عمر نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ یہ اس کی ضرورت کی کتابیں اور آلات بغداد کے علاوہ اور کہیں سے نہ مل سکیں گے۔

لیک کام کرنے میں عمر کا دل بالکل نہ لگتا۔ نظام الملک نے جو چاندی کے سکوں کا کیسہ اسے دیا تھا وہ اس رقم سے گھنٹوں نیشا پور کے بازار سے چیزیں خریدتا۔ اس نے سفید ریشمی کپڑا خریدا کیونکہ اس نے سوچا کہ جب بالآخر یاسمین اس کی بیوی بن جائے گی تو گھر کے اندر وہ سفید لباس پہنے گی۔ اس کے علاوہ چینی کے مرتبانوں میں بھرے ہوئے مربے خوشبو کے لیے اگر اور اسے جلانے کے لیے پیتل کا عود دان اور یاسمین کے لیے چاندی کے بازو بند بھی خریدے جن پر نہایت حسین نیلے رنگ کی مینا کاری تھی۔

ارے یہ تو جادو ہے جب یہ تحفے عمر نے یاسمین کے سامنے رکھے تو وہ چونک کر بولی۔

عمر نے جواب دیا ''اے دشمن صبر وشکیب تو بھی ساحرہ ہے''۔

یاسمین نے آہستہ سے تالی بجائی اور عمر کا ہاتھ اپنے بازو بند سے لگا دیا۔ وہ دم بخود تھی اس نے فرش پر بچھے ہوئے چوڑے قالین کو بغور دیکھا...... کیونکہ خراسان میں ان چیزوں کا وجود اچنبھے کی بات تھی...... اس وقت بھی جب عمر اس کے نرم بالوں کو اپنے ہاتھ سے اس کی گردن سے ہٹا رہا تھا اور جب اسکی نبض تیزی سے چل رہی تھی یاسمین پردے پر اژدھے کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ یاسمین کو اس قدر خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں فرط خوشی سے آنسو تیر رہے تھے۔

یاسمین نے کہا ''اوپر کی منزل میں تم نے اتنی بہت سی کتابیں کیوں جمع کر رکھی ہیں۔ یہ ساری کتابیں پڑھتے ہو؟ یاسمین جب کبھی عمر کو چھوڑ کر جاتی تو اسے ڈر لگتا تھا

...... خاموشی اور جدائی کا وہ وقفہ اسے بڑا ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا جو عمر سے دوبارہ ملاقات کے درمیان حائل رہے گا۔ یاسمین یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ عمر اس درمیانی عرصے میں کیا کرتا ہے۔

عمر نے بےتوجہی سے جواب دیا ”نہیں بس اک چھوٹی سی نظموں کی کتاب جو ایک ریگستانی باشندے نے لکھی ہے اور میں نے پڑھی ہے“۔

”نظموں کی کتاب؟“ یاسمین نے متعجب ہو کر کہا۔ اس نے وہ منظوم کہانیاں سنی تھیں۔ جن میں شاعروں نے قدیم بادشاہوں کی لڑائیوں اور گھڑ دوڑوں کے قصے بیان کیے تھے۔ اس نے عمر سے پوچھا:

”کیا اس کتاب میں کوئی محبت کا گیت ہے؟“ اس میں تو محبت کا اتنا بھی ذکر نہیں جتنی وہ میرے دل کے ایک گوشے میں موجود ہے۔

عمر نے کہا اور یاسمین کا ٹھوڑی پکڑ کر اس کا سر اٹھایا حتیٰ کہ اس کی نظریں عمر کی نظروں سے چار ہو گئیں۔ اور ہر بار اس طرح نظریں چار کرنے کے بعد یاسمین کو عمر سے مل کر کچھ پریشانی سی ہوتی تھی۔

”چھوڑو بھی مجھے شرم آ رہی ہے“ وہ آہستہ سے بولی

”تو شیریں سے بھی زیادہ حسین ہے“۔

”کیا یہ بات اس کتاب میں لکھی ہے؟“

”واللہ لکھی ہے میرے دل کی کتاب میں لکھی ہے“

”اور میرے دل کی کتاب میں کیا لکھا ہے؟“ یاسمین نے مسکرا کر کہا کہ وہ عمر

کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

تیرے دل کی کتاب میں جفا کاری اور میرے لیے نفرت تیرا دل ایک پتھر ہے جسے عمر کی مصیبتوں کا ذرا بھی احساس نہیں۔

یاسمین سوچ رہی تھی کہ میرا محبوب روحانی طاقت رکھتا ہے۔ یقیناً اسے قدیم علوم کے راز معلوم ہیں۔ اور وہ ان نظموں کو بھی پڑھ سکتا ہے جو قدیم شاعروں نے گائی تھیں۔ چنانچہ اس نے میرے اور صرف میرے لیے اس ویران منارے کو بہشت بنا دیا ہے۔ لیکن جب تک عمر وہ عمر ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے یہ سب باتیں فضول ہیں۔ وہ یہ سوچ کر مسرور ہوئی اور ایک سرد آہ بھر کر قالین پر لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ نیم باز سرمگیں آنکھوں سے عمر کو دیکھ کر بولی ''سچ سچ بتاؤ کیا میں واقعی جفا کار ہوں:'' پھر وہ آہستہ سے بولی ''ہاں بتاؤ کیا میں تم سے نفرت کرتی ہوں؟''

عمر بے قابو ہو گیا وہ یاسمین کے برابر لیٹ گیا۔ مدہوشی کے عالم میں وہ اس سے لپٹ گیا۔ اس کی ان عرب اجداد کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا جنہوں نے صدیوں تک گرم اور ویران ریگستانوں میں زندگی بسر کی تھی اور جو بنجر زمین اور گرگ صفت دشمنوں سے مقابلہ کرتے کرتے انتہائی حساس اور اس کے فولادی عزائم کے مالک بن گئے تھے۔ یاسمین کی محبت کا کا شدید جذبہ اسے دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔

یاسمین کے خیال میں اس محبوب منارے کا کوئی نام ہونا ضروری تھا۔ نیشاپور کے لوگ کہتے تھے کہ سامنے کے قبرستان سے مردے نکل کر اس منارے میں جمع ہو

تے ہیں۔ لیکن اپنے محبوب کے ساتھ یاسمین ان آوارہ روحوں سے ذرا بھی نہیں ڈرتی تھی۔ پھر بھی ایک قدیم روایت کے خیال میں اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ اس منارے کا کچھ نام ضرور ہونا چاہیے اور جب عمر اس کا کوئی نام تجویز کرتا تو وہ ہنس پڑتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ عمر کس وقت مذاق کرتا ہے۔

وہ کہتی "نہیں نہ یہ مسکن رحمت ہے نہ کسی حور کا قصر نگاریں۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ یہ ان میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ یہ......"

"مہبط ملائک؟"

"بالکل نہیں" یاسمین کہتی اگرچہ اسے دل میں یہ یقین تھا کہ وہاں کوئی نیک فرشتہ مقیم ہے جس نے عمر کے اور اس کے دل میں محبت ڈال دی ہے پھر وہ یہ بات کہنے سے ڈرتی تھی یاسمین نے کہا "یہ ستاروں کا گھر ہے...... یقیناً میرے پیارے کیا تم ستاروں کا مطالعہ کر کے لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کی تقدیر میں کیا لکھا ہے؟"

عمر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "میں؟ میں کون ہو؟"

ارے یہ تو شہر کے تمام بازاروں اور حماموں تک میں مشہور ہے کہ...... تم نے ہمارے سلطان ملک شاہ کی تخت نشینی کی پیشن گوئی کی تھی۔ کیا تمہیں خبر نہیں ہے......؟"

یاسمین اس بات پر فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس کا محبوب بادشاہوں تک کی قسمت کا حال بتا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منارے میں بھی اس کا یہی کام ہونا چاہیے۔ یاسمین

کے خیال میں فلکیات کی ابتدا اور امتیاز زائچہ ترتیب دینا ہی تھی۔

عمر نے طوعاً و کرہاً یاسمین سے اس بات کا اقرار کرلیا کہ وہ پیشن گوئی کرنا جانتا ہے۔

یاسمین بولی ”تب تو یہ بات صحیح ہے اور جلد ہی غالباً آئندہ مہینے کے آخر تک تمہیں ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے آلات اور مزید رقم مل جائے گی اور پھر تم میرے باپ کے پاس ایک شہرت یافتہ آدمی کی حیثیت سے میرے مہر کی رقم لے کر پہنچو گے اور پھر ہم دونوں کا عقد ہو جائے گا۔

عمر کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے سارا روپیہ یاسمین کے لیے ضرورت کی چیزیں خریدنے پر صرف کر دیا تھا۔ لیکن وہ چیزیں خریدتے وقت اس کے ذہن میں کسی اور بات کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ عمر نے کہا ”ہاں ہاں بہت جلد...... لیکن میرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی جو تمہارے مہر کے لیے کافی ہو......؟“

یاسمین نے اسے سمجھایا۔ بیوقوف ہو تم اگر تم وزیر اعظم نظام الملک کے نجومی ہو تو میر گھر والے تم سے ادائے مہر پر زیادہ اصرار نہ کریں گے۔ میری خواہش ہے...... میں چاہتی ہوں کہ یہ بات طے ہو جاتی اور تمہارے گھر میں رہتی اور مجھے پھر کبھی باہر نہ جانا پڑتا“ وہ متفکر سی ہو کر بولی ”جب تک ایسا نہ ہو گا میں زندہ نہیں رہ سکتی“۔

عمر بولا ”پھر یہیں ٹھہر جاؤ نا“۔

یاسمین کے ہونٹ کانپنے لگے اس نے جواب دیا ”یہ میں کیسے کرسکتی ہوں۔ شادی کے بغیر جو عورت کسی کے ساتھ چلی جاتی ہے اسے لوگ بھاگی ہوئی عورت

کہتے ہیں۔ اور یہ بری بات ہے میں شاید...... بے انتہا مسرور ہوں اور اب میں مسجد میں اللہ تعالیٰ سے رحم کی التجا کروں گی کیونکہ میں نے اس مسرت کے سوا آج تک کسی اور خوشی کا خیال نہیں کیا''۔

لیکن عمر اس وقت مسجد کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا۔ اسے اس وقت اس سبزہ زار پر جس کی ڈھلان قبرستان میں سرو کے جھنڈ تک پہنچی تھی صبح کے سورج کی کرنیں بہت حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ اور اسے اپنے کمرے کے ہر گوشے سے یاسمین کے معطر جسم کی خوشبو آ رہی تھی...... یاسمین دوسرے روز نہ آئی تو وہ بے چینی دور کرنے کے لیے اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس نے نظم کی کتاب کی وہ رباعیاں پڑھنا شروع کر دیں جو کتاب کے صفحات پر اس طرح منتشر تھیں جیسے سبزے پر پھول بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک خالی صفحہ پر اس نے اپنے کہے ہوئے اشعار لکھے۔ اس نے ایک رباعی کہی۔

در فصل بہار اگر بتے حور سرشت

یک ساغر مے دہد مرا بر لب کشت

ہر چند بہ نزد عام ایں باشد زشت

سگ بہ ز من است (۱) اگر برم نام بہشت

عمر نے سوچا کہ یاسمین یہ رباعی سن کر خوش ہوگی۔ جو صرف اس کے لیے کہی گئی ہے۔ وہ خوشی سے مسکرائے گی اور اس رباعی کو بعد میں پڑھنے کے لیے جب وہ اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے گی تو اس کی آنکھوں میں کتنی چمک پیدا ہوگی۔ پھر

بھی عمر کو احساس تھا کہ یہ رباعی اچھی نہیں ہے۔ اس نے ان اشعار میں محبت کا تو کوئی حسین نغمہ لکھا نہیں ہے محض اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

لیکن یاسمین دوسرے روز بھی نہ آئی اور نہ اس سے اگلے دن۔

عمر گھنٹوں چنار کے درخت کے نیچے چشمے پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ مسجد کے احاطے میں بیٹھ کر ہر اس برقع پوش عورت کو جو وہاں آتی یا باہر جاتی دیکھتا لیکن ان میں اسے یاسمین دکھائی نہ دی۔

سہ پہر کے وقت وہ تیز تیز قدموں سے اپنے منارے میں واپس آ جاتا اور اسے اپنے دل میں یقین ہوتا کہ وہ ضرور وہاں اس کا انتظار کر رہی ہو گی لیکن اسے سب کمرے خالی ملتے۔ پھر وہ سوچتا کہ یاسمین بیمار ہو گئی ہو گی اور غالباً اتنی بیمار ہو گی کہ کوئی پیغام بھی نہ بھیج سکے گی۔ اب عمر کو اس بات پر افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے توتوش کے فراہم کردہ ملازموں کی خدمات کیوں قبول نہ کیں کیونکہ اب اسکی نظر میں کوئی ایسی عورت نہ تھی جسے وہ کتب فروشوں کے مکان پر بھیجے اور یاسمین کی خیریت منگوائے اور اگر وہ کوئی خط دے تو لے آئے۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے عمر بازار سے گزر رہا تھا کہ اسے وہی چیچک رو فقیر ملا جو کتب فروشوں کی گلی میں پھرا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ یہ فقیر اس کی نظر بچا کر جلدی سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔

عمر نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا بتا تو نے کیا دیکھا ہے جو مجھ سے چشمے پر باتیں کیا کرتی تھی؟

فقیر نے اپنی سرخ پپوٹوں والی آنکھوں سے عمر کو بغور دیکھا اور جواب دیا میرے نوجوان آقا اپنے سر کی قسم میں نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ جا چکی ہے''۔

عمر نے لرزتے ہونٹوں سے پوچھا چلی گئی؟ اس نے فقیر نے چہروں کا مطالعہ کرنے میں مہارت تھی۔ دیکھا کہ نگرانی کے صلے میں اس نے جواب تک کمایا ہے اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ کمانے کا موقع ہے۔ اس نے عمر کی آستین پکڑ کر دھیرے سے کہا [شی میں نے سنا ہے...... لیکن میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں اور مجھے پیسوں کی ضرورت ہے......''

خود بخود عمر کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا لیکن اس نے دیکھا کہ جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ بے چین ہو گیا اور فقیر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اس نے سودخور کی دکان کی تلاش میں چل دیا۔ جس سے وہ طالب علمی کے زمانہ میں قرض لیا کرتا تھا۔ یہ سودخور بخارا کا رہنے والا تھا جو اپنی دکان پر سکوں کے انبار لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ جن میں یونانی سکے بغداد کے درہم اور تانبے کی ہر شکل کے پیسے ہوتے تھے اس انبار میں بعض سکے مربع شکل کے بعض سوراخ دار اور کچھ ہاروں کی شکل میں پروئے بھی ہوتے تھے۔

عمر نے سودخور سے کہا ''ناصر بیگ مجھے ایک مہینے کے لیے ایک دینار قرض دے دو''۔

سودخور نے ایک بھاری سی تھیلی ٹٹولتے ہوئے جواب دیا ''ہر ماہ چاندی کا ایک درہم سود لگے گا''۔

جلدی کرو عمر نے دینار لیتے ہوئے کہا اور دینار فقیر کو دے دیا۔ پھر اسے ہجوم سے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ''تجھے کیا معلوم ہوا ہے؟ سچ بولنا اور سچی بات ہی بتانا''۔

''اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے میرا سر قلم ہو جائے۔ چار دن ہوئے انہوں نے تمہاری دلآرام کو گھر سے باہر گھومنے پھرنے کی پاداش میں مارا پیٹا۔ میں نے یہ بات چشمے پر دوسری معمر عورتوں کی زبانی سنی ہے۔ اب اس لڑکی کا چچا گھر کا مالک ہو گیا ہے ہاں شیشے کے مکان کے لیے ایک پتھر ہی کافی ہوتا ہے۔ اس کا چچا بہت ناراض تھا۔ پھر دوسرے روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ابوزید کپڑے کے تاجر کی طرف سے اس لڑکی کا دوسرا پیام آیا۔ اور چچا نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا''۔

عمر نے کوئی جواب نہ دیا اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

فقیر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا بخدا انہوں نے ابوزید کو اپنے گھر بلوایا قاضی اور گواہوں کو طلب کیا او میں نے اپنی آنکھوں سے ان سب کو آتے دیکھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آئے اور انہوں نے پلاؤ زردہ کھایا تھوڑا سا کھانا انہوں نے مجھے بھی دیا''۔

''اور وہ......اس کا کیا ہوا؟''

فقیر نے جواب دیا ''میں نے ایک فراش کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ شادی سے پہلے رات بھر روتی رہی اور دو آدمی اسے پکڑ کر لائے تھے۔ شاید وہ بھاگ گئی ہوگی۔ شاید وہ خوف زدہ تھی۔ کم سن لڑکیاں ضدی اور جاہل ہوتی ہیں۔ لیکن ابوزید نے معقول مہر

دیا ہے کیونکہ اسنے یاسمین کے حسن کی شہرت سنی تھی۔ ابوزید تاجر ہے اور اس کے قافلے میں بہت سے خیمے ہیں......''

فقیر عمر کو تعجب کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ عمر گھوم کر ایک طرف لوگوں کو اس طرح ہٹا ہٹا کر آگے بڑھ رہا تھا جیسے وہ اندھا ہو گیا ہو۔ چیچک زدہ فقیر نے دینار ہاتھ میں لے کر دیکھا اور پھر اسے پتھر کی طرح بجایا۔ دینا کھرا تھا۔ فقیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اسے اپنے چاندی کے سکوں کے ساتھ رکھ لیا جو اس نے آج سے تین روز قبل یاسمین کے چچا سے یہ اطلاع دینے کے سلسلے میں حاصل کیے تھے کہ یاسمین قبرستان کے قریب والے منارے میں کسی اجنبی نوجوان سے ملنے جایا کرتی ہے۔

اس وقت فقیر کے دل میں یہ خیال تھا کہ وہ عمر یا ابوزید کے مقابلے میں یاسمین کے چچا سے زیادہ رقم وصول کر سکتا ہے۔ فقیر سے یہ اطلاع پانے کے بعد یاسمین کا چچا اس پر کڑی نگرانی رکھنے لگا۔ اور اس نے جلد ہی کپڑے کے تاجر ابوزید کو بلوا بھیجا۔

لیکن اب عمر نے فقیر کو تعجب انگیز حد تک مالا مال کر دیا تھا اور سونے کا دینار دیا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا سود خور کی دکان پر گیا اور اس سے بولا ''ارے تو نے یہ کیا حماقت کی کہ اس لاوارث طالب علم کو جو سڑکوں پر آوارہ پھرا کرتا ہے قرض دے دیا''۔

بخارا کے اس سود خور نے جلدی سے اپنے سکوں کے ڈھیر کے گرد اپنے ہاتھوں سے حلقہ بنا لیا اور اپنی جیب سے چاقو نکالتے ہوئے بولا ''چوروں کے استاد ذرا بچ کر کھڑا ہو۔ تیرے چرانے کے لیے یہاں کوئی سکہ نہیں ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ نظام الملک نے اسی طالب علم کو اپنی عنایات سے نوازا ہے۔

"ارے خیام کو؟" فقیر نے ایسے مغموم لہجے میں کہا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ کاش وہ پہلے سے یہ جانتا تو محض اس کا راز افشا کر دینے کی دھمکی ہی دے کر اس سے دگنی رقم وصول کر لیتا۔ کاش اسے یہ علم ہوتا!

اس دن عمر کو سوائے اپنے دل کے نالوں کے نہ کوئی بات سنائی دیتی تھی اور نہ کوئی چیز دکھائی دیتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ کتب فروشوں کی گلی اور چشمے پر گیا اور یاسمین کے چچا سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ ایک اجنبی شخص گھر میں سے نکلا اور آتے ہی اس پر بگڑنے لگا۔ عمر نے دیکھا کہ یاسمین کا بوڑھا باپ جو بہت دبلا اور زرد ہو چکا تھا دکان کے اندر کتابوں کے انبار میں چھپا بیٹھا ہے۔

یاسمین کے چچا نے اس سے کہا "کیا تو پاگل ہے کہ کھلے بندوں مستورات کا ذکر کر رہا ہے؟ کیا اس گھر کی خواتین جانور ہیں جو تو اس طرح ان کا نام لے رہا ہے؟"

ایک عورت پردے کے پیچھے سے چیخی "اس سے کہو ذرا ہوش میں آئے۔ اس چور کو جسے ذرا بھی شرم نہیں خدا کی قسم تعجب ہوتا ہے کبھی کسی چور کو یہ جرأت ہوئی ہے کہ جہاں سے اس نے چوری کی ہو وہاں واپس آ جائے اور شور و واویلا مچائے؟ اس کی جوتوں سے خبر لو اور باندھ کو خوب مارو۔ ارے گیدی جہنمی باپ کی اولاد!"

لیکن گھر کے مرد اتنے پاگل نہ تھے کہ وہ خیام پر جنون و دیوانگی کے اس عالم میں ہاتھ ڈالتے۔ ادھر عورتیں بے تحاشا چیختی رہیں یہاں تک کہ عمر ان کی ڈانٹ پھٹکار سے عاجز آ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ گھنٹے کے بعد عمر نے ایک جوہری کی دکان پر توتوش کو دیکھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا ایک نیلم دیکھ رہا تھا۔ عمر نے بے ربط جملوں میں اسے

اپنا پورا قصہ سنایا اور جاسوسوں کا وہ سرغنہ غور سے اس کی کہانی سنتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ جیسے اس کی توجہ نیلم کی طرف ہے۔

توتوش اس کا قصہ سن رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ لڑکی کوئی طوائف یا کنیز ہوتی تو وہ اپنے اثر سے کام لے کر اس کا پتہ چلاتا اور اسے عمر کے حوالے کر دیتا۔

لیکن وہ ایک مسلمان کے حرم میں داخل ہو چکی تھی اور اپنے شوہر کی ملکیت تھی۔

توتوش جانتا تھا کہ نظام الملک مستورات کے معاملے میں مداخلت کرنا پسند نہ کرے گا...... کیونکہ اسلامی قانون کے مطابق خواتین کو پردے میں رہنا چاہیے اور اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے۔اس کے علاوہ عمر پر یاسمین کی محبت کا جنون سوار تھا۔اور توتوش یہ نہیں چاہتا تھا کہ جس شخص کی وہ سرپرستی کر رہا ہے اس پر ایک عورت کا اتنا اثر غالب ہو۔اگر بہت سی عورتوں کا اثر ہو تو بہتر ہو گا کیونکہ وہ خبر رسانی کرنے اور ترغیب دلانے کا بھی عمدہ ذریعہ ہو سکتی ہیں۔لیکن ایک عورت کا اثر......اور خاص طور سے وہ بھی یاسمین جیسی نوعمر لڑکی کا جسے وہ محبت سے سرشار سمجھتا تھا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔چنانچہ توتوش نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا کہ وہ مداخلت نہیں کرے گا اور اس نے عمر کی باتوں پر محض رنج و ہمدردی کا اظہار کرنے پر اکتفا کی......

توتوش نے مغموم لہجے میں کہا ''مجھے افسوس ہے کہ ایسا واقع ہوا۔کاش تم میرے پاس پہلے چلے آتے۔کیونکہ گواہوں کی موجودگی نکاح کے بعد عورت آہنی زنجیر میں جکڑی جاتی ہے۔اس زنجیر کو کون توڑ سکتا ہے؟ اچھا ہم مل کر اس معاملے پر

غور کریں گے اور میں یہ بندوبست کروں گا کہ.....''

''لیکن آپ اس کا پتہ لگا سکتے ہیں؟''یقیناً تم اس کا پتہ لگا سکتے ہو میں آئندہ ماہ اس سے نکاح کا پیام بھیج سکتا تھا..... اسے ڈر تھا'' کہ توتوش نے ایک سرد آہ بھر کر اور سر کے اشارے سے پھر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا''یقین نہیں آتا لیکن قسمت کے آگے کس کی پیش جا سکتی ہے''۔

''تم پتہ لگاؤ کہ وہ کہاں ہے اگر مجھے معلوم ہو جائے تو!''

یقیناً فوراً پتہ لگا لوں گا اور آج رات ہی کو میں اپنے آدمی شہر کی مختلف سراؤں میں بھیجتا ہوں۔ کل صبح کو وہ تمہیں اس کا پتہ بتا دیں گے۔ اس وقت تک تم میرے پاس ٹھہرو۔۔

دوسرے روز صبح کو توتوش کے جاسوس یہ خبر لے کر آئے کہ مشہد کا کپڑے والا ابوزید نہ تو قافلے کے ساتھ ہے اور نہ وہ نیشاپور میں موجود ہے بلکہ اپنی نئی بیوی اور چند غلاموں کے ہمراہ وہ اس شہر سے چلا گیا ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ شمال' جنوب' مشرق مغرب میں سے کون سی سمت روانہ ہوا ہے۔ شہر سے بہت سی سڑکیں جاتی ہیں۔ اور ہزاروں تاجر ہیں لیکن یقیناً ابوزید جلد ہی واپس آ جائے گا۔ اور اس دوران میں وہ شہر کے ہر دروازے پر نگرانی رکھیں گے۔

توتوش کو توقع تھی کہ عمر اس خبر سے مطمئن ہو جائے گا۔ لیکن وہ غلطی پر تھا۔ خیام اپنی پرانی بھورے رنگ کی عبا پہن کر خود بازار گیا۔ وہ شہر کی ہر سرائے میں اونٹ والوں سے ابوزید کا پتہ پوچھتا پھرا اور پھر وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ توتوش کے

جاسوس بھی اس کا پتہ نہ لگا سکے حالانکہ انہوں نے ابوزید کے مقابلہ میں اسے زیادہ تن دہی سے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

عمر اونٹ والوں کے ہمراہ آوارہ پھرتا رہا۔ وہ راتیں بے چینی میں گزارتا اور صبح تڑکے ہی اٹھ بیٹھتا۔ جب اونٹوں کو بٹھا کر ان پر سامان لادا جاتا تو اونٹ بلبلاتے تو عمر خیام ہر سرائے میں تاجروں کو دیکھتا پھرتا۔ وہ ان میں سے ہر تاجر سے مشہد کے تاجر ابوزید کا پتا پوچھتا...... قافلے کی تیاری کے وقت جو چیخ و پکار مچتی اور اس وقت سرائے میں جو گرد و غبار اڑتا عمر اس عالم میں بھی تاجروں سے جلد جلد سوالات کرتا۔

عمر کے دماغ پر ایک جنون طاری تھا وہ مشہد کے ہر مسافر اور سرائے میں پہنچتا یہاں تک کہ امام رضا کے روضے پر بھی جہاں زائرین جمع ہوتے ہیں وہ ابوزید کو تلاش کرنے گیا۔

وہ عرصے تک سبزوار کے ستون کے پاس بوستان کی کاروان سرائے میں مقیم رہا۔ ایک مرتبہ وہ کسی ابوزید کے پیچھے شمال میں پہاڑوں تک گیا جہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ یہ شخص بخارا کا قالین فروش ہے"۔

عمر کو جو کرب اور بے چینی تھی وہ اسے سونے نہ دیتی تھی۔ ہاں جب سے وہ لدے ہوئے اونٹوں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا تو اسے سکون محسوس ہوتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یاسمین تکلیف میں ہوگی اور غالباً بخار کے پسینے سے اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں بٹ گئی ہوں گی۔ یاسمین کو ایک کنیز کی طرح فروخت کر دیا گیا تھا اور ہو

کنیز ہی کی طرح نیشاپور سے باہر لے جائی گئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اسے مارا تھا۔ اسے برا بھلا کہا تھا اور اب وہ انہی سڑکوں میں سے کسی سڑک پر کہیں نہ کہیں رواں دواں قافلے میں موجود ہوگی۔

ہفتے گزر گئے موسم بہار میں جو پانی میدانوں میں نظر آتا تھا وہ دھوپ سے خشک ہو چلا تھا۔ آفتاب کی تمازت سے نرم مٹی لوہے کی طرح سخت ہوگئی تھی۔ اور چشمے کے کنارے کے سوا ہر جگہ ہریالی سوکھتی جا رہی تھی۔

ذہنی کرب کے عالم میں عمر کو یہ خیال گزرا کہ اس چشمے کے کنارے سبزہ زار اور پھولوں کے ان پودوں پر نہ چلنا چاہیے جو سوکھنے سے بچ گئے ہیں۔ اس کے ذہن میں سوسن اور چنبیلی کے ان پھولوں کا یاسمین اور دریائے دجلہ کے ساحلی سبزہ زار سے گہرا تعلق تھا اور ایک درویز نے اسے دیکھ کر کہا "یقیناً اس شخص پر اللہ نے عذاب نازل کیا ہے"۔

مسلسل سفر اور گرمی بڑھ جانے سے عمر کو بخار آ گیا اور وہ دو ہفتے تک بیمار پڑا رہا۔ جب بخار اترا تو وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ سفر کرنے کے قابل نہ رہا تھا ایک نیک دل مشہدی مسافر نے اسے اپنے گدھے پر بٹھا کر وطن پہنچانے کی پیش کش کی۔

بخار اترنے کے بعد عمر کے حواس درست ہو گئے تھے اور وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس طرح اس کا جگہ جگہ مارے مارے پھرنا بے سود ہے وہ محسوس کر رہا تھا کہ یوں آوارہ پھر کر وہ اس درد سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے جو اسکے سینے میں جاگزیں ہو چکا ہے

اور اب تک یقیناً یامین کی جانب سے یا تو کوئی پیام منارے پر پہنچ چکا ہوگا یا تو تو ش کے جاسوسوں نے اس کا کچھ پتہ لگا لیا ہوگا۔ وہاں سے اس طرح چلے آنا بے وقوفی تھی لیکن سردست وہ اتنا بیمار تھا کہ پیدل چل نہیں سکتا تھا۔

ایک روز سہ پہر کو جب قافلہ قبرستان والی سڑک پر پہنچ گیا تو عمر گدھے سے اتر کر اس کے مشہدی مالک سے رخصت ہوا۔ وہ اپنے منارے جانے والی پہاڑی پر چڑھا۔ اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ منارے میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ چاردیواری کے اندر نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ اور غلام اس باغیچے کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں جو حال ہی میں لگایا گیا تھا۔ منارے کی فصیل کے اوپر پیتل کے آلات دھوپ میں چمک رہے تھے۔

رصدگاہ کے قریب پہاڑی پر ایک لکڑی کا مینار بنا دیا گیا تھا۔ عمر اس لکڑی کو جس کی بنیاد کے قریب مٹی کے اوپر دائرہ کھینچا گیا تھا دیکھنے کے لیے رکا۔ اتنے میں ایک باریش غال آیا اور اس کے قریب ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا ''حضور آپ کا آنا مبارک ہو۔ ہم نے اس جگہ کو ٹھیک کرنے میں سخت محنت کی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھ کر خوش ہوئے؟''

لیکن غلام کو اس دبلے پتلے اور گرد آلود جوان کو دیکھ کر جو پھٹی ہوئی عبا پہنے تھا انتہائی تعجب ہو رہا تھا۔

عمر نے جواب دیا ''ہاں'' پھر وہ اپنے کمرے میں گیا۔ جہاں ہر چیز جوں کی توں پڑی تھی۔ پردے پر اژدھے کی تصویر اب بھی موجود تھی۔ بچھونے کے اوپر تکیے صفائی

سے لگے ہوئے تھے۔ اس نے غلام سے پوچھا ''بتاؤ کسی نے میرے لیے کوئی پیغام یا نشانی تو نہیں بھیجی؟''

غلام نے مسکرا کر سر ہلایا ''حضور! روزانہ آقائے توتوش کی جانب سے پیام آتا تھا اور وہ یہ دریافت کرتے تھے کہ آپ واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔ ابھی میں نے لڑکے کو یہ پیام دے کر نیشا پور بھیجا ہے کہ آپ تشریف لے آئے ہیں''۔

''اس کے علاوہ اور کوئی قاصد تو میرے پاس نہیں آیا؟ کوئی خط بھی نہیں؟'' عمر نے غلام سے پوچھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یاسمین لکھنا تو نہیں جانتی لیکن پھر بھی ممکن ہے اس نے بازار میں کسی خط لکھنے والے منشی سے کچھ لکھوا کر بھیجا ہو۔

غلام نے جواب دیا ''جی نہیں! نہ کوئی پیام نہ کوئی خط'' عمر دیوان خانے میں کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور غلام چاندی کے جگ میں پانی لا کر اس کے پاؤں دھونے لگا۔ اتنے میں ایک سفید ریش شخص پرتپاک انداز میں سلام کر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے عمر سے کہا کہ میرا نام میمون ابن نجیب الواسطی ہے اور میں نظامیہ بغداد کا فارغ التحصیل ریاضی داں ہوں۔ نظامیہ بغداد وہ تحقیقی ادارہ تھا جسے نظام الملک نے اپنے اہتمام سے قائم کیا تھا۔ میمون بڑی متعجب نظروں سے عمر کو دیکھتا رہا جو خاموش بیٹھا تھا۔ میمون نے خشک لہجے میں اسے اپنی آمد کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ساتھ افلاطون کا ستاروں کا ترمیم شدہ نقشہ اور نظام الملک کے حکم سے پیتل کا وہ گلوب لایا ہوں جو خود بوعلی سینا استعمال کرتا تھا''۔

''اچھا'' عمر نے بے توجہی سے پوچھا۔ تپتے میدانوں اور دھوپ اور تپش کے

بعد اسے یہاں پہنچ کر اس خشک آواز کے علاوہ سکون اور خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

خواجہ میمون بڑبڑایا پھر اس تیزی لیں جیسے کوئی سارس کسی بے خبر کچھوے پر جھپٹتا ہے وہاں سے واپس ہو گیا۔ جب خاصی رات ہو گئی تو عمر مینار کی چوٹی پر گیا۔ اس وقت بوڑھے ریاضی داں سے بھی رہا نہ گیا اور وہ بھی اس جگہ جہاں اس کا خزانہ جمع تھا پہنچ گیا۔ اس انداز سے جیسے اسے خاموش عمر کی کوئی پرواہ نہ تھی میمون نے گلوب کے پائدان پر لگے ہوئے چار چراغوں کو روشن کیا اور پھر گلوب پر چھتریاں اس طرح لگائیں کہ چراغوں کی صاف اور خوشگوار روشنی اس بڑے گلوب کے نصب بالائی حصے پر پڑنے لگی۔ عمر چلتے چلتے رک گیا اور اس کی نگاہیں چمکتے ہوئے پیتل پر ٹھہر گئیں اور وہ اس کے قریب آ کر اسے دیکھنے لگا۔ ستاروں کے نشان کے گرد چھوٹے چھوٹے راستوں کی بے شمار لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ لکیریں بہت مہین تھیں اور صرف کہیں کہیں جہاں ستاروں کا گچھا بنا ہوا تھا ایک آدھ لفظ ان باریک لکیروں پر کندہ تھا۔ اس گلوب پر بہت سے لوگوں نے محنت کی ہو گی کیوں کہ جہاں جہاں اس پر نئی لکیریں پرانے خطوط کاٹتی تھیں وہ حصے صاف طور پر نمایاں تھے۔ عمر نے اس جگہ کو دیکھا جہاں دم دار ستارے کا آخری حصہ قطب ستارے سے علیحدہ ہوتا تھا...... اس نے افق کا دائیں سے بائیں کو جائزہ لے کر گلوب پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ اسے گھمایا یہاں تک کہ اس کی حیثیت وہ ہو گئی جو اس جگہ جہاں وہ کھڑا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے افق کے حلقے کو ٹٹولنے لگا۔

''یہ اس طرح لگایا جاتا ہے اور اسے اس طریقے سے بند کیا جاتا ہے'' اسحاق

نے اپنی خشک آواز میں کہا۔

عمر نے جواب دیا ''ہاں ہاں بالآخر اس کے پاس وہ گراں قدر خزانہ

دوسرے دن جب توتوش اس سے ملنے آیا تو وہ اسے دیکھ کر بولا ''ارے خدا کی قسم! تم تو ایسے سنیاسی معلوم ہو رہے ہو جو جنگل اور بیابانوں سے نکل کر آیا ہو۔ ہم نے تمہیں کہاں کہاں تلاش کیا مگر تم نظام الملک کو کیا جواب دو گے اور اس کے غصے کو کس طرح ٹھنڈا کرو گے خیر کوئی بات نہیں...... اب جبکہ تم یہاں پہنچ گئے ہو تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔''

عمر نے پوچھا ''میری غیر موجودگی میں یاسمین کی طرف سے کوئی پیام یا کوئی نشانی تو نہیں پہنچی؟''

جاسوسوں کے سرغنے نے ہمدردی سے آنکھیں جھپکا کر جواب دیا ''اچھا اس لڑکی کی طرف سے؟ نہیں میرے خیال میں کوئی نہیں۔ میں نے تو کچھ سنا ہی نہیں''۔

''لیکن تمہارے آدمیوں کو تو اس کی خبر ملی ہو گی؟''

توتوش نے اپنے ہونٹ کھینچ لیے اور اظہار افسوس کرتے ہوئے سر جھکا کر انکار کیا۔ وہ بولا ''میرے آدمیوں نے باز کی طرح جستجو کی لیکن کچھ پتہ نہیں چلا کیا ہوا۔ بازار میں اور لڑکیاں ملتی ہیں نوخیز ایرانی بلبلیں اور سمرقند کے رستے آنے والی چینی کنیزیں جو بہت ہی سلیقہ مند اور نہایت ہوشیار ہوتی ہیں۔ لیکن نظام الملک ناراض ہے ہمیں اسے دکھانے کے لیے کچھ کام کرنا چاہیے...... اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ منصوبہ ہونا چاہیے......''۔

عمر خاموش تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں منصوبے کا خیال تک نہ تھا۔

''نوجوان ذرا سوچو اس منصوبے کو یاد کرو جو تم ایوان دانش سے لے کر چلے تھے اور اگر تمھیں سرپرست مل جاتا تو اس وقت تمہارے ذہن میں کیا کام کرنے کا خیال تھا؟''

میں ایک نئی جنتری بنانا چاہتا ہوں۔

کیا؟

وقت ناپنے کا صحیح پیمانہ جس میں گھنٹے ضائع نہ ہوں۔

توتوش نے عمر کو تشویش ناک نظر سے دیکھا۔ غلاموں نے اسے اطلاع دی تھی کہ ہمارے نئے آقا کی حرکات وسکنات بہت عجیب ہیں اور اس نے مسکرا کر عمر سے کہا ''ہماری حالت پر رحم کرو۔ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے چاند بنایا ہے جب وہ پہلی بار نمودار ہوتا ہے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ اب نیا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ یقیناً کوئی فانی بندہ ایسا آلہ نہیں بنا سکتا جو ہمیں چاند سے زیادہ صحیح وقت بتا سکے۔ ہاں تو پھر'' عمر نے غصے سے بے چین ہو کر کہا ''مصریوں نے بھی ایسا آلہ بنایا ہے۔ عیسائیوں نے بھی بنایا ہے لیکن تم نے جو یہاں یہ لکڑی کا چھوٹا سا تختہ لگایا ہے یہ تو بچوں کے کھیلنے کے کام آ سکتا ہے۔ ذرا آ کر دیکھو تو'' پیچھے پیچھے خواجہ میمون اور آگے وہ دونوں لکڑی کے ڈنڈے کو دیکھنے گئے۔ توتوش نے شاہی نجاروں کی مدد سے اس ڈنڈے کو اپنی نگرانی اور محنت سے وہاں لگوایا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ڈنڈا نیچے لگی ہوئی چکنی مٹی پر بہت صاف اور حسین سایہ ڈالتا تھا۔ لیکن عمر نے اسے اپنے کندھے کے ایک جھٹکے

سے اکھاڑ کر پہاڑی کے نیچے پھینک دیا۔ عمر کیدل میں جو ریگستان کی سڑکیں طے کر کے آیا تھا اس وقت غصے سے آگ لگی ہوئی تھی وہ چیخ کر بولا "یہ ڈنڈا تو ہوا کے جھونکوں سے چلتا ہے اور دھوپ سے خراب ہو جاتا ہے۔ کیا ہم بچوں کی طرح گھروندے بنا رہے ہیں ہمیں تو وہ چیز چاہیے جو کافروں کے پاس تھی۔ آدمی کے قد سے پانچ گنا اونچا سنگ مرمر کا مینار جس کا ہر پہلو اور جس کی چوٹی ناخن کے برابر باریک ہو پھر اس کی بنیادیں سنگ مرمر کا پختہ فرش ہو۔ جس پر اس کے سائے سے مثلث کی شکل بنے۔ فرش کے پتھر چکنے اور صاف ہوں اور تانبے کے ٹانکوں سے جڑے ہوں۔ اور ان کی سطح پانی کی طرح ہموار ہو۔ اچھا تم کاریگروں کو میرے پاس بھیج دو۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ کیا کام کرنا ہے"۔

توتوش نے آہستہ سے جواب دیا "پہلے مجھے نظام الملک کی منظوری لینا چاہیے۔ ایسا مینار بنانا تو میرے خیال میں کافروں کا مندر بنانا ہوا......"

"سورج کے سائے میں روزانہ بال برابر فرق ہوتا ہے اس کو ناپنے کا واحد طریقہ یہی ہے"۔

"بال برابر" توتوش نے اپنی پگڑی سنبھالتے ہوئے کہا اور خواجہ میمون کو ایک رف لے جا کر آہستہ سے اس کے کان میں کہنے لگا "تمہارا کیا خیال ہے کہیں عمر کا دماغی توازن تو نہیں بگڑ گیا؟"

بوڑھے میمون نے جواب دیا "وہ اپنے ہوش و حواس میں ہو یا نہ ہو اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ حساب لگانے کے معاملے میں احمق نہیں

ہے''۔ خواجہ میمون نے یہ الفاظ اس طرح مسکرا کر کہے کہ اس کی داڑھی کے بال ہلنے لگے۔ پھر وہ بولا۔ ''جس قسم کا ستون عمر چاہتا ہے وہ یقیناً صحیح ہوگا۔ اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر وہ صحت کے ساتھ بنایا گیا تو اتنا ہی درست اور صحیح ہوگا جتنا وہ سامنے رکھا ہوا ابو علی سینا کا عظیم گلوب ہے......''

توتوش نے یہ قصہ۔ جو اس کی سمجھ سے باہر تھا نظام الملک کو سنایا عمر کے غائب ہو جانے سے خود نظام الملک کے منصوبوں میں خلل پڑ گیا تھا وہ توتوش کے بیان کو بے توجہی سے سنتا رہا پھر توتوش نے اسے بتایا کہ وقت کو ناپنے کے متعلق عمر کی تجویز خواجہ میمون نے بھی منظور کیا ہے۔

وزیر اعظم نظام الملک نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا ''وقت کا گوشوارہ بنانا تو ہماری روایات کے منافی ہے......اور علماء اس کی مخالفت کریں گے۔ عیسائیوں کے پاس رومی عہد سے ایک جنتری آ رہی ہے ساسانیوں کا بھی سال مقرر ہے اور ہم ایرانیوں کے پاس بھی فتح اسلام سے قبل یزدگردی سنہ موجود تھا۔ میرا خیال......میرا خیال ہے کہ گوشوارے کا بنانا خطرناک کام ہوگا''۔

توتوش نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''پہلے تو عمر مجھ سے یہ کہتا ہے کہ وقت صرف ایک ہوتا ہے اور اب نظام الملک یہ کہہ رہے ہیں کہ وقت چار مختلف قسم کا ہے خدا میری عقل پر رحم کرے۔

نظام الملک نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''چار جنتریاں ہیں اور ملک شاہ اب بھی عمر کو طلب کر رہا ہے''۔

''اور عمر کو دن میں ایک ایک منٹ کا وقت ناپنے کے لیے پانی کے گھڑیال کی ضرورت ہے معلوم نہیں وہ اس کا بنائے گا کیا...... کیا وہ سوتے جاگتے ہر لمحے اسے تکا کرے گا۔

اس کی مدد سے وہ بہار اور خزاں کے موسم میں اس دن کا تعین کرے گا جب شب و روز کے درمیان ایک لمحے کا بھی فرق نہیں رہتا۔ بڑے ستون کے ذریعے وہ اس لمحے کا اندازہ بھی کر سکے گا جب دوپہر کے وقت سورج کا عکس سردیوں میں سب سے لمبا اور گرمیوں میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اور ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کر کے وہ ان دونوں کے حسابات میں ترمیم کر سکے گا۔ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ عمر کیا کرے گا''۔

توتوش نے منہ ہی منہ میں کہا انشاءاللہ۔

خدا نے چاہا تو ہم ملک شاہ کی تخت نشینی کی یاد میں نئی جنتری پیش کر دیں گے''۔

نظام الملک کو فوراً احساس ہوا کہ یہ منصوبہ بہت عمدہ رہے گا۔ سلطان اس بات میں خوش ہوگا کہ صرف اس کے لیے ایک نئی جنتری بنائی گئی ہے۔ اور عمر اور وہ دو باتوں پر خوش ہر کر ممکن ہے میری امید کے مطابق خیمہ دوز کے اس لڑکے کو شاہی منجم کا خطاب دے دے۔

وہ بولا ''میں اس کے لیے پانی کے نئے گھڑیال کا انتظام کروں گا۔ لیکن وہ کس وجہ سے یوں آوارہ پھرتا رہا''؟

توتوش آنکھ مار کر مسکرایا اور کہنے لگا ''خدا ہی بہتر جانتا ہے آپ کے غلام کو تو اس

کا کچھ علم نہیں ہے“

”تمہارا فرض ہے کہ اب تم اسے آوارہ نہ پھرنے دو کیونکہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔“

نظام الملک سے رخصت ہونے کے بعد توتوش جلدی جلدی اپنے گھر پہنچا۔ اکثر وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر ایک پرانے کارخانے کے گوشے میں جہاں سے بازار اور مسجد کا صحن نظر آتا تھا چھپ جایا کرتا تھا۔ اس جگہ وہ اپنی ایسی چیزیں رکھتا تھا جو کسی کو دکھانی نہیں چاہتا تھا۔ اس خفیہ جگہ پر ایک گونگے مثری غلام پہرا رہتا تھا۔ جو اپنے آپ کو ان کمروں کا مالک بتاتا تھا۔ یہاں ایک صندوق کے اندر جس میں تین تین تالے پڑے ہوئے تھے توتوش نے چاندی کا ایک نازک بازو بند نکالا جس میں آسمانی رنگ کے حسین موتی جڑے ہوئے تھے۔

یہ بازو مرحوم سلطان کا محبوب اور کوزہ پشت مسخرا منارے میں لایا تھا۔ کوزہ پشت مسخرے نے کہا تھا کہ یہ تحفہ یاسمین نام کی ایک عورت نے بھیجا ہے اور یہ کہا یا ہیکہ میرا دل درد سے بے چین ہے اور مجھے حیفہ جانے والی سڑک پر لے جایا جا رہا ہے۔

توتوش نے اپنے دل میں کہا ”عمر صرف اس معاملے میں سخت ہے اور کبھی ہو ہیں اسے مغربی علاقے میں حفیہ تک نہ جانے دوں گا۔ کیونکہ مجھے نظام الملک کے غضب کا نشانہ بنا پڑے گا“۔ توتوش نے فیصلہ کیا کہ میں چاندی کے اس تحفے سے نجات حاصل کر لوں اور اس تحفے کو اپنی جیب میں رکھ کر توتوش نے صندوق بند کیا اور وہ باہر نکل آیا۔ اور ایک چشمے پر پہنچا جہاں کمسن بچوں کی ایک ٹولی کھیل رہی

تھی۔ توتوش نے جیب سے چاندی کا بازو بند نکال کر اس چشمے میں پھینک دیا۔ جب چاندی کا یہ بازو بند چشمے کی تہہ میں پتھروں سے جاٹکرایا تو اس نے منہ پھیر کر دیکھا تک نہیں۔ پہلے وہاں خاموشی تھی اور پھر اسے ہلکی ہلکی چیخ و پکار اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے جلد جلد چلنے کی آوازیں سنائی دیں تو توتوش نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو چشمے پر کوئی نہ تھا اور چاندی کا بازو بند غائب ہو چکا تھا۔

توتوش مسکرایا اور بولا "پتھر کو پتھروں اور ریت کے ذرے کو ریگستان میں چھپانا چاہیے"

نظام الملک کی رصدگاہ کے معاملات سے مطمئن تھا۔ موسم گرما ختم ہونے سے قبل رصدگاہ میں پانی کا گھڑیال نصب ہو چکا تھا۔ اس گھڑیال میں ایک چھوٹا سا پہیہ تھا جو ایک گھنٹے میں ساٹھ بار گھومتا تھا اور ایک بڑا پہیہ تھا جو ایک گھنٹے میں صرف بارہ چکر لگاتا تھا۔ ایک نشان لگے ہوئے پیمانے پر نیزے کی سی نوک رکھنے والی چاندی کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ جو ایک دوپہر سے دوسری پہر تک پورے پیمانے پر پھر جاتی تھی اور دوسرے روز پھر واپس چلنے لگتی تھی۔ کم از کم توتوش کے نزدیک یہ گھڑی تعجب انگیز حد تک صحیح تھی۔ لیکن خواجہ میمون نے اسے بتایا کہ تقریباً ایک سال کے عرصے میں وہ اندازہ لگا سکیں گے کہ صحیح وقت اور اس گھڑی کے درمیان کتنا فرق ہے۔

توتوش نے جواب دیا کہ اس گھڑیال میں اس چھوٹے سے سوار کی کمی ہے جو نیزے کے دنوں کا نشان لگائے جیسا کہ محل میں ہوتا ہے۔ اس پر میمون نے توتوش پر بس ایک ترحم خیز نگاہ ڈالی۔ وہ خاموش رہا گویا اس کا مطلب ہوا کہ ریاضی کے ماہروں کو

دنوں کی یاد دلانے کے لیے فرضی قصوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بالآخر تمام آلات اپنی اپنی جگہ لگا دیے گئے اور مشاہدہ کرنے کے لیے چار اور اشخاص منتخب کیے گئے سنگ مرمر کا نیا ستون تعمیر ہو چکا تھا۔ اور اب میمون بھی یہ کہتا تھا کہ ہم وقت کا نئے سرے سے تعین کرنے کا زبردست پروگرام شروع کرنیوالے ہیں۔ میمون کی رائے تھی کہ یہ کام سات سال میں پورا ہوگا۔ لیکن عمر کے خیال میں وہ چار یا پانچ سال میں ختم ہو سکتا ہے۔

توتوش نے تعجب سے کہا ”بخدا ہم تو چار یا پانچ ہفتوں میں ایک محل تعمیر کر سکتے ہیں“

یہ سن کر عمر کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ بولا ”جی ہاں! اور جب آپ کا محل ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن جائے گا اور اس میں چھپکلیاں رہنے لگیں گی تب بھی ہمارا گوشوارہ ایسے ہی قائم رہے گا“۔

جاسوسوں کا سرغنہ موٹا توتوش ہنسا اور کہنے لگا۔

”اگر میرے پاس محل ہوتا تو مجھے اس کی ذرا بھی پروانہ ہوتی کہ مرنے کے بعد مجھے چھپکلیوں کے درمیان ڈال دیا جائے تو کیا ہوگا۔

بہر حال اسنے نظام الملک کو مطلع کر دیا کہ رصد گاہ میں چھ منجم تعینات کیے گئے ہیں اور وہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہیں۔ یہ اطلاع پانے کے بعد نظام الملک نے منصوبہ بنایا کہ موسم خزاں میں اعتدال شب و روز سے پہلے کے ہفتے میں جس میں عمر نے اپنا مشاہدہ شروع کرنے کے لیے کہا تھا سلطان **ملک**

شاہ کے لیے رصدگاہ میں ایک چھوٹا سا ڈرامہ کیا جائے۔

نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو یہ ترغیب دی کہ جس روز وہ ہرن کا شکار کو جائے واپسی پر منارے کا معائنہ کرے۔ اس دن دوپہر تک رصدگاہ کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ باغیچے میں قالین بچھا دیے گئے اور درختوں کے نیچے مٹھائی کے تھال اور شربت کے گلاس رکھ دیے گئے"۔

پھر رصدگاہ میں مدرسے کے معلمین کا ایک وفد پہنچا۔ ان کے ساتھ الجبرے کا ماہر استاد علی بھی آیا۔ تمام معلمین درباری خلعتوں میں ملبوس تھے۔ اس کے علاوہ مسجد کے ملاؤں کی ایک جماعت بھی آئی اور جو دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے نظام الملک نے ان ملاؤں کا بڑا شاندار خیر مقدم کیا اور انہیں اس تخت کے بالکل قریب بٹھایا جو ملک شاہ کے لیے بچھایا گیا تھا۔ اور جس پر ریشم کا تخت پوش بچھا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ملا اس مذہبی مجلس کے رکن ہیں جسے زبردست اقتدار حاصل ہے۔ اور جسے سائنس کی ایجادوں سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہے۔ اس نے آہستہ سے عمر کو ہدایت کی کہ تمام احتیاط سے ان کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور ان کے سامنے کچھ نہ بولنا۔

عمر کو کچھ بولنے کی خواہش بھی نہ تھی۔ وہ تو ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کسی دعوت میں اسے بطور مہمان بلایا گیا ہو اور اس وقت جب رسمی آداب و کورنش کا سلسلہ ختم ہوا اور سب لوگوں کی نگاہیں سواروں کے اس دستے کو دیکھنے لگیں جو دریا کی ڈھلان سے اوپر آ رہا تھا تو عمر کو خوشی ہوئی۔

چشم براہ غلاموں کے قالین بچھانے سے پہلے ہی ملک شاہ نے اپنا شکار کا نیزہ ایک غلام کے ہاتھ میں رکھ دیا اور رصد گاہ کے دروازے پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ وہ گرد میں اٹا ہوا تھا اور بھرپور سواری کرنے کی وجہ سے خوش تھا لیکن عمر نے محسوس کیا کہ نوجوان سلطان کو نظام الملک اور بوڑھے ملاؤں سے مل کر حقیقی مسرت نہیں ہوئی۔ ملک شاہ کی گردن میں بار پڑے تھے۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ جانوروں کے سے نپے تلے انداز سے چلتا تھا۔ بات کرتے وقت نہ وہ اپنے ہاتھ اٹھاتا تھا اور نہ اونچی آواز میں بات کرتا تھا۔

جب عمر نے نظام الملک کے ساتھ جا کر سلطان کو مودبانہ کورنش پیش کی تو اس نے نوجوان نجومی کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا "اچھا یہی ہے وہ شخص؟"

عمر نے حسب توقع جواب دیا "جی ہاں میں ہی ہوں دنیا کے آقا سلطان ملک شاہ کا غلام"۔

"خراسان کی سڑک پر تو ہمارے پاس حاضر ہوا تھا۔ اور تو نے ہم سے آئندہ کے متعلق پیشن گوئی کی تھی۔ حالانکہ ہمارے مصاحبین نے جھوٹی باتوں کا طومار باندھ رکھا تھا۔ ہم تیری پیشن گوئی کو نہیں بھولے بتا اب تو ہم سے کیا لینا چاہتا ہے؟"

ایک لمحے تک سلطان اور عمر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک طرف وہ جنگجو سلطان تھا جس کے خیالات اسلامی دنیا کی گہما گہمی سے ابھی تک الگ تھے اور جو ابھی تک اپنے اسی مورث اعلیٰ خاقان کا فرزند تھا۔ جس نے دنیا کے بلند ترین علاقے کے اس پار مویشیوں اور نسانوں پر سلطنت کی تھی...... اور دوسری طرف وہ

طالب علم تھا جو ابھی تک تصورات کی دنیا میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ملک شاہ کی عمر بیس سال تھی اور عمر کا سن بائیس سال!

''میں چاہتا ہوں مجھے شاہی ملازمت میں لے لیا جائے'' ملک شاہ نے مسکرا کر کہا ''منظور ہے اچھا اب ہمیں دکھلا کہ تو نے یہاں کیا بنایا ہے؟''

سلطان سنگ مرمر کے اونچے ستون کو دیکھ کر خوش ہوا۔ اور اس نے دوسرے آلات کو بھی شوق سے دیکھا۔ جب بوڑھے میمون نے جو مہمانوں کے ہجوم میں اور بادشاہ کے حضور میں عجب بے تکا معلوم ہو رہا تھا سلطان کو آسمان کے عظیم گلوب کے متعلق بتانا شروع کیا تو ملک شاہ نے عمر کی طرف دیکھا اور اسے گلوب کی تشریح کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ اس نوجوان نجومی کے واضح الفاظ میں اس کی صراحت چاہتا تھا۔

ملاؤں کا صدر یہ نہ دیکھ سکا کہ سلطان سائنس کے آلات سے اتنی دلچسپی لے وہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے آگے بڑھا اور بولا ''غور سے سنو قرآن شریف میں یہ لکھا ہے کہ تم اگر عبادت کرنا چاہتے ہو تو سورج یا چاند کی پرستش نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کے آگے جھکو جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے۔

قرآن شریف کی اس آیت کو سن کو سب ملاؤں نے ''حق ہے حق ہے'' کہا لیکن عمر نے فوراً ہی جواب دیا ''کلام اللہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ دن اور رات کی نشانیاں ہیں اور چاند اور سورج بھی۔ تاوقتیکہ ان نشانیوں کی تشریح نہ کی جائے ہم انہیں کیسے سمجھیں گے۔''

ملک شاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے آباؤ اجداد جو بت پرست اور ترک اور

وحشی تھے اسلام قبول کر چکے تھے اور ملک شاہ مذہب کا اتنا ہی سختی سے پابند تھا جتنا کہ نظام الملک۔ اس نے پرتپاک انداز میں ملاؤں کے صدر سے اجازت چاہی اور جب اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا تو عمر کو اپنے قریب بلا کر کہا ''وزیر دولت نے ہم سے درخواست کی ہے کہ تجھے شاہی منجم کا عہدہ دے دیا جائے۔ ہم نے اسے منظور کر لیا کل دربار میں تجھے ایک اعزازی خلعت عطا کیا جائے گا'' بے ساختہ سلطان اس کی طرف جھکا اور پھر بولا ''کبھی کبھی ہمارے پاس بھی آکر بیٹھا کر۔ اپنے سرکی قسم ہمیں اکثر شگون معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے''۔

پھر سلطان نے گھوڑے کی باگ موڑ دی اور اچانک گھوڑے کی تیز ٹاپوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ چند لمحوں میں سلطان پہاڑ کی ڈھلان پر جا رہا تھا اور اس کے پیچھے گروہ در گروہ شاہی امیروں اور شکاریوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

اس کے بعد نظام الملک عمر سے تنہائی میں ملا تو اس نے کہا ''تو نے برا کیا۔ صدر العلماء کی بات کاٹی۔ ممکن ہے اب وہ تیری راہ میں روڑے اٹکائیں''۔

لیکن کیوں میرے سرپرست مجھے علماء سے کیا سروکار ہے؟

''دیکھ عمر آئندہ ان کو نہ چھیڑیو! بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی بہت سی باتیں جو تو نہیں جانتا اور جو تجھے سیکھنی ہیں۔ پہلے تو دربار میں تیرا تقرر عمل میں آئے گا اور تجھے بغیر کوئی محصول ادا کیے بارہ سو مثقال سالانہ تنخواہ ملے گی''۔

اف وہ عمر نے تعجب سے کہا۔ اس نے تو خواب میں بھی اتنی بڑی رقم کا تصور نہ کیا تھا۔

نظام الملک نے بے توجہی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور ممکن ہے کہ ملک شاہ تجھے اور تحائف بھی دے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ تجھ پر مستقل عنایت کرے گا لیکن یہ نہ بھولنا کہ جس شخص سے وہ بدظن ہو جاتا ہے اس کے ساتھ فولاد کی سی سختی سے پیش آتا ہے۔ محل کے اندر اس کے جاسوس ایسے چھپے ہوئے ہیں کہ جیسے شہد کی مکھیاں اپنی مہال میں چھپی رہتی ہیں۔ تیرے عروج کی بنیاد اسی کی عنایت پر قائم ہے۔ وہ نہ رہی تو تو بھی کہیں کا نہیں رہے گا"۔

عمر کو تعجب ہو رہا تھا کہ اپنے کام میں انہماک کے ساتھ ساتھ اسے نوجوان کی جسے وہ دل سے پسند کرتا تھا عنایت حاصل کرنے کی بھی کوشش کرنی ہوگی۔ نظام الملک نے اس کے ان خیالات کا اندازہ لگایا اور سنجیدگی سے کہا۔

"تجھے میری سرپرستی حاصل ہے اور سردست خدا کے فضل سے کسی میں میری علانیہ مخالفت کرنے کی ہمت نہیں لیکن مجھے بھی اپنا کام کرنا پڑتا ہے......"

نظام الملک نے آہستہ سے عمر کو بتایا کہ وہ سلطان کے لیے نئی سلطنت کا نقشہ تیار کر رہا ہے۔ تین نسلیں ہلے جب سلجوق ترک نہیں آئے عالم اسلام میں اختلافات جنگ و جدال اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ خود بغداد میں موجودہ خلیفہ کو اس اقتدار کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہوا جو کسی زمانے میں ہارون الرشید کو حاصل تھا۔ یہاں تک کہ سلجوق ترک قبائل کو لے کر خلیفہ کی امداد کو آئے۔ شیر دل سلطان الپ ارسلان مشرق سے آندھی کی طرح اٹھا اور مغرب کی جانب خراسان میں دشمنوں کا صفایا کرتا ہوا فاتح و کامران اور خلیفہ کی جانب سے تسلیم شدہ سلطان کی حیثیت سے بغداد میں

داخل ہوا۔

اس وقت حیفہ فتح ہوا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو بھی نئی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ اور ی تو عمر نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا کہ ملازگرد میں بازنطینی عیسائیوں کو زچ کر کے سلطان نے ان پر فتح حاصل کی تھی اب سلطان کی وسیع سلطنت سمرقند سے قسطنطنیہ کی شہر پناہ تک پھیلی ہوئی تھی ۔اور قیصر روم ملک شاہ کو خراج ادا کرتا تھا۔ نظام الملک نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آگے چل کر ملک شاہ کی ایک لڑکی کا موجودہ خلیفہ سے عقد کر دے اور ملک شاہ کی شادی وہ قسطنطنیہ کے بازنطینی بادشاہ کی لڑکی سے کرا چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوجوان سلطان کا اسلامی دنیا کے قانونی سربراہ اور قیصر روم دونوں میں خونی تعلق قائم کر دے۔

نظام الملک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”اس موسم گرما میں سلطان اپنی فوج لے کر حیفہ جائے گا جہاں سے وہ بیت المقدس پر فوج کشی کرے گا۔ اور دنیا کے اس تیسرے مقدس ترین شہر کو عزیز مصر سے...... جو ایک فسادی اور کم ظرف انسان ہے۔ چھین لے گا“۔

عمر کو تعجب ہو رہا تھا کہ یہ آدمی کس اعتماد سے منصوبہ بنا رہا ہے۔ کہ فلاں شہر کو فتح اور فلاں علاقے کو سلطنت میں شامل ہونا ہے۔ نظام الملک اسے روزانہ اپنے پاس بلاتا اور ان جاسوسوں کے انتظام کے حالات بتایا کرتا جو تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور جو سلطان کی آنکھوں اور کانوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے بڑی وضاحت سے عمر کو شاہ سلطان کے مزاج اور افتادِ طبع کا حال بتایا اور اسے مطلع کیا کہ

سلطان شکار کا بہت شوقین ہے۔ وہ عورتوں کے ساتھ بے حس کنیزوں کا سا سلوک کرتا ہے۔ اور شگونوں پر بہت اعتقاد رکھتا ہے۔ یہ سب باتیں بتا کر نظام الملک نے آخر میں اس سے کہا "ہمیشہ یاد رکھنا کہ اس کا دادا وحشی تھا۔ اگر ملک شاہ کو یہ وہم ہو جائے کہ اس کا نجومی دشمنوں سے تنخواہ پاتا ہے تو اس نجومی کو تباہ کرنے کے لیے اس کا وہم ہی کافی ہو سکتا ہے"۔

عمر نے سر ہلایا وہ خوب سمجھتا تھا کہ بد دماغ آدمی کسی شخص کو بھی تباہ کر سکتا ہے۔

پھر نظام الملک نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "گویا تیرا کام بہت اہم ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھے زائچوں اور شگونوں پر اعتقاد نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا صرف یہ عقیدہ ہے کہ ستاروں کی مقررہ راہ پر گردش خدائے برتر کی قوت کا اظہار کرتی ہے۔ جب ملک شاہ تجھ سے کوئی کام شروع کرنے کے لیے نیک ساعت پوچھے یا یہ دریافت کرے کہ فلاں کام میں کامیابی ہوگی یا ناکامی تو اس کے زائچے کی مدد سے حساب لگانا اور یہ کوشش کرنا کہ کوئی اور اسے متاثر نہ کر سکے پھر یہ بھی یاد رکھنا کہ دوسرے بہت سے لوگ تیرے ہر کام کو حسد کی نظروں سے دیکھیں گے"۔

بجا فرمایا۔ عمر نے کہا۔ اسے یہ تجربہ تو ہو ہی چکا تھا۔ کہ جاسوس کسی نقل و حرکت کی کس طرح نگرانی کرتے ہیں۔ پھر اگر ملک شاہ نے بھی اس کے ستاروں کی علامتوں کا حساب لگانے کے لیے کہا تو یہ کام کرنا مشکل نہ ہوگا اور یہ حساب نجوم کے ان اصولوں کے مطابق جو کلدانیوں کے میناروں کی طرح قدیم ہیں بآسانی نہ لگایا جا سکتا۔ اگر یہ علامتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں تو کیا ہوا؟ اگر ملک شاہ پوچھے گا تو یہ

علامتیں بالا کم و کاست اسے بتا دی جائیں گی۔

نظام الملک نے بے توجہی سے کہا ''ممکن ہے وہ کبھی کبھی وہ تجھ سے ان امور مملکت کے مطالب اور نتائج پوچھے جو میرے ہاتھ میں رہتے ہیں ایسے موقع پر تو میرے پیغام بھیج کر یہ معلوم کر لینا کہ کیا جواب دینا بہتر ہو گا۔ کیونکہ ان امور کی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ اور یہ منصوبہ بندی صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔

عمر نے نظام الملک کو تعجب کی نظروں سے دیکھا۔

نظام الملک مسکرایا اس کا دماغ کہیں اور معلوم ہوتا تھا وہ بولا ''خدا کے فضل سے حکومت کی باگ ڈور دو ہاتھوں میں ہے ایک ہاتھ تو بادشاہ کا ہے جو تاج پہنتا ہے اور دوسرا اس کے وزیر کا جس کے سر پر وزارت کی پگڑی ہے۔ بادشاہ جنگ کرتا ہے ملک فتح کرتا اور لوگوں کو سزائیں دیتا ہے اور انعام دیتا ہے اور وزیر کے ہاتھ میں نظم ونسق محصول کی وصولیابی اور دوسرے ملکوں کے ساتھ حکمت عملی کا تعین ہوتا ہے۔ میں ملک شاہ کی ایمان داری سے خدمت کرتا ہوں لیکن بالآخر میرا فرض یہ ہے کہ نئی مملکت کا سنگ بنیاد رکھوں ...... اس لیے میں تجھ سے صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ حکمت عملی کے امور کے متعلق تو مجھ سے مشورہ کر لیا کر یہ بات طے ہے نا؟''

یقیناً عمر نے جواب دیا اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس سنجیدہ مزاج انسان نے جو ملک شاہ اس کی اپنی اور متعصب علماء کی نسبت زیادہ عقل مند تھا۔ اسے اپنا معتمد بنا لیا ہو۔ نظام الملک کی دیانتداری اتنی ہی غیر متزلزل تھی جتنا کہ سنگ مرمر کا وہ نیا ستون۔

نظام الملک نے پرسکون انداز میں جواب دیا ''اچھا تو تو نے مجھ سے وعدہ کرالیا ہے'' اسے دل میں جو خوشی محسوس ہو رہی تھی اس کا چہرے سے اس نے اظہار نہیں کیا۔ دو سال قبل جب سلطان الپ ارسلان کا اچانک انتقال ہوا تھا اسی وقت سے وہ اس فکر میں تھا کہ عمر کو تلاش کرے اور اس نوجوان سائنس دان کو اپنی سرپرستی میں لے کر ملک شاہ کا نجومی مقرر کرادے۔

اس نے توتوش سے کہا ''اب ہم ملک شاہ کو اپنا ہم رائے بنانے کے لیے اس کا اثر استعمال کر سکتے ہیں'

لیکن عمر کی پہلی ہی درخواست نے نظام الملک کا یہ اطمینان چھین لیا۔ عمر نے اس سے کہا کہ منارے کی رصدگاہ میں جو مشاہدے کیے جائیں گے وہ معمولی نوعیت کے ہیں اور خواجہ اس کی اعانت کے بغیر محض دوسرے نجومیوں کی مدد سے ایک سال تک یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔ اس عرصے میں میری خواہش تھی کہ میں سلطان ملک شاہ کے ہمراہ مغرب کے سفر پر جاؤں...... اور اصل واقعہ یہ تھا کہ اس سے اس سفر پر چلنے کے لیے خود سلطان نے کہا تھا۔

عمر نے نظام الملک کو یہ نہیں بتایا تھا کہ خود سلطان نے اس کو سفر پر جانے کی ترغیب دی ہے۔ اور نہ یہ بتایا تھا کہ مغرب کی سڑکوں پر میں یاسمین کو تلاش کروں گا۔ عمر کے پاس اب دولت اقتدار اور ملازمین اور شاہی عنایات غرضیکہ سب کچھ تھا اور وہ اپنی محبوبہ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

توتوش نے جب یہ خبر سنی تو وہ مسکرایا اور اس نے دل میں کہا ''میاں نظام! ایک

مرتبہ تم نے مجھے اس بات پر ڈانٹا تھا کہ خیمہ دوز کا یہ بیٹا میری نگرانی سے کیسے نکل بھاگا لیکن تمہاری سرپرستی میں آئے اسے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا کہ وہ سلطان کا ہم پیالہ و ہم نوالہ بن کر پھر وہ راہ پیمائی کے لیے جا رہا ہے'' لیکن توتوش نے ظاہری طور پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ نظام الملک سے کہا۔

''قسمت میں یہی لکھا تھا''۔

حوالہ جات

ہو موہم گل اور بت حور سرشت
بھر بھر کے مجھے جام پلائے سرکشت
پھر چاہے کسی کو بھی مری بات نہ بھائے
میں کتے سے بدتر ہوں جو لوں نام بہشت

☆☆☆
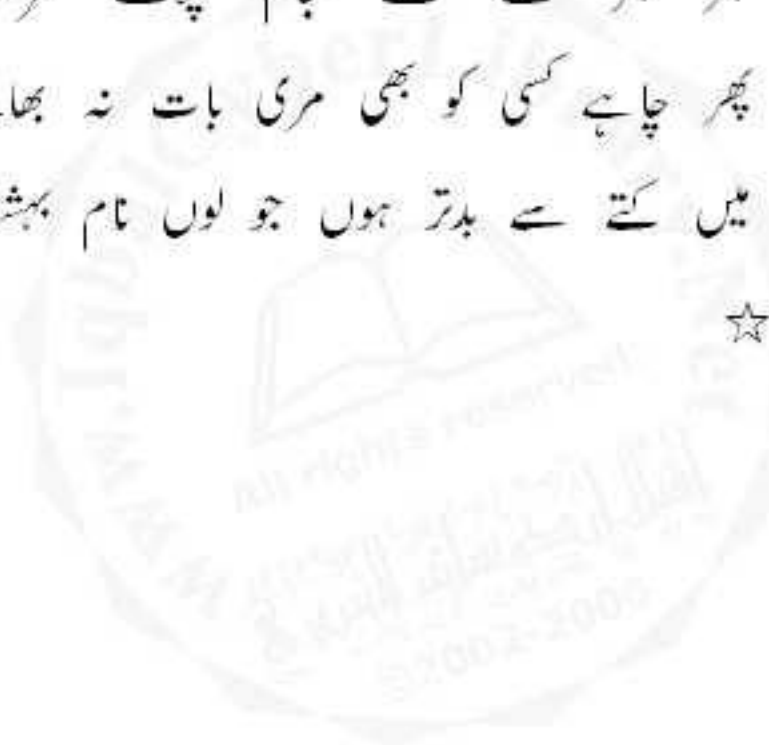
باب سوم

تیز رو دریائے فرات کے ساحل پر بابل کے کھنڈروں میں ملک شاہ کا پڑاو
1075ء کی فصل بہار کا آغاز۔

عمر کو اپنی درباری زندگی میں سب سے پہلے خطرے سے اس وقت دو چار ہونا پڑا۔ جب سلطان کی فوجیں دریائے فرات کو عبور کرنے کے انتظار میں ساحل پر خیمہ زن تھیں۔

ان امرء کے خیمے جن میں عمر بھی شامل تھا جو سلطان کے مصاحبین میں شمار ہوتے تھے فرات کے ساحل پر کھجوروں کے باغ میں نصب کیے گئے تھے۔ ان خیموں کے پیچھے شکستہ دیواریں اور مٹی کے وہ ٹیلے تھے جو دراصل بابل کے کھنڈر تھے۔ عمر نے ان کھنڈروں کو دیکھنے میں کچھ وقت گزارا لیکن جب سلطان سیر و شکار میں مصروف نہ ہوتا تو وہ اپنے خیموں اور رقاصوں اور شعبدہ بازوں کے کرتب دیکھتا۔

بابل کے کنڈروں کے ایک صحن کو پردوں سے سجا دیا گیا تھا اور سنگ مرمر کے ایک زینے پر قالین بچھا کر بادشاہ اور اسکے مصاحبین کے لیے تخت بنا دیا گیا تھا۔ یہاں ایک روز شام کے وقت سلطان نے عمر کو طلب کیا۔

سلطان ملک شاہ نے گرم جوشی سے عمر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ''ستاروں کا مطالعہ کرنے والے ہمارے پاس بیٹھ کر ان کتوں کے حالات دیکھو''۔

قالین پر ایک طرف عمر کے لیے نشست بنا دی گئی۔ تخت کے آگے رقص زوروں شور سے جاری تھا۔ ناچنے والوں استاد اپنے گیت ایک نئی دھن میں گا رہا تھا۔ اس کے شانوں پر لگے گھنگھرو مخصوص تال میں بج رہے تھے۔ اور انگلیاں ڈھول پر تھرک رہی تھیں جو اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ جب وہ رقص کے دوران میں چکر لگاتا یا رکتا تو اس کے بال ماتھے پر لہراتے۔

ناچنے والوں کا استاد یکا یک رکا اور اس نے عمر کے سامنے آکر انعام کے لیے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ ماتھے پر لٹکے ہوئے بالوں سے وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے عمر کو دیکھ رہا تھا۔ عمر نے اس کی طرف ایک سکہ پھینک دیا۔ رقاص نے اس سکے کو کمال مہارت سے اپنی انگلی کی نوک پر گھمانا شروع کر دیا اور اس دوران انکھیوں سے عمر کو دیکھتا رہا۔

رقاص نے چیخ کر کہا "اے جادوگر! میں اولے برسا سکتا ہوں اور آندھیاں چلا سکتا ہوں۔ میں دل کا حال بھی بتا سکتا ہوں"۔

عمر نے مسکرا کر جواب دیا "تب تو تو واقعی جادوگر ہے"۔

"برج جدی کے ستاروں کی قسم اس بجلی کی قسم جو ستاروں کا مطالعہ کرنے والے پر گرتی ہے میں جادوگر ہوں۔ تو سوچ رہا ہے کہ میں سخت بدمعاش ہوں۔ لیکن تو پھر بھی مجھ سے خوف زدہ ہے"۔

اس کی نگاہیں عمر کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور ملک شاہ اس وقت خوشی کے عالم میں تھا اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

''ستاروں کا حال بتانے والے اب تو میرے دل کا حال بتا۔نہیں تو مجھے صرف اتنا بتا دیکہ تو میرے دل کا حال بتا سکتا ہے یا نہیں''۔

وہ اپنا بھدا ر ہلا کر عمر کو تکے جا رہا تھا۔فوراً ہی وہ بولا بتا میں اس دربار سے کون سے دروازے سے باہر جاؤں گا دیکھ یہاں چار دروازے ہیں مشرقی' جنوبی' مغربی اورشمالی۔تو اے ستاروں کا حال بتانے والے مجھے بتا میں کس دروازے سے نکلوں گا''۔

عمر اس کے سوال پر قہقہہ لگا کر ہنسا مگر ملک شاہ کو دیکھ رک وہ چونک پڑا۔سلطان جھکا ہوا بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔جیسے یہ رقاص اور شاہی منجم دو غنیم ہوں جن کے درمیان تلوار سے مقابلہ ہو رہا ہو۔

عمر نے آہستہ سے کہا''یہ تو بہت معمولی بات ہے اور......''

''لوگ کہتے ہیں کہ تو بڑا عاقل ہے بتا میں کس دروازے سے باہر جاؤں گا۔

دوسرے رقاص بھی اپنے استاد کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔اور سلطان کے مصاحب بھی گفتگو سننے کے لیے قریب آ گئے۔ملک شاہ بڑے شوق سے عمر کے جواب کا منتظر تھا۔عمر نے رقاص کو سمجھانا شروع کیا۔کہ ستاروں ک مطالعے کا ایسی شعبدہ بازی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن وہ پوری بات کہہ بھی نہ پایا تھا جو اسے محسوس ہوا کہ سلطان کو یقین ہے کہ میں انسانوں کے خیالات بتا سکتا ہوں۔اس نے سوچا کہ ملک شاہ کے اس اندھے عقیدے کو کسی استدلال سے بھی بدلا نہیں جا سکتا۔عمر نے اپنے دل میں کہا کہ اب تو کوئی چارہ ہی نہیں۔یہ آوارہ رقاص مجھے جال میں

پھنسانا چاہتا ہے۔ بس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں اس کی چالاکی حاضر دماغی سے کاٹ کروں۔

عمر نے بے چین ہو کر کہا...... میرے لیے ایک کاغذ اور قلم لاؤ''۔

ایک چوبدار آگے بڑھا اور اس نے مودب ہو کر عمر کو ایک کاغذ اور ایک واسطی قلم پیش کیا۔ عمر نے یہ چیزیں لے لیں لیکن وہ فکر میں غرق تھا۔ اسے چالاکی کا جواب چالاکی سے دینا تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ ''اچھا تو یہ ہوتا ہے شاہی منجم کا فرض اگر میں ناکام ہوا تو ملک شاہ اسے کبھی نہیں بھولے گا۔ کاش میں اس دروازے کا صحیح اندازہ لگا سکوں رقاص نے کہا تھا چار دروازے ہیں۔ مشرقی جنوبی مغربی اور شمالی۔ چاروں میں سے کس دروازے سے...... یہ دروازے صاف نظر آرہے ہیں اور ان سب دروازوں میں چوب دار ٹہل رہے ہیں...... لیکن رقاص نے یہ کیوں نہیں کہا کہ کس دروازے سے؟

عمر نے کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے تہہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اگر یہ رقاص شعبدہ بازی کر سکتا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ملک شاہ کی اجازت لے کر وہ زینے پر گیا اور ایک پتھر کا سرا اٹھا کر جو غالباً کسی مجسمے کا پائدان تھا اس نے مڑے ہوئے کاغذ کو وہاں رکھ دیا۔ اور پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رقاص سے کہا ''اب تم جاؤ''۔

رقاص کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور مشرقی دروازے کی طرف دوڑا۔ اس کے گھنگھرو بج رہے تھے۔ پھر وہ خوشی کا ایک نعرہ لگا کر گھوما اور دیوار کی طرف لپکا۔ زرووزی کا پردہ پکڑ کر ایک طرف گھسیٹا جس کے پیچھے سے

دیوار کا ایک بغلی دروازہ نمودار ہوا۔

رقاص نے چیخ کر کہا "میں اس دروازے سے جاتا ہوں" رقاص کے جانے کے بعد پردہ گر گیا۔ تماشائیوں کی صفوں سے مدھم آواز میں خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ ملک شاہ نے چوبدار کو وہ کاغذ لانے کا حکم دیا تھا جو عمر نے پتھر کے نیچے دبایا تھا۔

پرچے کو سلطان نے آہستہ سے کھولا اور اس کی تحریر پڑھ کر تعجب سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر اس نے بلند آواز میں وہ پرچہ پڑھا۔

"پانچویں دروازے سے" یا اللہ اے غیب کے حالات بتانے کے ماہر تو نے اس کے دل کا حال سچ سچ معلوم کر لیا"۔

عمر نے صرف قیافے سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جب یہ رقاص چار دروازوں پر اتنا زور دے رہا ہے اور جب اس کا امکان ہے کہ ان چار دروازوں میں سے اتفاقاً صحیح دروازہ بتا دوں تو یہ بھی ممکن تھا کہ اسے دربار سے باہر جانے کا ایک اور دروازہ معلوم ہو حالانکہ دروازہ نظروں سے اوجھل ہے۔ بہر حال ملک شاہ سلطان جھکا اور اس نے اپنے نجومی کی کمر تھپک کر کہا کہ تو دوسرا ابو علی سینا ہے پھر اس نے خزانچی کو حکم دیا کہ عمر کا منہ سونے سے بھر دیا جائے خزانچی فوراً سونے اور چاندی کی ڈلیوں سے بھرا ہوا تخت اٹھایا اور جو ہمیشہ سلطان کے قریب رکھا رہتا تھا اور یہ ڈلیاں عمر کے منہ میں بھرنا شروع کیں۔ پھر سلطان بولا اور اس کتے کے بچے رقاص کے منہ میں ریت بھر دو یہاں تک کہ وہ ریت سے اٹ جائے خدا کی قسم اس نے ہمارے آقائے

دانش سے گستاخی کی ہے"۔

فوراً ہی کچھ چوبدار سلطان کے حکم کی تعمیل کے لیے دوڑے۔ جب عمر سلطان سے رخصت ہو کر چلا تو ایک غلام بڑی شان کے ساتھ سونے کے سکوں سے بھرا طشت لے کر اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ عمر نے دیکھا کہ دربار کے ایک دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس مجمع میں دو سپاہی رقاص کے بازو پکڑے ہوئے تھے تیسرا سپاہی چاقو سے اس بدمعاش کا منہ کھول رہا تھا۔ اور چوتھا سپاہی بورے سے ریت نکال نکال کر اس کے زخمی منہ میں بھر رہا تھا۔ رقاص کا چہرہ تکلیف سے سیاہ پڑتا جا رہا تھا اور بعض اوقات وہ درد سے بری طرح کراہتا ہے۔

عمر نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کھجوروں کے جھنڈ میں اپنے خیمے کی تلاش میں روانہ ہوا۔ غلام بھی طشت لیے اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اس وقفے میں اس نے للچائی ہوئی نظروں سے اپنے کندھے پر سونے سے بھرے ہوئے طشت کو ایک نظر دیکھا۔

اس رات عمر دیر تک کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ حبشی غلام جو سونے کا طشت لے کر اس کے ساتھ آیا تھا روزانہ کی طرح خیمے میں نہیں سو رہا تھا۔ وہ اس جگہ لیٹا ہوا رینگ رہا تھا اور کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔ اتنے میں خیمے کے دروازے پر ایک اور سایہ نظر آیا پھر وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے عمر کو اپنا مطالعہ ترک کرنا پڑا۔

عمر کو اٹھتا دیکھ کر غلام چیخ کر بولا۔ حضور یقیناً یہ جادو کی رات ہے۔ حضور آپ کا

غلام خوف زدہ ہو رہا ہے۔

دوسرے آدمی نے غلام کی ہاں میں ہاں ملا کر اور عمر کو سلام کر کے کہا "ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم آقائے دانش کے قدموں میں بیٹھ سکیں۔ ہمیں رات سے ڈر لگ رہا ہے"۔

چراغ کے قریب کھسکتے ہوئے اس نووارد نے عمر کو بتایا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ بابل کے کھنڈروں میں ٹہل رہا تھا کہ اس نے ایک ٹیلے پر روشنی دیکھی۔ یہ چاند کی روشنی نہیں تھی کیونکہ جیسا کہ آقائے دانش کو علم ہے اس شب چاند نہ نکلا تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں روشنی کا ایک حالہ تھا جس میں ایک سفید پوش آدمی کی شکل نظر آ رہی تھی۔

نووارد نے کہا "ٹیلے کے قریب پہنچا تو میں نے دو چیزیں اور دیکھیں...... ان میں ایک قریب قریب ننگا انسان تھا جو زمین پر سانپ کی طرح رینگ رہا تھا اور دوسرا ایک دیو پیکر بھورے رنگ کا عقاب تھا جو روشنی کے اس ہالے میں چکر کاٹ رہا تھا۔

حبشی غلام جس نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن متاثر اتنا ہی تھا جیسے خود دیکھا ہو چیخ کر بولا۔ واہ یہ روشنی سب سے اونچے ٹیلے پر تھی اور سفید پوش اس عقاب سے باتیں کر رہا تھا۔ عقاب اسی دوران سانپ بن گیا۔ اس کے پاس ایک چاقو بھی تھا۔ ارے ارے وہ تو عجیب جادو تھا۔ اور ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔

نووارد نے اپنی اہمیت جتاتے ہوئے کہا "وہ شخص جو رینگ رہا تھا رقاص تھا جس کے منہ اور پیٹ میں ریت بھرا ہوا تھا۔ آقائے دانش نے انہیں آپ کا نام بھی

لیتے سنا تھا انہوں نے عجیب جادو دکھایا۔

''کہاں؟''

سامنے اس اونچے ٹیلے پر''۔

غالباً اس غلام نے ٹیلے پر رقاص کو دفن کیے جاتے دیکھ لیا ہوگا..... پھر بھی عمر یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوف زدہ حبشی غلام رات بھر اس کے پاس بیٹھے رہیں۔ چنانچہ وہ ٹیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور نوواردبھی بادل نخواستہ اس کے پیچھے پیچھے چلا اور حبشی غلام تو اس کے اتنے قریب چل رہا تھا کہ عمر کے قدم پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ خیمے سے روانہ ہونے کے بعد وہ شکستہ دیواروں کی طرف جانے والے راستے پر مڑے یہاں تک کہ عمر اس جگہ پہنچا جو کسی زمانہ میں ایک چوڑی سڑک رہی ہوگی۔ نووارد یہاں آ کر اپنے چراغ کی روشنی تیز کرنے کے لیے اسے ہلانے کے بہانے ٹھہرا۔ اس نے عمر سے آہستہ کہا حضور وہ جگہ یہاں سے کچھ ہی دور ہے وہاں دائیں طرف آپ کا غلام آپ کا یہ غلام یہیں ٹھہر کر انتظار کرے گا.....''۔

عمر نے نووارد سے چراغ لے لیا اور آگے بڑھا جلد ہی اس کے کانوں میں پھاوڑا چلانے اور کسی کے زمین کھودنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں غلام اس کھنڈر سے بھاگ کر واپس جا رہے تھے وہ بہت تیز دوڑ رہے تھے۔ اور عمر تنہا دونوں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ اونچائی پر ایک مدھم سی روشنی کی نظر پڑی۔

یہ روشنی اس کھنڈر پر تھی جسے لوگ مندر کہتے تھے۔ عمر نے دن میں یہ جگہ دیکھی تھی

اور وہ جانتا تھا کہ یہاں سے ریت کے ٹیلوں پر کون سا راستہ جاتا ہے۔ جب وہ ٹیلے پر پہنچ گیا تو اس نے اس روشنی کی طرف بڑھنا شروع کیا جو شکستہ دیوار کے ایک طاق پر نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی کے ہالے میں بیٹھا ہوا آدمی عمر کو دیکھ کر اس انداز سے اٹھا جیسے وہ اس کی آمد کا منتظر ہو۔

وہ بولا ''ایک جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے''۔

وہ شخص خیام سے پستہ قد تھا۔ اس کی بھنوئیں گھنی اور ڈاڑھی گھنگھریالی تھی۔ عربوں کی طرح وہ اپنے شانے پر سفید رومال ڈالے ہوئے تھا۔ لیکن چہرے سے عرب نہیں معلوم ہوتا تھا۔

زمین کی طرف اشارا کرتے ہوئے اس نے عمر کو ایک لاش کی طرف متوجہ کیا۔ یہ لاش رقاص کی تھی۔ اسکے سینے میں چھرا گھونپا ہوا تھا۔ وہ شخص بولا ''میں نے اس کے دکھ کا خاتمہ کر دیا'']۔

عمر نے اس شکاری پرندے کو دیکھا جو قریب ہی اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسے خیال ہوا کہ یہ پرندہ باز وغیرہ ہو گا۔ لیکن وہ عقاب تھا جب عمر اسکے قریب پہنچا تو عقاب نے پر پھڑ پھڑانے بند کر دیے۔ وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے عمر کو تک رہا تھا۔

اس شخص نے کہا ''یہ میرا رفیق ہے جو اونچے مقامات میں میرے ساتھ رہتا ہے..... اور آسمان کی بلندیوں سے نیچے اتر آتا ہے''۔

تو کون ہے؟

''پہاڑوں کا رہنے والا اور رے کا باشندہ'' اس شخص نے یہ جملہ اپنی ٹھوڑی کو

آگے کرتے ہوئے کہا اور اس کی چمکیلی آنکھیں اور چمک اٹھیں۔

رے کا قدیم شہر ان پہاڑوں کی ترائی میں واقع تھا جو ایران کی بلند ترین اور برف پوش چوٹی دی آوند کے گرد پڑتی تھی۔ اگرچہ اس شخص کا ایرانی ہونا بھی ممکن تھا۔ لیکن اس کا لہجہ مصریوں کا سا تھا۔ اور آواز کے لوچ سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کئی زبانوں سے واقفیت حاصل ہے۔

اس نے عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تو خیام ہے بادشاہ کا منجم۔ تجھے سکون حاصل نہیں ...... اسی وجہ سے تو یہاں ایسر کے مندر میں ایک ایسے طالب علم سے باتیں کرنے آیا ہے جسے بہت سے لوگ پاگل سمجھتے ہیں۔ میرا نام حسن بن صباح ہے۔

"حسن بن صباح تم عجیب طریقے سے تدفین کرتے ہو"۔

"واللہ یہ تدفین نہیں یہ کام تو میں نے غاموں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ میرا کام تو ہو چکا"۔

"تم طالب علم ہو...... کیا تم مرنے والوں کا مطالعہ کرتے ہو؟"

حسن غور کر رہا تھا جیسے وہ اپنے ذہن میں کوئی نئی بات سوچ رہا ہے وہ عمر سے سن میں کسی قدر بڑا تھا۔ اس کی آواز اور اس کے قوی ہاتھوں میں حیوانوں کی سی سختی اور طاقت تھی اس نے جواب دیا "میں حقیقت کی تلاش میں ہوں اور بہت سی چیزوں کی حقیقت کی جستجو رکھتا ہوں۔ میں نے اس رقاص کو سلطان کے دروازے کے باہر پڑا دیکھا۔ جہاں اسے کتوں کے چیرنے پھاڑنے کے لیے پھینک دیا گیا تھا۔ اس لیے

میں اسے یہاں ٹیلے پر لے آیا۔ یہاں عقاب اس کا گوشت کھا کر اپنی ہڈیاں صاف کر دیں گے۔ اس دردوے نجات دلانے کے لیے میں نے اس کے سینے میں چھرا گھونپ دیا۔ حالانکہ خیمے کا ہر شخص اسے مارتے ڈرتا تھا کیونکہ ملک شاہ نے اس احمق رقاص کے منہ میں صرف ریت بھرنے کا حکم دیا تھا...... لیکن سب سے بڑھ کر مجھے دوستوں کی اور سچے دوستوں کی تلاش ہے۔ اسی لیے میں عرصے سے بابل میں مقیم ہوں"۔

حسن بن صباح کسی دین دار مسلمان یا درباری سے کے لہجے میں گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ عمر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید وہ خود ملک شاہ کا کوئی معتمد ہو۔ حسن نے بے ساختہ اس سے پوچھا "کیا آپ نے کبھی کسی نشان کے ظاہر ہونے کا انتظار کیا ہے؟"

عمر نے جواب میں اس سے یہ سوال کیا "صباح کے بیٹے! کیا تم نے بھی بابل میں کوئی نشانی دیکھی ہے؟"

"ہاں جب یہ رقاص مرا تھا اس وقت کیونکہ اب اور اس لمحے میری ملاقات اس آدمی سے ہوئی ہے جو اپنے خیالات میں واضح اور حقیقت کا جویا ہے۔ اے خدا کاش عمر خیال میرا دوست ہو سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسا ہونا مقدر ہو چکا ہے...... لیکن ستارے ڈوب رہے ہیں اب رات بہت ہو گئی اور میں ٹیلے سے نیچے اترتا ہوں"۔

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ چراغ بجھ گیا۔ لیکن حسن کو کوئی پریشانی محسوس نہ ہوئی۔ اس

نے کہا کوئی بات نہیں اس کھنڈر کی بھول بھلیوں سے اتنی ہی اچھی طرح واقف ہوں جتنی اچھی طرح رند میخانے سے واقف ہوتا ہے۔ اس نے عمر کا ہاتھ پکڑا اور تنگ راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ ایک بات وہ ٹیلے پر ایسی جگہ پہنچے جہاں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ لیکن حسن لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑھتا ہی چلا گیا۔ عمر نے پیچھے سے عقاب کے پھڑ پھڑانے کی آواز سنی جیسے وہ ان کے ساتھ آ رہا ہو۔ پھر کوئی الوداعی کلمہ کہے بغیر ہی حس نے عمر خیام کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس کے ساتھ پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز بھی دور اندھیرے میں مدھم ہوتی چلی گئی۔

اپنے خیمے میں پہنچ کر عمر نے دیکھا کہ چراغ کے قریب غلام سمٹے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

سونے سے پہلے کچھ دیر تک عمر اپنی اور حسن کی ملاقات پر غور کرتا رہا۔ عمر نے سوچا کہ حسن عجیب انسان ہے۔ اسے میرے وہاں پہنچنے کی توقع بھی تھی...... وہ نووارد غلام جو اس کے خیمے میں یہ قصہ سنانے آیا تھا غائب ہو چکا تھا...... اور اس کی ایک انجانے اور انوکھے طریقے سے آزمائش کی گئی تھی۔

بلاشبہ وہ روشنی تو اس چراغ کی تھی جسے ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ لیکن ہرن کے شکار کے علاوہ کون عقاب کو سدھاتا ہے؟

اس کے بعد عمر نے کئی مرتبہ فوج کے سپاہیوں سے اس حسن بن صباح کا حال پوچھا جو مصریوں کے لہجے میں بولتا تھا لیکن اس کا کوئی جاننے والا نہ ملا۔

وادی جہنم کے آگے بیت المقدس کی مشرقی شہر پناہ کے مقابل ایک ٹیلا......

چھوٹی چھوٹی باتوں سے عمر کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ نظام الملک اتنے فاصلے سے بھی اس پر نگاہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر کبھی عمر کے سامنے کسی آوارہ شعبدے باز کو آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ جب وہ خیمے میں تنہا ہوتا ہے تو ایک ہندو منشی اس کے پاس آتا اور بلخ و سمرقند کے معاملات اور ملک شاہ کی جملہ کارروائیوں پر بات چیت کیا کرتا۔

اور سب سے زیادہ مددگار وہ خطوط تھے جو نظام الملک خود اسے لکھا کرتا تھا۔ بظاہر ان خطوط میں نظام الملک اپنے کام کے حالات لکھتا تھا لیکن دراصل یہ بحث ہوتی تھی کہ کون کون سے لائحہ عمل اختیار کیے جائیں اور کن خطرات سے بچا جائے۔ ان خطوط ہی سے عمر کو یہ معلوم ہوا کہ ملک شاہ کی فوجوں کے لیے بیت المقدس لینا کتنا ضروری تھا۔ ملک شاہ خلیفہ بغداد کا جسے کروڑوں مسلمان اپنا پیشوا مانتے تھے منظور نظر بن چکا تھا اور سلجوق ترک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے انہیں بیت المقدس کو مصر کے بدعتی خلیفہ کے ناجائز قبضے سے نکال کر اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا کام ابھی باقی تھا۔

توسیع سلطنت ہی کے مقصد سے ملک شاہ کو شمال میں کافر بازنطینیوں کے خلاف بھی فوج کشی کرنے کی ضرورت تھی۔ جب تک اسلام کا یہ مجاہد جہاد کے راستے پر چلتا رہے گا' اس وقت تک اسے اپنی فوج کے لیے سپاہیوں کی کمی نہ ہوگی...... کوہستانی

علاقوں سے مزید ترک قبائل کے سوار دستے نیشاپور پہنچ رہے تھے اور نظام الملک انہیں فوج میں شامل ہونے کے لیے مغرب کی جانب روانہ کر رہا تھا۔

اب عمر کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا کہ نظام الملک کی حیثیت اس کاریگر کی سی ہے جو اپنے کھڈے پر بیٹھا' بظاہر بے معنی انداز میں ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بنتا رہتا ہے' لیکن اصل میں یہ ٹکڑے ایک قالین کے مجموعی نقشے کا جزو ہوتے ہیں۔

چنانچہ ملک شاہ نے جب اس سے یہ مشورہ کیا کہ بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لیے ساعت نیک ہے یا نہیں تو عمر نے کسی پس وپیش کے بغیر کہا یقیناً یہ مہینہ نہایت مبارک ہے اور مریخ کا سیارہ آپ کے سیارے کا حامی ہے"۔

ملک شاہ بخوبی جانتا تھا کہ یہ بات درست ہے' لیکن وہ اپنے منجم پر اس قدر بھروسا کرتا تھا کہ اگر عمر اعتراض کرتا تو ملک شاہ اپنا منصوبہ بدل ڈالتا۔

اس وقت سلطان کی فوجیں حیفہ کے سرخ میدان میں خیمہ زن تھیں عمر نے یہ طے کیا کہ وہ امیر عزیز کی سوار فوج کے سات جو بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کی جا رہی تھی جنوب کا سفر کرے گا.......

عمر مغربی سمندر دیکھنا چاہتا تھا...... اس نے اپنی زندگی میں سمندر کا ساحل کبھی نہ دیکھا تھا اور وہ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کی زیارت بھی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ ملک شاہ پر ظاہر کیا۔ اس دوران میں عمر حیفہ نیز ان تمام شہروں کے بازاروں میں جو راستے میں پڑے تھے مشہد کے اس پارچہ فروش کی بے سود تلاش میں مصروف تھا جو ایک نوجوان بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ خفہ سے بہت سے کارواں جنوب کی طرف دمشق جاتے اور وہاں سے مصر کے ریگستان کو عبور کرتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے جنوبی سڑک پر یاسمین کا کچھ پتا مل جائے۔ عمر نے اپنے دل میں کہا کاش مجھے اطلاعات حاصل کرنے کے لیے تو تش کے سے ذرائع حاصل ہوتے۔

''اچھا تم زیارت کے لیے جاؤ تو میرے لیے مسجد اقصیٰ کی محراب میں دعا کرنا'' ملک شاہ نے اسے روانگی کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

نوجوان ترک سلطان نے اس بات کو نہایت مناسب سمجھا کہ وہ خیام جسے خدا نے علم و دانش سے نوازا ہے۔ اس فوجی مہم کے دوران میں زیارت سے مشرف ہو' لیکن اس نے عمر کو اجازت دینے سے قبل یہ احتیاط کری کہ اس عرصے کے لیے جس میں عمر کو باہر رہنا تھا اس سے سعد اور نحس دنوں کا نقشہ بنوایا۔ ملک شاہ کی راس میں مریخ' زحل اور مشتری تینوں ستارے جمع تھے اس لیے اس زمانے میں اہم واقعات پیش آنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ سلطان نے عمر خیام کو سفر پر لے جانے کے لیے شاہی نشان اور نصف درجن حبشی غلاموں کا محافظ دستہ بھی دیا۔

اس دستے کے افسر بمباشی کو سلطان نے یہ حکم دیا کہ اس کے دو آدمی سوتے جاگتے عمر کی حفاظت کریں۔ چنانچہ عمر جہاں بھی جاتا دو مستعد تیر انداز ہمیشہ اس کی حافظت کے لیے ساتھ ہوتے' کیونکہ بمباشی نے اپنے سپاہیوں کو بتا دیا تھا کہ جس شخص کی نگاہ سے عمر اوجھل ہوا اس کا سر اڑا دیا جائے گا۔ لیکن عمر انہیں ایسی ایسی گلیوں میں لے گیا جن کی وہ توقع بھی نہ کر سکتے تھے۔ دمشق سے جہاں اس نے بازار کا

گوشہ گوشہ چھان مارا وہ انہیں لبنان کے چناروں سے ڈھکے ہوئے میدان میں لایا اور وہاں سے ہرمان کی بلند اور چمکدار برف پوش چوٹی کے قریب گزرتا ہوا پھر انہیں ساحل سمندر کی طرف لے آیا۔

عمر گھنٹوں سمندر کے ریتلے ساحل پر ٹہلتا۔ بحری ہوا میں سانس لیتا اور وہ عجیب وغریب اشیاء اٹھا اٹھا کر دیکھتا جنہیں موجیں ساحل پر پھینک دیتی تھیں۔

یہ اسی عظیم سمندر کا ساحل تھا جہاں یونانی اور رومی اپنے بادبانی جہازوں کے ذریعے پہنچے تھے اور جہاں انہوں نے سنگ مرمر کی وہ بندرگاہیں بنائی تھیں جو اب تقریباً ویران پڑی ہیں۔ یہیں طیر کی وہ سرزمین تھی جو دور تک سمندر کے اندر چلی گئی تھی اور اس جگہ سد سکندری تھی جس کی بنیادیں اب تک پانی میں نظر آتی ہیں۔ عمر کوہ قرمل کی ان بلندیوں پر بھی چڑھا جہاں بہت سے عیسائی راہبوں نے حیات وموت کی منزل طے کی تھی۔

اس کے بعد عمر میدانوں کی طرف بڑھا اور پہاڑوں کی اس ڈھلان پر پہنچا جہاں کسی زمانے میں جھیل تھی۔ حبشی غلاموں کے دل میں یہ خیال تھا کہ اس وادی میں زمین کے اندر شیطان دفن ہیں کیونکہ وہاں گندھک کے چشمے ویران محل کی دیواروں کی پچی کاری اور بے بار لیش غم زدہ لوگ نظر آرہے تھے جنہیں یہودی کہا جاتا ہے۔

لیکن جب وہ بیت المقدس پہنچے تو انہیں مانوس ماحول میسر آگیا۔ سلطان کی فوج نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد دیہاتی کافروں کو لوٹا تھا۔ وہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے

روندے ہوئے کھیتوں خانقاہوں کی ان سیاہ دیواروں کے پاس سے گزرے جنہیں لوٹ کر آگ کی نذر کر دیا گیا تھا۔

کبھی کبھی انہیں کچھ عجب قسم کے لوگ نظر آتے...... برہنہ سر مرد اور بچوں کو گود میں لیے ہوئے بے نقاب عورتیں...... یہ لوگ لاشوں کے ڈھیر دفن کرنے کے لیے قبریں بناتے دکھائی دیتے۔

سڑکوں پر انہیں غلاموں کے وہ قافلے ملتے جنہیں تاجروں نے جانب شمال' دمشق پہنچنے کے لیے ترک سپاہیوں سے خریدا تھا۔ اسی وقت عمر کو خراسان کی سڑک پر زونی اور زیرماق کے ساتھ سفر کرنا یاد آ جاتا۔

عمر ملک شاہ کے سپہ سالار امیر عزیز کے خیمے میں ٹھہر گیا کیونکہ اسے بمباشی نے یہ رائے دی کہ رات کے وقت بیت المقدس کے اندر قیام کرنا محفوظ نہ ہوگا۔ بہر حال دن کے وقت عمر مسجد اقصیٰ کی زیارت کرنے گیا جو جنگ کے اثر سے بالکل محفوظ رہی تھی۔

عمر نے دیکھا کہ مسجد کے مرمریں احاطے میں ان ملاؤں کا ہجوم ہے جو فوج کے ساتھ آئے تھے اور جو اب اقصیٰ پر قابض ہو گئے ہیں۔ منبر پر بیٹھا ہوا امام خلیفہ بغداد اور سلطان ملک شاہ کا خطبہ پڑھ رہا ہے۔ مصری مولوی شہر چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ ہجوم سے بچنے کے لیے عمر مسجد کے گنبد میں چلا گیا۔ یہاں کھڑکیوں کے شیشوں پر رنگ ہونے کی وجہ سے کچھ اندھیرا سا تھا اور خاموشی بھی۔ یہاں عمر نے اس پتھر کو بوسہ دیا جو مسلمانوں کے نزدیک سنگ اسود کے بعد سب سے متبرک ہے۔ نیم کافر

حبشی سپاہی بھی اس کے ساتھ احتراماً سجدے میں جھک گئے لیکن وہ گنبد کے مرمریں ستونوں اور سنہری پچی کاری کو بڑے تعجب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

جب عمر سجدے سے اٹھا تو کسی نے آہستہ سے اسے سلام کیا اور کہا "السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ"۔

"وعلیکم السلام" عمر نے جواب دیا۔

اس نے دیکھا کہ حسن بن صباح ایک شخص کو ساتھ لیے ہوئے اس کے قریب ہی کھڑا ہے۔ اس مرتبہ حسن زائروں کا سا لباس پہنے تھا اور اس دفعہ اس نے عربی زبان میں جس میں اسے اتنی ہی مہارت تھی جتنی کہ فارسی میں بات چیت شروع کی۔

اس نے مسکرا کر کہا "الحمد اللہ کہ اس نے مجھے میرے دوست سے پھر ملا دیا۔ کیا تم یہ معلوم کرو گے کہ پتھر کے اس گنبد میں پتھر کے سوا اور کیا ہے"۔

سب لوگ حسن کو دیکھنے لگے۔ حسن میں یہ وصف تھا کہ جب وہ بولتا تھا تو ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ لوگ اس کے اور قریب آ گئے اور اس نے انہیں سمجھانا شروع کیا کہ اس پتھر پر جو نشان ہے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش پا ہے۔ یہ نقش پتھر پر اس وقت بنا تھا جب آنحضرتؐ اس مقام سے عرش پر تشریف لے گئے تھے۔ اور اس پتھر کے کناروں پر جو سوراخ ہیں وہ حضرت جبرائیل کی انگلیوں سے اس وقت بنے تھے جب انہوں نے اس پتھر کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے سے روکا تھا۔ حبشی سپاہی اس معجزے کا ثبوت دیکھنے کے لیے اور قریب آ

گئے اور تعجب سے بلند آوازیں نکالنے لگے۔

حسن نے بتایا کہ ''نیچے وہ غار ہیں جہاں قیامت کے دن روحیں جمع ہوں گی۔ آؤ میرے پیچھے آؤ!''

اس نے ایک چراغ جلایا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسن ہر چیز سے واقف ہے۔ حسن نے ایک مولوی سے اس غار میں اترنے کی اجازت مانگی اور سرگوشی کے انداز میں وہاں کچھ روحانی نشانیوں کی طرف اشارہ کیا۔ حبشی سپاہی جو خود اور زرہ بکتر پہنے تھے خوف زدہ ہو گئے، لیکن حسن کے ساتھی نے جو ایک توانا شخص تھا اور کفتان پہنے تھا عمر سے کہا کہ اس غار میں تو بمشکل بیس سے زیادہ روحیں نہ آسکیں گی تاوقتیکہ وہ ذات سے بھی چھوٹی نہ بن جائیں۔

حسن اس زیارت گاہ کے اندر داخل ہوا۔ وہ چراغ کو ایک ستون کی آڑ میں کیے ہوئے تھا۔ وہ بولا ''عرصہ ہوا کہ اسلام کے ایک خلیفہ نے حضور نبی کریمؐ کے انتقال کے بعد ان الفاظ کو سنہری حرفوں میں لکھوایا تھا۔ سامنے دیکھو!''

اور عمر نے دیکھا کہ خط کوفی میں کوئی عبارت تحریر ہے لیکن وہ اس کو آسانی سے پڑھ نہ سکتا تھا۔ حسن نے یہ عبارت روانی سے پڑھ کر سنائی۔

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کا کوئی شریک ہے...... یقیناً ابن مریم اللہ کے پیغمبر ہیں۔ لہٰذا خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں۔ یاد رکھو اس میں تمہارے لیے بہتری ہے''۔

حسن نے عمر کا شانہ پکڑ کر کہا ''جب یہ الفاظ لکھے گئے ہیں اور انہیں بہت کم

لوگوں نے دیکھا ہے اور پڑھا ہے تو ان سے بھی کم لوگوں نے ہے...... لیکن ان کا مطلب کس نے سمجھا ہے؟ لیکن تم یاد رکھنا اور غالباً تم ان کا مطلب سمجھو گے"۔

پھر حسن بجوس کچھ پریشان سا ہو گیا اور وہاں سے عمر خیام کو لے کر چل دیا۔ وہ اسے شہر کی تنگ گلیوں میں لے گیا۔ حسن راستے میں عمر کو وہ چیزیں دکھاتا جاتا تھا جن پر کسی اور کی نظر نہ پڑتی۔ حسن کا ساتھی ان کے پیچھے پیچھے اپنے خیالات میں غرق چل رہا تھا۔

حسن نے ایک جگہ ٹھہر کر کہا "یہ وہ محراب اور کھڑکی ہے جہاں سے سلطنت روما کے اعلیٰ احکام نے یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں سے اس وقت گفتگو کی تھی جب حضرت عیسیٰ روح اللہ کو دار پر چڑھانے کے لیے سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اب اس پہاڑی کو جس پر صلیب نصب کی گئی تھی عیسائیوں نے بھلا دیا ہے"۔

حسن بن صباح مسلح ترک دستوں کو ہٹاتا اور سڑکوں پر مال غنیمت کے متعلق بحث کرتا جاتا تھا' اس نے مسکرا کر کہا کہ ہمیشہ سے بیت المقدس کا یہ مقدر رہا ہے کہ بادشاہوں کی فوجیں اسکی شہر پناہ کو توڑیں اور اس کے باشندوں کا قتل وخون کریں۔ جی ہاں! تھوڑی ہی مدت میں اور ہمارے آقا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر زندگی میں فارس کے بادشاہوں نے یہودیوں کے اکسانے پر اس شہر کو تباہ کیا اور پھر قیصر روم ہرقل کی فوجوں نے دوبارہ اس شہر کو واپس لے لیا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے یہودیوں کا زبردست کشت وخون کیا۔ ہمارے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ جب اس شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے پر امن طریقہ اختیار کیا اور کشت وخون سے دامن

بچایا۔ حرم کے پتھر کو تم دیکھ چکے ہو انہوں نے اس کو گندگی اور کوڑے کرکٹ سے صاف کیا۔ حقیقت میں یہ وہی پتھر ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے معبد میں لگا ہوا تھا۔ لیکن اب ان ترکوں نے جہالت کے باعث قتل و غارت کی۔ ان کی حکمرانی دیرپا ثابت نہ ہو گی کیونکہ نئے غنیم ان سے یہ شہر چھین لیں گے''۔

اس کے ساتھ نے پوچھا ''کون سے غنیم؟''

حسن بن صباح نے جھنجلا کر جواب ''یہ راز تو غیب کے پردے میں ہے میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں سے بیت المقدس چھن جائے گا۔ جی ہاں! کوئی نیا زبردست غنیم ان سے یہ شہر چھین لے گا۔ کیونکہ انہوں نے یہاں جنگ کی ہے۔ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں۔ یاد رکھو کہ اس میں تمہارے لیے بہتری ہے' لیکن حق بتانے والی تحریر پر کون توجہ کرے گا؟''

اس وقت عمر کے ذہن میں نظام الملک کا جو سلطنت کا تار و پور بنانے میں مصروف تھا اور سلطان ملک شاہ کا خیال آ رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے ننگے سر لوگوں کو اپنے مردے دفن کرتے ہیں یا خانقاہوں کی جلی ہوئی دیواروں کے منظر میں نہیں دیکھے تھے۔ حسن کے پر جوش الفاظ سے وہ بہت متاثر ہوا۔

دوسرے آدمی نے سنجیدگی سے کہا ''ہمیں معلوم ہے کہ انسان تین خداؤں کو مانتے ہیں۔ ایک یہودیوں کا خدا یوحنا ہے۔ دوسرا عیسائیوں کا خدا ہے اور تیسرا قرآن شریف کا اللہ ہے''۔

حسن نے جواب دیا "تین مرتبہ تو نے ایک ہی خدا کا نام لیا ہے۔ اگر ایک ہی خدا کو مانا جائے تو کیا حرج ہے۔ کاش یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کو اس حقیقت کا بھی کچھ ادراک ہوتا کہ اللہ سے بھی بڑی ایک ہستی ہے...... (نعوذ باللہ)"

حسن یکا یک بولتے بولتے رک گیا اور اپنے اردگرد ایک متجسس نظر ڈال کر انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اب کی مرتبہ وہ انہیں پھر حرم کی طرف واپس لے چلا لیکن اس دروازے سے نکلنے کے لیے مڑا جو شرق کی جانب کھلتا تھا۔ وہ اس قبرستان میں پہنچے جو شہر پناہ سے بالکل ملا ہوا تھا یہ راستہ ایک چٹیل وادی کے اندر جاتا تھا اور اسکے قریب ہی ایک خشک نالے کے کنارے سلطان کے سپاہی ان بھیڑ بکریوں کو ہنکا کر لے جا رہے تھے جنہیں وہ دیہات سے لوٹ کر لائے تھے۔ عمر کے محافظ سپاہیوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ بھیڑوں کے گلے کے درمیان سے گزرنا چاہتا تھا آگے بڑھ کر بھیڑوں کو ہٹایا اور راستہ بنانے کی کوشش کی۔ سلطان کی فوج کے سپاہیوں نے عمر کے محافظوں کی وردی دیکھی تو وہ بھی ان کی مدد کرنے لگے۔

حسن بن صباح کے ساتھی نے عمر سے مسکرا کر کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی فوجیں تمہاری غلام ہیں" یہ شخص بھاری جثے کا آدمی تھا اور بھاری بھاری قدموں سے چلتا تھا اس کی آنکھوں سے تجربہ کاری اور چالاکی ٹپکتی تھی۔ وہ جچے تلے انداز میں بولتا تھا اور اس کی باتوں سے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنا محال تھا۔ حسن بن صباح اسے افرونوس کہہ کر پکارتا اور یہ کہا کرتا تھا کہ وہ تمام تاجروں کا دادا ہے۔

حسن نے اپنے ساتھی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ''کیوں نہیں، جب کہ فوجیں سلطان کا حکم مانتی ہیں اور استاد عمر سلطان کو منصوبہ بنا کر دیتا ہے؟ عمر صرف شاہی منجم ہی نہیں بلکہ وہ نوجوان سلجوقی بادشاہ کا خاص مشیر اور پیشین گوئی کرنے والا بھی ہے''۔

افرونوس نے عمر کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے وہ اسے نگاہوں میں تول رہا ہو۔ وہ ایک پتھریلی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ ان کے راستے میں زیتون کے درختوں کا ایک جھنڈ بھی پڑا۔ ان بل کھائے ہوئے درختوں میں انہوں نے ایک عیسائی پادری کی لاش دیکھی۔ پادری سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ صلیب کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور منڈا ہوا سفید سر پتھروں میں چمک رہا تھا۔

حسن نے کہا ''یہ عیسائیوں کی عبادت گاہ معلوم ہوتی ہے جس پہاڑی پر ہم چڑھ رہے ہیں اسے کوہ زیتون کہتے ہیں''۔

شام کے سورج کی کرنیں بے آب وگیاہ پہاڑی پر چمک رہی ہیں یہ تینوں آدمی پہاڑی پر خاموش بیٹھے تھے اور ان کے سامنے وادی میں آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی شکلیں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ دور مسجد اقصیٰ کا مینار سورج کی سنہری شعاعوں میں چمک رہا تھا۔

عمر جانتا تھا کہ اس وادی کا نام وادی جہنم ہے۔ اور مولویوں کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن جب اعمال کا حساب کتاب ہو گا تو جن لوگوں کو جہنم میں جانا ہو گا ان کی روحیں اسی وادی سے گزریں گی۔ نیچے ڈھلان پر اسے عجب شکل کی قبریں دکھائی

دے رہی تھیں ان قبروں پر اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ سورج آگ کے گولے کے مانند سرخ ہو گیا تھا اور بیت المقدس کے میناروں کے قریب ڈوبتا نظر آ رہا تھا۔

ان کے قریب کچھ بوڑھے قطار باندھے آہستہ آہستہ پہاڑی سے وادی میں اتر رہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص اپنے آگے والے کا کپڑا یا کندھا پکڑے ہوئے تھا اور وہ ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کا سر آسمان کی طرف تھا اور کوئی سر جھکائے تھا کیونکہ یہ سب اندھے تھے۔

حسن یکایک چیخ کر بولا دیکھو وہ ہمارا قافلہ جا رہا ہے۔ ہاں ہم آسمان کو دیکھتے ہیں اور اندھی آنکھوں سے زمین کو ٹٹولتے ہیں۔ کاش ہمیں حقیقت کا علم ہو سکتا!"

افرونوسی نے بڑبڑا کر کہا "ہمیں کافی معلومات ہیں"۔

حسن نے سورج کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں وہ بولا "نہیں ہم اندھے ہیں۔ ہمیں صرف گزشتہ کے متعلق علم ہے۔ پرانے پتھروں اور مدفون ہڈیوں کے علاوہ ہمارے نزدیک اور کیا چیز متبرک ہے؟ اگر قرآن شریف کے بتائے ہوئے اللہ سے بھی بڑا کوئی اللہ ہے تو کیا ہو؟" (نعوذ باللہ)

افرنوس خاموش تھا۔ وہ انگلیوں سے اپنی ڈاڑھی میں کنگھی کر رہا تھا اور عمر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ گیند کو دیکھنے میں محو تھا۔ لیکن حسن بن صباح اس وقت تقریر کرنے کے جوش میں تھا۔ وہ ایک نئے خدا پر اعتقاد رکھتا تھا جس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی۔ اس نے کہا کہ ماضی کے تمام مذاہب اس آخری منزل پر پہنچنے کے زینے ہیں۔ کسی حد تک ہر مذہب کے انسانوں کو علم کی روشنی دی ہے اور اسی طرح ان

چھ نبیوں ان بھی جن کے نام آدمؑ نوحؑ ابراہیمؑ موسیٰؑ عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب آجائے جب ساتواں نبی پیدا ہو اور آخری حقیقت کو ظاہر کرے''۔

''لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ نبی ہے؟'' اقرنوس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

یہ معلوم ہو جائے گا کیونکہ ماضی میں جب اس کے ظہور کا وقت نہ تھا وہ ہمارے ساتھ رہ چکا ہے۔ وہ امیر المومنین علی المرتضیٰ کی نسل میں ساتواں امام ہوا ہے اور شیر خدا کے روحانی اوصاف کا وارث ہے۔ کچھ لوگ اسے ساتویں امام اور کچھ اسے نقاب پوش کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ امام غائب مہدیؑ ہے جس کا ہمیں انتظار ہے''۔

سورج شہر کی دیوار اور میناروں کی آڑ میں ڈوب چکا تھا۔ اقرونوس نے ایک سرد آہ بھری۔

حسن نے تقریر کا سلسل جاری رکھا اور کہا کہ ''مہدی اس وقت بھی موجود تھا جب اس سرزمین پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ید بیضا اور روح اللہ نے دم عیسیٰ کے معجزے دکھائے اور وہ پھر آئے گا''۔

پیچھے سے کسی شخص کے چلنے کی آواز آئی۔ عمر کے محافظ سپاہیوں میں سے ایک سپاہی نے جو حسن کی عالمانہ گفتگو کے دوران اونگھتا رہا تھا بے پروائی سے کہا کہ اب خیمے کو واپس چلنے کا وقت آ گیا ہے۔ حسن مسکرایا۔ اس کی طبیعت بھی اب واپس جانے کو چاہ رہی تھی۔ اس نے جواب دیا ''سپاہی خواہ وہ رومی ہو یا ترک۔ آخری

فیصلہ اسی کے ہاتھ میں رہتا ہے''۔

عمر اپنے خیمے میں واپس پہنچا منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا۔ کہیں کوہ زیتون پر اس نے جو دھندلی روشنی دیکھی تھی اسے بہت دیر تک اس کا خیال آتا رہا۔ جب وہ قیلولہ کر رہا تھا تاجر اقرونوس اس کے خیمے میں آیا اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکا سفید ریشم کا ایک تھان سر پر اٹھائے داخل ہوا اور خیام کے قدموں میں ڈال دیا۔

''ایک ناچیز تحفہ'' اقرونوس نے کہا ''اس ملاقات کی یادگار کے طور پر اگر ایک بے بضاعت تاجر عالیجاہ کی کوئی خدمت کر سکتا ہو تو......''

حسن کے متعلق تیری کیا رائے ہے؟

اقرونوس نے اپنی بھوری ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

''دیکھنے میں تو وہ کچھ دیوانہ سا نظر آتا ہے لیکن اس سے زیادہ وسیع معلومات رکھنے والا کوئی دوسرا شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ بہت سے لوگ ہیں جو اس کے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں...... میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ عالیجاہ کسی کے جویا ہیں۔ میں نے کارواں سرائے میں اڑتی ہوئی ایک خبر سنی تھی''۔

''کیا؟''

''کئی مہینے گزرے میں نے سنا تھا کہ مشہد کا ابو زید نامی ایک پارچہ فروش جس نے نیشا پور میں اپنی دوسری شادی رچائی تھی......'' اتنا کہہ کر اس نے عمر کو تجسس کی نظر سے دیکھا۔

''پھر اس کا کیا ہوا؟''

''وہ چند روز حلب میں مقیم رہا پھر شمال کی طرف چلا گیا۔ لیکن اس واقعے کو کئی مہینے گزر رے ہیں''۔

عمر نے ایک گہرا سانس لیا۔ آخر اسے اتنا تو معلوم ہوا کہ یاسمین حلب آئی تھی اور شاید اب کہیں اس کا پتا مل جائے۔

''تو میرے لیے دو تحفے لایا ہے'' عمر نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''اس صلے میں اپنی طرف سے میں تجھے کیا پیش کروں''

''جی میرے لیے آپ کی نوازش ہی کافی ہے'' اقرونوس نے ذرا تامل کیا۔

''البتہ آپ ذرا حسن کا خیال رکھیں۔ وہ ہمیشہ آپ کا دوست رہے گا۔ ممکن ہے کسی وقت اسے آپ کے دامن فیض سے مستفید ہونے کی ضرورت پیش آ جائے''۔

جب تاجر سلام کر کے رخصت ہو گیا تو عمر کے دماغ مں بھولی بسری یادیں ابھر آئیں۔ وہ اٹھ کر نظام الملک کے خطوط کے صندوقچے تک گیا اور اس میں سے ایک خط نکال کر غور سے پڑھنے لا۔ جس میں اسے ایک ملحد جماعت کے فتنے سے خبردار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وزیر مختار نے اپنے بلیغ انداز میں لکھا تھا ''یہ لوگ ایک مہدی کے ظہور کی تبلیغ کرتے ہیں جو اسلام کے قوانین اور تمام موجودہ بادشاہوں کا خاتمہ کر دے گا اور وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ان کا مذہب دنیا کا ساتواں اور آخری مذہب ہے۔ وہ اس مردود کے پردوں میں پوشیدہ طور پر تبلیغ کر رہے ہیں جس نے اپنے آپ کو خراسان کا نقاب پوش مشہور کر رکھا ہے۔ جب یہ دشمنان دین اپنے قبیح جھوٹ کا پرچار کرتے ہیں تو سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ خدا ان خبیثوں کو دائمی عذاب

میں مبتلا رکھے"۔

عمر نے سفید ریشم کے تھان پر ایک نظر ڈالی اور مسکرا دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کپڑے کو نظام الملک نے تو حالت غیظ و غضب میں بھی نذر آتش کر دیا ہوتا لیکن عمر نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس کی ایک نفیس عبا تیار کرائے گا۔

مغرب کی نماز کے وقت حلب کی جامع مسجد میں حوض کے کنارے درویشوں کا ایک حلقہ۔

چھ درویش اونی کمبل اوڑھے حوض کے کنارے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک کوزہ پشت بھی چیتھڑوں میں لپٹا تھا۔ اپنی لکڑی کے سہارے جھکا ہوا کوزہ پشت اپنے قریب سے گزرنے والوں کے سامنے اپنا ٹیڑھا ہاتھ پھیلا کر خدا کے نام پر مانگ رہا تھا۔ لوگ ڈھیلی ڈھالی عبائیں پہنے اپنی ابھری ہوئی خورجیاں یا صندوق اٹھائے اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ نقاب پوش عورتیں ایک دوسرے کے کانوں میں چپکے چپکے اپنے سودے سلف کی باتیں کرتی ہوئی آ جا رہی تھیں۔ کمسن لڑکیاں اپنے شیر خوار بھائیوں اور بہنوں کو اپنی لچکیلی کمروں پر اٹھائے لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک مال دار عرب ایک خچر پر سوار چلا آ رہا تھا۔ خچر کے گلے کی گھنٹیاں بجتی جا رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں میں سکے لیے انہیں شمار کر رہا تھا۔

"میں مصیبت زدہ ہوں" کوزہ پشت نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں زور سے کہا "مصیبت زدہ پر رحم کرو، خدا کے نام پر......"

"نوحہ گر! کرائے کا رونے والا!" عرب نے بڑبڑاتے ہوئے ایک سکہ مضبوط

کشکول میں ڈال دیا اور بٹوا زین میں اڑس لیا۔

''یا ہو! یا حق! رحم کرو۔ بیماروں کو اللہ کے نام پر دو''۔

''تو مسجد میں جا کر کیوں نہیں بیٹھتا'' ''ایک ملا بڑبڑایا۔ جس کی عبا زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی۔

میں ایک ایسی ہستی کے لیے بھیک مانگ رہا ہوں جو نان شبینہ کا محتاج ہے'' وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن فوراً ہی ایک عورت کوزہ پشت کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس کی بغل میں ایک گٹھڑی تھی۔ ''یہ لیجیے'' اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس گٹھڑی سے نکال کر کوزہ پشت کو دیتے ہوئے کہا ''یہ اس درویش کی خدمت میں حاضر ہے جو خشوع و خضوع سے آہ و زاری کرتا ہے''۔ (تمام عورتیں یہ سمجھتی تھیں کہ سب درویش دنیا والوں کے گناہ بخشوانے کے لیے خدا کے سامنے آہ و زاری کرتے ہیں)۔

''ہاں یہ اس کے لیے ہے جس نے خون کے آنسو بہانے ہیں'' کبڑے نے روٹی کا ٹکڑا لیتے ہوئے کہا۔

ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار بھاری نقرئی کام کا خلعت پہنے عمر خیام جو سلطان کے دربار سے واپس گزر رہا تھا ادھر سے گزرا۔

''میرے آقا!'' کوزہ پشت نے اس کی طرف دوڑتے ہوئے چلا کر کہا۔

جب اس نے رکاب پکڑی تو اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

''ٹھہر جائیے میں دو سال دس ماہ سے حضور کو تلاش کر رہا ہوں''۔

اس مضطرب چہرے کی طرف جھک کر دیکھتے ہوئے عمر کو یاد آیا کہ یہ وہی شاہی

مسخرا ہے جو ایک بار چشمے کے پانی میں چاند کا عکس دیکھ کر اس کے ڈوب جانے پر

رویا تھا ''جعفرک'' بے ساختہ عمر کی زبان سے نکلا۔ وہ اسکے پھٹے ہوئے کپڑوں اور

سفید گدھے کی عدم موجودگی پر حیران سا ہو رہا تھا۔

''جعفرک! تیرا یہ حال ہو گیا ہے تو اب درویشوں اور فقیروں کے ساتھ رہتا

ہے۔ تو نے مجھے یاد کرنے میں اتنی دیر کیوں کی؟''

''آپ کی یاد؟''

''بے شک طائی بازو بند آپ کے مکان پر پہنچا کر......میں......واپس چلا آیا

اور مہینوں انتظار کرتا رہا پہلے تو وہ خوب تندرست ہو گئی۔ کبھی کبھی ہنستی تھی۔ میں ضرور

اسے آپ کے گھر لے آتا لیکن ایک بیوقوف مسخرا ایک حسین عورت کو ساتھ لے کر

اتنا لمبا سفر کس طرح کر سکتا تھا؟ پھر ہمارے پاس ایک پیسہ بھی تو نہ تھا۔ اور اسے

یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ کیا آپ نے یاسمین کو فراموش کر دیا؟''

عمر نے اس کا دبلا پتلا بازو پکڑ لیا ''کیا وہ یہاں ہے......اس وقت؟''

''میں اس کے لیے بھیک مانگتا ہوں جعفرک نے روٹی کا ٹکڑا دکھاتے ہوئے

کہا۔

''وہ ہر شام مجھ سے پوچھتی ہے کہ عالیجاہ کی تشریف آوری کی کوئی اطلاع تو

نہیں آئی''۔

مجھے اس کے پاس لے چل

لگام پکڑ کر جعفرک اس انبوہ میں سے گھوڑے کو نکال کر ایک گلی میں لے آیا وہ

پاؤں گھسیٹتا ہوا ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن روٹی کا ٹکڑا بدستور اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ اف بیماری کے عفریت نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اوپر کی طرف سر اٹھا کر اس نے کہا تھوڑی دیر انتظار کرنا عالیجاہ کو ناگوار تو نہ ہوگا؟ بس ذرا سی دیر۔ میں جا کر اسے مطلع کروں کہ اللہ نے کیا کرشمہ دکھایا ہے"۔

جب جعفرک ایک لوہار کی دکان کے برابر والے دروازے میں غائب ہو گیا تو عمر گھوڑے پر سے اتر پڑا اور گھوڑے کے شانے کی طرف جھکتے ہوئے اس نے خود بخود کہا کہ یاسمین اس سڑک کے اوپر والے کمرے میں موجود ہے۔ آ کر کار جب جعفرک نیچے اتر آیا تو مسخرے نے مسکراتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرے۔

"اوہو کیا افراط وتفریط ہے۔ یا تو اتنے زمانے تک ایک معصوم فاختہ خاموش تھی یا اب یہ عالم ہے کہ پھڑ پھڑ رہی ہے۔ کپڑوں میں بسانے کے لیے عطر چاہیے۔ ہاتھوں میں رچانے کے لیے مہندی اور آنکھوں میں سرمہ لگانے کے لیے پریشان ہے اور کہہ رہی ہے کہ میں عالی جاہ سے عرض کر دوں کہ پہننے کے لیے اس کے پاس ریشمی کپڑے نہیں ہیں......"

"کیا وہ مجھ سے ملنے کو تیار ہے؟ میں اوپر جا سکتا ہوں؟"

اندھیرے میں زینے میں پتھریلی سیڑھیوں پر ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرتا ہوا وہ درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا چلا گیا جہاں دھندلی دھندلی شکلیں اسے غور سے دیکھ رہی تھیں حتیٰ کہ وہ چھت پر پہنچ گیا جہاں سنگتروں اور گیلے کپڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

ایک کونے میں چھپر کے نیچے میلے کچیلے گدے پر یاسمین لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے صرف اس کی آنکھوں سے پہچان لیا۔

''میری جان آرزو''عمر نے گھٹنوں کے بل جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''میرے آقا تم کتنے شاندار نظر آرہے ہو...... ہائے میرے پاس تو ٹاٹ کا ایک بوسیدہ ٹکڑا بھی نہیں کہ تمہیں اس پر بٹھا سکوں......''اس کا سانس پھول کر حلق میں اٹک گیا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے بازو عمر کی گردن میں حمائل کر دیے عمر نے یاسمین کے رخساروں پر گرم گرم آنسو محسوس کیے۔

جب یاسمین کا دل ذرا ٹھہرا تو وہ کھسک کر عمر کے پہلو میں اور زیادہ پیوست ہوگئی اور عمر نے دیکھا کہ اسکا چہرہ ست کس قدر پیلا پڑ گیا ہے۔ صرف اس کی زلفوں کی خوشبو اور سیاہ آنکھیں جو محبت سے بھرپور ہیں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔

''جب میں بیمار تھی تو میں ستاروں کو اوپر آتے اور گزرتے دیکھتی رہتی تھی''۔

اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا''کیوں کہ وہی ستارے تو تھے جو''بیت النجوم'' کے اوپر نظر آتے تھے...... کیا پردے پر اژدھے کی تصویر اب بھی وہاں موجود ہے ہاں''۔

''جان جاں میں آج بھی کمرے کی ہر چیز کو تصور میں دیکھ سکتی ہوں...... کیا سب چیزیں ویسی ہی ہیں؟''

ہر چیز اپنی جگہ موجود ہے اور تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

یاسمین نے پھریری لیتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا''میں بھی یہی سمجھتی تھی لیکن

میں ستاروں کے نام یاد نہیں رکھ سکی۔ بجز جوزا اور ایک دو اور ستاروں کے"۔

جعفرک نے مجھے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں ہیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے آقائے ولی نعمت سلطان کے دربار میں بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو......

تمہاری آستین پر کس قدر خوبصورت نقرئی کام بنا ہوا ہے"۔

"میں تیرے لیے خطائی ریشم کے کپڑے لاؤں گا اور زرکار پاپوش" اور ادرک کی مٹھائی بھی"۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "نہیں نہیں ہمیں عمدہ قسم کی ضیافت کرنی چاہیے اور اس میں پینے کے لیے شربت بھی ہوں"۔

"تیرے ہونٹوں کی شراب بھی"۔

یاسمین نے شرماتے ہوئے عمر کے رخساروں کو چھوا اور بڑی پیاری نظروں سے اس کے نفیس کیمخت کے بنے ہوئے گھڑسواری کے جوتوں کو دیکھا "کاش میں تندرست ہوتی۔ میں جب یہ سوچتی ہوں تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ واللہ تیری کنیز اپنی خوبصورتی کھو چکی ہے"۔

"میری محبوبہ! تو اب پہلے سے بھی حسین ہے"

"اس نے بے اختیار اپنی انگلیاں عمر کے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ جن کو عمر نے چوم لیا لیکن اس نے توجہ بھی نہ کی "اچھا یہ بتاؤ...... ذرا میری طرف دیکھا چپ چاپ۔

کیا تم نے دوسری شادی کر لی ہے اور تمہاری وہ بیوی ستاروں والے محل والے میرے کمرے میں سوتی ہے؟"

عمر نے نفی میں سر ہلایا اور وہ مطمئن ہو گئی "میں بہت دفعہ یہ سوچ کر حیران ہو چکی

ہوں اور سنو جب میری شادی ہوئی تو میرا دماغ جل اٹھا اور میں نے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ جب...... جب ابوزید نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا میں دل برداشتہ ہو گئی اور پھر مجھے بخار آ گیا...... مجھے بند محملوں میں بٹھا کر ادھر ادھر سفر کراتے رہے۔ خدا جانے میں کہاں کہاں گئی۔ کوہستانی علاقے کی ایک سرائے میں میں نے کبڑے جعفر کو دیکھا جس پر مجھے ترس آیا میں نے جلدی سے اسے نقشین نقرئی بازو بند دیا اور خوشامد درآمد کر کے اسے راضی کر لیا کہ وہ تمہارے پاس نیشاپور میرا پیغام لے کر جائے جہاں وہ جا رہا تھا۔ لیکن یہاں حلب میں میرا خاوند مجھ سے خفا ہو گیا اور اس نے کہا کہ اس کی توہین کی ہے۔ اس کا مذاق اڑایا ہے۔ اس نے گھر سے باہر جا کر چار گواہوں کی موجودگی میں مجھے طلاق دے دی۔ کیونکہ میں بیمار تھی بد دماغ تھی۔ اس کے بعد وہ چلا گیا......"۔

"مجھے بازو بند یا تیرے پیغام کا کچھ علم نہیں ہے" عمر نے اس کے کان میں چپکے سے کہا۔

"لیکن اب میں ایک مطلقہ عورت ہوں......"

"نہیں نہیں عمر نے قہقہہ لگایا...... تم تو وہ دوشیزہ ہو جس کی اب شادی ہونے والی ہے...... میری حور! بس ایک گھنٹہ اور گزرے گا اور تو میری ہو جائے گی"۔

اس حور کے پاس نہ دولت ہے نہ حسن۔

تاہم اس تصور سے اس کا چہرہ سرخی سے دمکنے لگا اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ عمر کے جانے کے بعد وہ گدے پر لیٹ گئی۔ اس کے تمام جسم میں درد ہو رہا

تھا۔

نیچے سڑک پر پہنچ کر عمر نے جعفرک کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام لی۔ ''میں قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں'' اس نے کہا ''تا کہ میں یاسمین کو اپنے حبالہ نکاح میں لے لوں آج ہی شام تک...... تم حلوائی کی دکان پر جاؤ...... لو یہ بٹوا لو۔ مٹھائیاں اور حلوا خوان میں چن کر لے آؤ اور شربت بھی اور سرخ شراب بھی۔ محلے کے تمام لوگوں کو اس تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دو اور ہاں۔ باجے والوں کو بھی لاؤ۔ اور شمع برداروں کو بھی...... چھت پر روشنی کا انتظام کرو...... خدا کے لیے اس میں کوئی تساہل نہ ہونے پائے''۔ وہ لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور چل دیا۔ اس نے حیرت سے تکتے ہوئے چہروں اور فقیروں کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔

''مومنو'' جعفرک نے نقدی اوپر اٹھاتے ہوئے پکار کر کہا...... ''مومنو آؤ یہاں دعوت عام ہے''۔

نقاب پوش یاسمین کی موجودگی کے قوی احساس کے ساتھ عمر نے قاضی کی خشک آواز کو سنا جو اس کے قریب قالین پر بیٹھا ہوا تھا...... ''ایک کتب فروش کی دختر اور اس کا جہیز کیا طے ہوا ہے؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کون کون سی املاک وہ تمہارے سپرد کرنا چاہتی ہے''۔

قاضی کی پشت پر بیٹھا ہوا کاتب شادی کی شرائط لکھتا جا رہا تھا۔

''املاک'' عمر مسکرایا۔ زلفیں اتنی سیاہ جیسے کالی آندھی' کمر اتنی خوبصورت جیسے

سرونودمیدہ...... اور دل جو محبت کے علاوہ ہر چیز سے نا آشنا ہے۔ اس سے زیادہ اور کوئی چیز مجھے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا جلدی کیجیے۔

''لکھو قابل اعتنا قیمت کی کوئی چیز نہیں''۔ قاضی نے کاتب ہو ہدایت کی ''اور اب یہ فرمائیے عالیجاہ کہ اسے کای عنایت فرمائیں گے''۔

''ہر چیز جو میرے پاس ہے''۔

قاضی نے دست بدست عرض کیا ''کیا عالیجاہ اس امر پر توجہ فرمائیں گے کہ ہمیں معقول شرائط نکاح نامہ میں درج کرنی ہیں'' ہر چیز قانون کی رو سے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہمیں تفصیل درج کرنی ہوگی یعنی کتنی زمین اور وہ کہاں واقع ہے۔ اس پر کیا عمارت بنی ہوئی ہے۔ حقوق آب پاشی، حقوق ماہی گیری اوران کی تخمینی قیمت۔ اکے علاوہ اشیاء منقولہ کی تفصیل بھی درکار ہے یعنی کپڑے کے تھان ہیں۔ مشکل کے قطاروں کی تعداد اونٹوں کا شماراوران کی جائے قیام سفید باز سیاہ سیمور، دندان ماہی جن پر ہاتھی دانت کا کام کیا جس کے غلاموں کی تعداد اوران کی قیمت کا تخمینہ......''

''لکھو قابل اعتنا قیمت کی ہر چیز۔ عمر نے پیچھے مڑ کر کاتب کو ہدایت کی۔

قاضی نے جوش میں آ کر اپنے ہاتھ بلند کیے۔ ''بہ ریش پدر! رب کعبہ! شرائط نکاح کے سلسلے میں آج تک اس قسم کی باتیں کسی ن کاہے کو سنی ہوں گی۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کی شرائط سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

پیچھے مڑ کر عمر نے طشت میں سے ایک مٹھی بھر اشرفیاں جو اس نے غلام نے وہاں

لا کر رکھی تھیں۔ ایک ایک کر کے اس نے اشرفیاں قاضی کے منہ میں رکھیں۔ اس کے بعد وہ مٹھی اشرفیاں گواہوں کی گودوں میں ڈال دیں جو اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور کاتب کے ہاتھ سے نکاح نامہ لے کر اس پر گواہوں کے دستخط کرائے۔ قالین پر بیٹھے ہوئے حاضرین نے مرحبا کی صدائیں بلند کیں۔

''تیرے الفاظ سونے کی طرح قیمتی ہیں'' اس نے قاضی سے کہا جو کھانستا جا رہا تھا۔ اور ایک پالتو جانور کی طرح جوش عقیدت سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''آج سے پہلے ایسے سنہری الفاظ کس کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اب نکاح کی تقریب انجام پا چکی ہے۔ شادیانے بجاؤ۔ حاضرین! اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ عمر خیام نے آج کی رات ایک دوشیزہ سے نکاح کیا ہے۔''

اٹھ کر وہ چھت کی منڈیر کی طرف گیا اور جھک کر سڑک کو دیکھا جو روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ اور جہاں فقیر درویش اور محلے کے بچے جمع تھے۔ شہنائی بج رہی تھی۔ نے نواز ایک محبت کا نغمہ گا رہے تھے۔ اور شادیانوں کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی۔

''لوگو'' عمر نے چلا کر کہا ''پیٹ بھر کر کھاؤ اور جب مٹھائی ختم ہو جائے تو حلوائی کو بھی کھا جانا بتاؤ تم میں سے کون ایسا ہے جو خوش نہیں ہے''۔

''نہیں آقائے عمر ہم سب بہت خوش ہیں''۔

''کس کس کو برنج شیرینی اور شربت نہیں ملا؟''

''اللہ کی قسم کوئی بھی شخص ایسا باقی نہیں رہا''۔

''اس کے باوجود تم لوگ غریب اور مصیبت زدہ ہو آج کی رات عمر خیام سے

زیادہ مال دار کوئی نہیں ہے۔ اس کی دولت کا کوئی شمار نہیں اور نہ کوئی خیام سے زیادہ نشے میں چور ہے۔ کیونکہ اس نے آج جنت کی شراب پی ہے۔ پھر تم بھی غنی ہو جاؤ۔ طشت میں سے اشرفیاں سڑک پر الٹ دو' اس نے اپنے تحویل دار کو حکم دیا۔

''آقا...... پورا طشت؟''

پیتل کا لمبا چوڑا طشت اس نے چھین کر عمر نے سڑک پر الٹ دیا۔ مجمع سے اطمینان اور خوشی کا شور بلند ہوا۔ بچے گرد و غبار میں اٹ گئے اور عورتیں زمین پر گھٹنے ٹیک کر چمک دار سکے چننے لگیں۔

عمر نے یاسمین کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ جس نے اپنی لرزتی ہوئی بانہیں عمر کی گردن میں حمائل کر دیں۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ہوا سڑک پر آ گیا جہاں ایک پالکی ان کا انتظار کر رہی تھی اور بڑی احتیاط سے اس نے یاسمین کو نرم گدوں پر لٹا دیا۔ عمر نے یہ پالکی مع دو خواجہ سراؤں کے اپنے دوست عزیز سے عارضی طور پر مستعار لی تھی۔

''میری پیاری دلہن'' عمر نے یاسمین کے کان میں کہا۔

''آج سے تو ہمیشہ کے لیے میری ہے''۔

خواجہ سراؤں نے پالکی کے دروازے بند کر دیے اور لوگوں کا وہ جم غفیر جن کے ساتھ یاسمین نے غربت و افلاس کے کتنے ہی مہینے گزارے تھے۔ ایک امیر کبیر کی دلہن کے محافے سے الگ ہٹ گیا۔

''الحمد اللہ'' انہوں نے یک زبان ہو کر شور مچایا تعریف ہو آقائے دانش کی جس

نے ہمیں اشرفیاں عطا کی ہیں خیام مرحبا''۔

''کوئی ہے ایسا امیر کبیر جیسا کہ باب خطا سے آنے والے عالیجاہ امیر عمر'' ایک درویش نے چلا کر کہا۔

''ایک بھی نہیں'' دوسرا درویش چلایا ''سلامتی ہو اس پر''۔

''خدا اس کا راستہ ہمیشہ صاف رکھے''۔

ایک چھوٹی سی لڑکی گلاب کی پتیاں ایک ٹوکری میں بھرے ہوئے مجمع میں سے دوڑتی ہوئی آئی اور ان پتیوں کو عمر کے گھوڑے کے سموں پر نچھاور کرنے لگی۔

''کس طرف'' ایک خواجہ سرا نے عمر سے عرض کیا! کیا سلطان کا منظور نظر رہنمائی کی تکلیف گوارا کرے گا؟''

''بازار کی طرف''۔

''لیکن بازار بند ہو چکا ہے۔ عصر کی نماز کے بعد سے بند ہے''۔

''اچھا'' عمر نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا ''اب ذرا جلدی کرو''۔

لمبے تڑنگے سیاہ فام غلام پالکی اٹھائے تھے۔ خواجہ سرا نے جعفر ک سے کہا کہ شاید امیر اس وقت نشے میں ہے۔

''تجھے ایسی شراب سے سرشار ہونا زندگی بھر نصیب نہ ہوگا''۔

جعفر ک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

قریبی بازار کے دروازے پر انہوں نے ایک عون ہاشی کو مع نصب درجن نیزہ بازوں کے تعینات پایا اسکے ہاتھ میں ایک چینی قندیل تھی۔ عون ہاشی نے شان

دار پالکی اور خواجہ سراؤں پر نظر ڈالتے ہوئے جو بہت عمدہ لباس پہنے ہوئے تھے عمر کو بڑے ادب کے ساتھ سلام کیا۔

"نہیں عالیجاہ" اس نے عمر کو آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"یہ دروازہ رات کے وقت سلطان کے حکم سے بند رہتا ہے"۔

سلطان کی عنایت ونوازش سے آج کی رات میرے لیے کوئی چیز بند نہیں" عمر مسکرایا "لو یہ انگوٹھی بطور ثبوت اپنے پاس رکھو کہ میں نے تمہیں دروازہ کھولنے کی اجازت دی تھی۔ جلدی کرو"۔

"ارے کمبخت' کیا تو شاہی منجم کو اتنی دیر منتظر رکھے گا"۔

جعفرک نے چلا کر افسر کو کہا۔

دس سواروں نے افسر سے انگوٹھی لے لی اور مشکوک انداز میں سر ہلایا۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا اور اپنے ماتحتوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا جیسے ہی دروازہ کھلا ایک باریش شخص جس کے سر پر سیاہ ٹوپی تھی چپکے سے پالکی کے پیچھے پیچھے بازار کی محراب دار چھت میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ باریش شخص بڑی تیزی سے عمر کی رکاب پکڑنے کے لیے دوڑا یا خواجہ اس نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا "ادھر تشریف لائیے اس طرف"۔

زراق کی دکان پر ختن کا ریشمی کپڑا زبرجد کے آویزے ملاحظہ فرمائیے۔ زراق کے یہاں سونے میں جڑے ہوئے ایسے نفیس لعل اور یاقوت ہیں جیسے کسی حور کے

لبوں کی سرخی کیا امیر دانش چاندی کے جڑاؤ لاجورد خریدنا پسند فرمائیں گے اور مرمریں پیالے صدفی طشت......؟"

ایک دوسرا باریش آدمی تیزی سے آگے بڑھا۔ دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ "اے غریبوں کے والی ادھر جانے کی تکلیف نہ فرمایئے۔ زراق کی دکان کا تمام سامان یہاں تیار ہوتا ہے بازار حلب کی پشت کی دکانوں پر...... اسے کیا معلوم زبرجد اور سنگریزے میں کیا فرق ہے۔ اس جانب زحمت فرمایئے۔ اپنے غلام شولم اطاکی کی دکان کی طرف۔ اسی ہفتے میرے یہاں زربفت کے تھان آئے ہیں۔ دمشقی زربفت کے جس پر موتی ٹنکے ہوئے ہیں......"

ایک تیسرے تاجر نے جس کا سانس بھی پھولا ہوا تھا۔ عمر کی رکاب ہلاتے ہوئے کہا "کافر کتو یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ گندہ دہنو تمہیں معلوم نہیں کہ عالی مرتبت امیر کو اپنی دلہن کی بلوریں گردن کے لیے قیمتی جواہرات کی ضرورت ہے؟ اس جانب آقا اپنے غلام بسطام کی دکان پر تشریف لائیے جو سچا مسلمان اور سید زادہ ہے"۔

"اے وزوان شب؟" عمر نے چیخ کر کہا "میں ہر چیز خریدوں گا اور اس کی قیمت سلطان بہ نفس نفیس عنایت فرمائیں گے کیونکہ آج کی رات دوبارہ آنے والی نہیں......"

رات پلک جھپکتے بیت گئی گرمی کا موسم آدھا گزر چکا تھا اور گرمی شباب پر تھی۔ عمر خیمے کے دروازے پر لیٹا یاسمین کے بالوں سے کھیل رہا تھا اور بار بار انہیں اپنی

انگلیوں میں لپیٹ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک بار پھر زندگی عود کر آئی تھی۔ رات کی سنسناہٹ اب کچھ معنی رکھتی تھی۔ گزشتہ تین سال کی طویل مدت اس سایے کی طرح معدوم ہو چکی تھی جو سمندر کی سطح سے بلند ہو کر پھر سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

ستاروں کی دودھیا روشنی میں یاسمین کا صاف شفاف بازو اس کے پہلو میں چمک رہا تھا یاسمین کے سینے پر پڑی ہوئی چادر اس کے تنفس کے ساتھ ساتھ بلند و پشت ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ساج (۱) کی رچی ہوئی خوشبو خیمے کی اندرونی فضا کو مہکا رہی تھی۔

''میرے دل کی ملکہ تجھے ابھی نیند نہیں آئی'' اس نے یاسمین کے کان میں کہا۔

وہ بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ آنے والے دن کی خنک ہوا خیمے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اب وہ سوئے گی۔ یاسمین نے عمر کی طرف کروٹ لی 'میں بے حد خوش ہوں'' اس نے بہت نحیف آواز میں کہا '' اور اس سے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے...... میں اپنی خوشی کا اندازہ لگا رہی ہوں کیوں؟ ایسا کرنے میں کوئی حرج تو نہیں''۔

''اگ ایسا کرنا غلط ہے تو میں بھی بڑا گنہگار ہوں دوزخی''۔

''ہشت'' اس نے اپنی انگلیاں خیام کے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے میری آنکھ اکثر اس وقت کھل جاتی تھی جب تارے ڈوب رہے ہوتے تھے دل تجھے یاد کر کے تڑپ اٹھتا تھا۔ میرے محبوب...... ایسے وقت اپنے دل نواز سے دور ہونا کس قدر ستم انگیز ہے۔ اور اس وقت میرا دل اس خوف سے دھک دھک کر رہا ہے

کہ خدا نے کرے تو پھر مجھ سے جدا ہو جائے‘‘۔

’’نہیں نہیں ہم دونوں نیشاپور جائیں گے۔ بیت النجوم میں۔ میں سلطان سے واپس جانے کی اجازت طلب کروں گا‘‘۔

’’ایسا کرنے کی بھلا تمہیں جرات کیسے ہوگی؟‘ پھر وہ خود ہی ہنسنے لگی ’’میں بھول ہی گئی تھی کہ تم ایک صاحب اقتدار شخص ہو۔ اے ہے تم میرے لیے کتنے کپڑے اور قیمتی سامان بازار سے خرید لائے ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھکارن سے ایک دم شہزادی بن گئی ہوں‘‘۔

’’تو میری زندگی ہے تین سال سے میری روح بیمار تھی‘‘۔

’’میں سمجھتی ہوں تمہاری روح بڑی مردانہ ہے‘‘۔ وہ خاموش ہو کر پھر کچھ سوچنے لگی۔ ’’کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے...... میں...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں تم سے اس وقت سے محبت کرتی ہوں جب تم کتب فروشوں کی گلی میں آتے جاتے تھے اور شروع میں...... نہیں مہینوں تک مجھ پر ایک پریشانی طاری رہی میرے محبوب...... مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس خیال سے مجھے خوف آتا تھا کہ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ لوگوں کا ایک ایک لفظ مجھے کس قدر اذیت پہنچاتا تھا؟ تم اندازہ نہیں کر سکتے...... اور کچھ دن بعد تمہاری یاد کے سوا میں نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ جب تم میرے ساتھ ہوتے تھے تو مجھ پر ایک جادو سا ہو جاتا تھا۔ اور جب میں تم سے الگ ہوتی تھی تو میرا تمام جسم کرب و اضطراب کی آماج گاہ بن کر رہ جاتا تھا۔

آسمان کی سیاہی آہستہ آہستہ سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھی اور خیمے کی اجلی دیواریں اپنی اصلی شکل اختیار کر رہی تھیں۔

''وہ دن اب بیت گئے'' عمر نے کہا۔

وہ اس کی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا اور اس کی شفاف جلد کے پھیکے پن کو بھی۔ وہ سب کچھ گزر گیا بجز اس درد کے۔

''کیا؟'' عمر نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے کہا ''تجھے اب کس بات کا رنج ہے میری جان؟ دیکھ شمشیر سحر نے رات کا سیاہ پردہ تار تار کر دیا ہے۔ اور ہم ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ اے میرے دل کی شیرینی اب کوئی غم نہ کر! یہ ہماری محبت کی سحر ہے۔ اس سے جی بھر کے لطف اٹھا۔ یہ ہماری اپنی ہے اور وہ تمام صبحیں جو اس کے بعد آئیں گے ایسی حسین نہ ہوں گی''۔

سچ کہتے ہو ایسی نہ ہوں گی'' ۔وہ مسکرائی۔

''اور تمام لوگ جو ابھی تک محو خواب ہیں۔ اس بات کو کیا جانیں۔ دیکھ آفتاب کی پہلی کرن سلطان کے خیمے کو بوسہ دے رہی ہے۔ مجھے غسل کر کے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہیے تاکہ ہم اس پڑاؤ سے روانہ ہو سکیں''۔

''نہیں! جان جان! ذرا توقف کرو چند لمحوں کے لیے تاکہ میں تمہارے چہرے پر دن کی روشنی کا عکس دیکھ سکوں''۔

عمر جانے کے لیے بیتاب تھا جیسے ہی ملک شاہ نے اسے نیشاپور جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اس نے سفر کے لیے محافظوں کا ایک دستہ منتخب کیا۔ اور اونٹ

بار کرا دیے۔ جتنے عرصے میں اس کے غلام بوروں میں سامان بند کریں عمر نے یاسمین کے لیے ایک پردہ دار محمل ڈھونڈ نکالا جسے دو گھوڑوں پر کسا جا سکے۔ اس نے جعفرت کے لیے ایک سفید گدھا بھی خرید لیا۔

"جعفرک اب تجھے بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئے گی"۔ عمر نے ایک قہقہہ لگایا۔

مسخرے نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا حضور آپ کو ایک بات یاد دلانے کی اجازت چاہتا ہوں آپ رستم کی طرح طاقت ور ہیں لیکن یاسمین بہت کمزور ہے۔ وہ اس خوشی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔

"تو ایک دانش مند بیوقوف ہے"۔

"نہیں حضور میں تو ایک لنگڑا لولا ہوں" جس نے درد و کرب کی چاشنی چکھی ہے وہی ایک عورت کے احساسات کا اندازہ کر سکتا ہے۔

لیکن دن ڈھلے سفر پر روانہ ہوتے وقت جب بڑے بڑے امیر گھوڑوں پر سوار ہو کر عمر خیام کو کچھ دور پہنچانے آئے تو جعفرک اپنے گدھے پر چڑھ کر آگے آگے ہو لیا۔

"اے امرائے نامدار"۔ اس نے پیچھے مڑ کر زور سے کہا "صرف ایک احمق انسان ہی شمشیر کے آگے چل سکتا ہے"۔

اس رات یاسمین کو پہلے تو سردی لگی اور اس کے بعد تیز بخار ہو گیا۔ اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا لیکن جب عمر پریشان ہونے لگا تو وہ مسکرائی۔

''اصل میں مجھ سے خوشی برداشت نہ ہو سکی۔ میں بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی''۔

دوسری رات وہ دریائے فرات کے کنارے ٹھہرے اور تمرس کی جھاڑیوں سے گھرے ہوئے ایک قطعے میں بلند ڈھال پر اپنے خیمے نصب کیے۔ دوسرے دن صبح کو وہ ان کشتیوں پر دریا عبور کر سکتے تھے جو قافلوں کو دریا پار کرانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یاسمین کئی چادروں میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے رخسار تمتمائے ہوئے تھے۔ عمر جب خیمے میں کسی ضرورت سے ادھر ادھر چلتا پھرتا تو یاسمین کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں حالانکہ اسے اپنی گردن موڑنے میں تکلیف ہوتی تھی۔

''دیکھو تو ـــ میں کیسی بدقسمت بیوی ہوں'' اس نے دھیمی آواز میں کہا ''میرا سرتاج میری خدمت کر رہا ہے اور میں لیٹی ہوں۔ میری شادی کے موقع پر خریدی ہوئی کچھ قیمتی اشیاء مجھے دکھاؤ''۔

اسے خوش کرنے کے لیے عمر نے پھول دار شالیں اور موتی ٹکے نقاب اور اس کی مسہری کے پاس لے گیا۔ اس نے بڑی بے خیالی سے ان پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ عمر نے ایک چاندی کی تاج نما کلاہ دکھائی جس کی پیشانی پر ایک یاقوت جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

''بہت خوبصورت ہے'' اس نے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کل میں اپنے بالوں میں کنگھی کر کے اسے پہنوں گی۔ ...... کچھ دن بعد ہم اپنے دریا کے کنارے ایک کوشک بنائیں گے ...... نہیں بلکہ اپنا ذاتی تالاب بنوائیں گے جس میں سفید ہنس تیرتے ہوں گے؟''

اور پھر ایک لمحے کے لیے اسے سرسام ہو گیا...... بیماری نے بڑی تیزی سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ عمر نے فوراً جعفرک کو طلب کیا جس نے دیکھتے ہی اپنا منہ پھیر لیا۔

''طاعون'' مسخرے نے زیرِ لب کہا۔

''نہیں طاعون نہیں ہے'' عمر نے چیخ کر کہا ''غور سے دیکھ! یہ محض بخار ہے۔ خدا سے دعا کر کہ صبح ہوتے تک اتر جائے''۔

''اب اور کر ہی کیا سکتے ہیں'' جعفرک بولا ''ماسوائے دعا کے''۔

رات کی سردی کم کرنے کے لیے خیمے کے چاروں طرف آگ روشن کر دی گئی جس کے عکس سے خیمے کی دیواریں سرخ نظر آ رہی تھیں یاسمین کراہ رہی تھی اور بار بار اپنا سر دھن رہی تھی۔ اسے یہ خبر بھی نہ تھی کہ عمر خیام اس پر جھکا ہوا ہے یا کوزہ پشت ایک کونے میں سکڑا ہوا اسمائے الٰہی کا ورد کر رہا ہے۔ آگ بجھ گئی اور اس کا عکس دیواروں پر ناچنا بند ہو گیا۔

جعفرک کے کانوں میں یکا یک عمر کی آواز آئی قندیل روشن کرو۔ اس نے ابھی مجھ سے کچھ کہا ہے۔ اس نے مجھے چھوا ہے۔ اس کا بخار اتر گیا ہے''۔

جب وہ قندیل لے کر ان کے پاس پہنچا اور اپنے ہاتھ کی اوٹ سے اس پر روشنی ڈالی تو یاسمین بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کیے۔ اس کا ایک ہاتھ عمر کی گردن میں حمائل تھا اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

میری زندگی...... میری روح

پھر اس کا سر دوسری طرف ڈھلک گیا۔ اور جعفرک خاموش کھڑا اس پر روشنی ڈالتا رہا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید عمر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے یہ بات کچھ عجیب سی محسوس ہوئی کیونکہ یاسمین کا تنفس بند ہو چکا تھا۔ اس نے قندیل نیچے رکھ دی اور عمر کے کندھے کو چھوا۔

قافلے والے خیمے کے چاروں طرف بجھی ہوئی آگ کے گرد بیٹھے رہے حتیٰ کہ ریگستانی ہوا کے ایک جھونکے نے دھند کا پردا چاک کر دیا اور سورج کی سرخ گیند اچھل کر نظروں کے سامنے آ گئی۔ اس دوران میں کبھی کبھی جعفرک بھی باہر آ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا۔

''وہ ابھی تک خاموش ہے'' جعفرک نے کہا ''وہ اب بھی گلاب سے اس کی بند آنکھیں دھو رہا ہے''۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ایک سپاہی نے کہا ''اس نے طاعون سے وفات پائی''۔

''وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ مر چکی ہے کیونکہ وہ اسے عروسی زیورات پہنا رہا ہے اور اس کے سینہ بند کی گھنڈیاں لگا رہا ہے۔

''بہتر ہوتا کہ وہ صدمے سے بیتاب ہو کر چیختا چلاتا۔ اپنے کپڑے پھاڑتا۔ جیسا کہ لوگ اس قسم کے ماتمی موقعوں پر کرتے ہیں''۔

''خدا کرے وہ روئے لیکن وہ روتا کیوں نہیں۔ ہے وہ زمیپر کیسی ڈھلی ڈھلائی لیٹی ہے۔ کتنی جوان تھی وہ...... اس کی مثال ریگستان کے اس پھول کی سی ہے جو بارش کے بعد کھلتا ہے اور جسے دوسرے ہی دن ہوا کے تیز جھونکے اڑا کر لے جاتے

ہیں“۔

لوگ بڑی بے چینی سے چل پھر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ بڑی غیر متوقع بات تھی کہ ایک ٹیلے پر ناشپاتی کے درخت کے نیچے انہیں اتنی کشادہ قبر کھودنا پڑے گی اور میت والے خیمے میں پردہ دار محمل لے جانا پڑے گا۔ جوان لڑکیاں بچے کی پیدائش پر یا کسی بیماری میں بڑی آسانی سے مر جاتی ہیں۔ یہ بات البتہ وہ ضرور جانتے تھے...... تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اور تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ وہ بڑی بے چینی سے اس کشتی کو دیکھ رہے تھے جو دریا کے کنارے کھڑی تھی۔

”غالباً“ ایک شخص نے زور دے کر کہا ”وہ پاگل ہو گیا ہے۔ خدا مصیبت زدوں کی حفاظت کرتا ہے“۔

”بے شمار لڑکیاں ہیں“ باتونی سپاہی نے کہا ”انہی نقرئی سکوں کے عوض اس وقت بغداد میں......“

”کتا“ جعفر کہ چیخا ”اے گندی نالی میں لوٹنے والے تجھے کیا معلوم کہ محبت کی آگ میں جلنا اور تڑپنا کیا چیز ہے“۔

وہ خیمے میں داخل ہوا اور پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آیا اور غلاموں کو حکم دیا کہ محافہ اٹھا کر پہاڑی کی چوٹی پر قبر تک لے جائیں۔

”جلدی کرو“ اس نے ڈانٹ کر کہا ”آقا نے اسے محافے میں لٹا دیا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں سے تحائف اس کے پہلو میں سجا دیے ہیں۔ آقا کا خیال ہے کہ اب اس کی محبوبہ کی رخصتی کا وقت آ گیا ہے۔ سفر پر روانہ ہونے کا۔ جلدی کرو۔ وہ دیکھو وہ خود

زمین پر لیٹا ہوا ہے''۔

''ہم جنازہ اٹھانے والے تو نہیں ہیں'' اونٹوں کے نگہبان نے کہا۔

''یا خدا...... شاید وہ لاش کو کشتی پر نہ لے جانا چاہیں''۔

''نہیں نہیں قبر تک لے چلو قبر تیار ہو چکی ہے۔ اب دیر نہ کرو۔

خوفزدہ غلاموں کو اپنے ساتھ لیے خیمے کے پردہ اٹھا کر جعفرک نے اندر داخل ہو کر کہا ''حضور اب ہم چلنے کو تیار ہیں۔ جب تک تمام انتظام مکمل ہو۔ آپ تھوڑی دیر یہیں قیام کریں''۔ اور سرگوشی کے انداز میں غلاموں سے کہا ''احمقو جلدی کرو اسے سب کچھ معلوم ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ آہستہ سے۔ ورنہ وہ اٹھ کھڑا ہو گا اور بولنے لگے گا''۔

خوف اور اضطراب سے کانپتے ہوئے انہوں نے بھاری محافہ اٹھایا اور خیمے سے باہر آئے اور تیزی سے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ جنازہ قبر میں اتار کر انہوں نے پیروں سے اسے مٹی اور خس و خاشاک سے بھر دیا۔ اوپر سے پتھر چن کر قبر کی ظاہری شکل مکمل کر دی۔ اس کے بعد وہ بھاگتے ہوئے نیچے اترے اور خیمے کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اونٹوں پر سامان بار کیا جانے لگا۔ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی زینیں کس لیں۔

حضور جعفرک نے چلا کر کہا ''ہم تیار ہیں اب وقت آ گیا ہے''۔

عمر جب خیمے سے باہر آیا تو اس نے اپنی دستار کے کونے سے اپنے ہونٹ چھپا رکھے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اڑتی ہوئی خاک' اور راداس اور سنسان دریا کی طرف

ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انتظار کرتے ہوئے آدمیوں کی طرف جو ایک جگہ جمع تھے دیکھ کر حکم دیا۔ ''اس خیمے کو آگ لگا دو اور روفان ہو جاؤ' اور یہ سب سامان جو تمہارے پاس ہے وہ بھی لے جاؤ۔ میں تمہارے چہرے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ خبردار تم میں سے کسی کی منحوس صورت اب مجھے نظر نہ آئے''۔

آقا! جعفر ک نے احتجاج کیا۔

''آپ بھی چلیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں طاعون ہے''۔

کشتی نے دریا پار کر لیا اور جانور اور دریا کے دوسرے کنارے پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ عمر خیمے کی سیاہ راکھ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو غور سے دیکھتا رہا۔ بل کھاتے ہوئے دھوئیں کی آمیزش سے اڑتی ہوئی دھول بھی سیاہ نظر آ رہی تھی۔ حتیٰ کہ سورج کی سرخ گیند بھی ایسی معلوم ہو رہی تھی کہ جیسے آسمان پر قندیل لٹک رہی ہو۔

وہ قندیل اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ اور تمام آسمان بیرقوں سے ڈھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ خاکستری زمین خالی خالی نظر آ رہی تھی۔ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی تھی خلا ہی خلا تھا۔ کارواں کے تمام آچار معدوم ہو چکے تھے اور وہ آگ جس نے خیمے کو بھسم کر دیا تھا اب اس کے دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ جلا رہی تھی۔ جلا رہی تھی۔ اس کے تمام جسم کو......

''حضور'' جعفر ک کی آواز اس کے کانوں میں گونجی ''وہ دریا ہے موت کا پیش خیمہ''۔

پانی طغیانی کی وجہ سے اس کے قدموں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے پھسل پھسل کر اس میں گر رہے تھے اور غائب ہو جاتے تھے۔

جعفرک نے اپنا بازو عمر کے کندھے پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی کے اس طوفان کو دیکھنے کے لیے زمین پر بیٹھ گیا جو اس کے اتنے قریب سے گزر رہا تھا۔

ٹن ٹن ٹن اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ایک زنجیر کھڑکھڑائی اور ایک نئے کارواں کی قطار دریا کے اس پار انتظار کے لیے رک گئی۔ کشتی ایک بار پھر دریا عبور کر کے واپس آ گئی۔ اجنبی لوگ اپنے گھوڑوں کو پانی پلا نے کے لیے جانے لگے۔

''نہیں یہ طاعون نہیں ہے'' جعفرک کی آواز بلند ہوئی '' اسے بخار بالکل نہیں ہے وہ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ کہ اسے اتنی اذیت پہنچے گی...... خداوندا اسے کیا دیا جائے؟ کیا تیرے پاس آنسوؤں کا تحفہ بھی نہیں؟''

ایک شخص نے آگے بڑھ کر کچھ کہا۔ ایک بڑا جام عمر کے ہاتھ سے مس ہوا اور اس نے جام پر نظر ڈالی وہ سرخ شراب سے بھرا ہوا تھا۔

دریا کا پانی۔ اقرونوس تاجر کی آواز آئی۔ پینے کے لیے مناسب نہیں۔ آپ یہ پیجیے۔

اقرونوس نے جام عمر کے ہونٹوں سے لگا دیا اس نے ایک گھونٹ پیا۔ جب جام خالی ہو گیا تو اقرونو نے اسے دوبارہ بھر دیا۔ شراب میں مسالے کی آمیزش تھی جس نے اس کے دماغ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو قدرے ٹھنڈا کر دیا۔ وہ پیتا رہا حتیٰ کہ

آسمان پر سیاہ پردے لہرانے لگے اور سورج کی قندیل ان کے پیچھے غائب ہو گئی۔

خراسان کی سڑک...... کردوں کی پہاڑیوں پر سیاہ پتھروں کا درہ

اس کے کانوں میں اونٹوں کی گھنٹیاں بجنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ لمبے لمبے موٹے بالوں والا ایک خچر عمر کو اپنی پیٹھ پر لادے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا عمر غنودگی کے عالم میں زین پر بیٹھا ادھر ادھر ہل رہا تھا۔ کیونکہ زین کی تپش ایک جیتی جاگتی چیز کی طرح اس سے ملنے کے لیے اوپر آ رہی تھی۔

رات کے وقت جب اسے نیند نہ آئی تو اس نے اقرونوس کی دی ہوئی شراب کے کئی جام پیے اور جانوروں کے رکھوالوں سے باتیں کرتا رہا۔ وہ لوگ اسے پاگل سمجھ کر بڑے شریفانہ انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیتے رہے جب باتیں کرنے میں بھی اسے سکون میسر نہ ہوا اور بہت دور دریا کے قریب کنارے قبر میں لیٹی ہوئی نقاب پوش یاسمین کے تصور نے اس کے دماغ میں ابھر کر اس کے جسم میں ایک دفعہ پھر آگ بھڑکا دی تو اس نے شراب کی صراحی طلب کی اور اس وقت تک تھوڑی تھوڑی پیتا رہا جب تک ستارے چلتے چلتے آسمان کے دوسرے کنارے پر نہ جا پہنچے۔

''وہ بہت کمزور ہو گیا ہے'' جعفرک نے اقرونوس سے کہا۔

''پیاسا رہنے کے مقابلے میں'' اقرونوس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''پیتے رہنا بہتر ہے''۔

''لیکن کل کیا ہوگا اور کل کے بعد آنے والی کل؟''

''جب کل ہوگی دیکھا جائے گا''۔

یہ سن کر عمر اپنے گدے پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ان کی طرف دیکھا ''اگر یہ گزری ہوئی کل اور آنے والی کل کا چکر نہ ہوتا تو زندہ رہنا کس قدر آسان ہو جاتا'' وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا ''اگر ہم ماضی کے چہرے پر نسیاں کی نقاب ڈال دیں اور اگر ہم مستقبل کے پردے کو کبھی نہ سرکائیں اور اگر ''آج'' کسی اور چیز سے کبھی نہ بدل سکے'' ''سلامتی'' جعفرک زیر لب بڑبڑایا۔ ''خدا تجھے سلامت رکھے'' وہ ریگستان کی سطح سے کوہستان کردپر چڑھ رہے تھے۔ اس قدیم سڑک پر جو زائرین کی آمدورفت کی کثرت سے چکنی ہو گئی تھی ایک روز تیسرے پہر کے بعد کارواں کے تمام تاجر پتھروں کے اس ڈھیر کے قریب رک گئے۔ ان پتھروں کا رنگ بھورا تھا اور جسامت میں نصف انسانی کے برابر تھے۔

ان میں سے کچھ پتھروں پر انسانی چہروں کے آثار پائے جاتے تھے اور لڑھکنے کی وجہ سے تمام پتھروں کے کنارے گھسے ہوئے تھے۔ کارواں کے سب تاجر سواریوں سے اتر کر ان پتھروں کے قریب گئے دھکیل اور کھینچ کر انہوں نے ان پتھروں کو سڑک پر کچھ دور لے جا کر چھوڑ دیا۔

''اخاہ'' افرونوس نے کہا ''وہ ان پتھروں کو مکے کی سمت میں جانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ سیاح پتھر پہاڑوں سے روانہ ہوئے ہیں۔ ہر مسلمان ان کے سفر میں ان کی مدد کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں کم عمر تھا تو یہ پتھر قصر شیریں کے بازار میں

پڑے تھے۔"

جعفر ک ان بڑے پتھروں کی زیارت کرنے کو گیا۔ وہ بالکل معمولی پتھر تھے۔ لیکن انہیں سڑک پر آرام سے پڑے دیکھ کر تعجب ضرور ہوتا تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ ان تھروں کو بغداد پہنچنے میں کتنا عرصہ لگے گا اور آیا یہ کبھی ریگستان عبور کر کے مکہ معظمہ تک پہنچ بھی سکیں گے لیکن تاجر اس شام مسلسل بلند آواز عبادت کرتے رہے۔ جو لوگ حج کی سعادت حاصل کر چکے تھے وہ قزاقوں کے پیش نقبضوں اور تیروں سے محفوظ رہنے کے لیے بار بار اپنے تعویز نمایاں کرتے تھے۔

کیونکہ اس پہاڑیوں میں گرد اپنے پڑاؤ سے نیچے اتر کر اونٹوں کی قطاروں پر حملہ کیا کرتے تھے۔

جب رات بحفاظت تمام گزر گئی تو صبح کے وقت تاجروں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک بار پھر سیاح پتھروں کو تھوڑی دور اور آگے دھکیلا۔ اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ جس شخص کے پاس شراب ہو وہ اس روز کارواں سے پیچھے رہ جائے۔

"وہ ہماری بصارت اور سماعت سے دور رہ کر اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ ا س کی ہمراہی ہمارے لیے منحوس ہے اور ہم پر مصیبت نازل کر سکتی ہے۔ وہ ہمارے کارواں کے غبارے کے پیچھے پیچھے آ سکتا ہے"۔

اپنے اس جوش و خروش پر انہوں نے اقرونوس کو ڈھونڈ نکالا اور کہا کہ "تو یونانی اور کافر ہے۔ تو بھی شراب فروش کے ہمراہ پیچھے قیام کر"۔

"آج سڑک پر خطر ہے" بھورے بالوں والے اقرونوس نے احتجاج کیا" اور

کارواں سے علیحدہ ہو کر دو آدمیوں پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں صرف ان کے گھوڑوں کی وجہ سے ہی موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں میں یونانی نہیں ارمنی ہوں''۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ واللہ تجھے شرم نہیں آتی ...... خنزیر کا گوشت کھانے والے؟ تیری وجہ سے ہم اپنے اوپر مصیبت نازل کرالیں؟''

افرونوس خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا...... کیونکہ بغداد کے سوداگر مسلح تھے اور ان کے ساتھ حفاظتی سواروں کا دستہ بھی تھا۔ جب وہ سوار ہو گئے اور اونٹوں کی قطاریں سڑک کے اوپر چل پڑیں تو عمر اپنے خچر کے پاس ایک سیاہ پتھر پر بیٹھا رہا۔

''خواجہ عمر! چلیے'' انہوں نے آواز دے کر کہا۔

''نہیں تم بغیر شراب کے چلے جاؤ میں نہیں جاؤں گا۔''

یہ بڑی نادانی ہے۔ جعفرک نے لقمہ دیا'' کہ ہم پیچھے رہ جائیں یہ مقام بیوقوفوں کے لیے ہے۔ آج حج بیت اللہ سے سرفراز ہو چکے ہیں سوار ہو جایئے!''

شراب فروش جو ایک دبلا پتلا آدمی تھا اور بے حد شکایتیں کرتا تھا جب کارواں روانہ ہو گیا تو کوئی احتجاج نہ کیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس وقت تک انتظار کرنے کا حکم دیا جب تک کارواں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ ''جو کچھ آج ہوتا ہے تقدیر میں لکھا جا چکا ہے'' اسنے بڑی بے دلی سے کہا'' اور جو تقدیر کا لکھا ہے وہ پیش آ کر رہے گا۔ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ میں ایک احمق ایک شرابی اور ایک ارمنی کا ساتھ سفر کروں''۔

جب کارواں آخری حصہ بھی درے کے دہانے پر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو شراب فروش نے اپنے اونٹ کھڑے کیے اور اس کے ملازموں نے اپنے اپنے اسلحے اٹھا لیے۔ جعفرک بھی اپنے گدھے پر سوار ہو گیا۔ تیز دھوپ میں وہ آہستہ آہستہ درے کی طرف بڑھنے لگے۔

جب وہ قلہ کوہ سے چکر کاٹ کر ڈھلان کی طرف اتر رہے تھے ساربانوں نے اپنے جانوروں کو روک لیا۔ سنو انہوں نے چلا کر کہا۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے تمام گھاٹی گونج اٹھی۔ دور کہیں آدمیوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں اور شراب کے تاجر نے چلا کر کہا کہ بس اب کرد آیا ہی چاہتے ہیں اور ہم سب قتل کر دیے جائیں گے۔

''ہمیں اپنے جانور چھپا دینے چاہئیں'' اقرونس نے مشورہ دیا ''ہم بھاگ کر جان نہیں بچا سکتے''۔

''کوئی شخص'' تاجر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''اپنی قسمت کے لکھے کو نہیں مٹا سکتا''۔

خوف سے کانپتے ہوئے ساربانوں نے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کو تنگ گھاٹی میں ایک خشک دریا کے چڑھاؤ کی جانب ہانک کر چھپا دیا۔ گھڑ سواروں نے تمرس کی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لی۔

اوپر کی طرف افق پر انہوں نے کچھ گھڑ سواروں کو دیکھا جو نیزے ہلاتے سرپٹ چلے جا رہے تھے قریب ہی چیخ و پکار کنکریوں کے بجنے اور پتھروں کے لڑھکنے کی ملی

جلی آوازیں سنائی دیں۔

بلاشبہ جعفر ک نے زیر لب کہا انہی پہاڑیوں نے ان لوگوں کو جنم دیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کا محاصرہ کر لیا ہے اور لوٹ کے مال کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہے ہوں۔ اقرونوس نے اپنے شانوں کو جھٹکا دیا اور اس وقت تک سکون سے انتظار کرتا رہا جب تک خاموشی طاری نہ ہو گئی۔

انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا مسخرے نے چلا کر کہا۔

جب ایک گھنٹے تک ہر طرف سناٹا چھایا رہا تو تاجر نے آگے بڑھنے کی حامی بھری بظاہر کروجا چکے تھے۔

لیکن پہلے ہی موڑ پر حیرت زدہ ہو کر انہوں نے اپنی باگیں روک لیں۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی جگہ پر کارواں پسماندہ پڑا تھا۔ رسیاں تھیلے پھٹے ہوئے بورے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے سوائے ایک لنگڑے گدھے اور چند کتوں کے بغدادی تاجروں کے تمام جانور مع مالکوں کے غائب تھے۔ چند رسابان پریشان حال ٹوٹے پھوٹے سامان کے نیچے ادھر ادھر دبے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

کسی قسم کے ہتھیار کا پتا نہ تھا اور مسلح نگہبان جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

اقرونوس نے جو پہاڑی قبیلوں کے اس سے زیادہ حملے دیکھ چکا تھا بڑی آزردگی کے انداز سے سر ہلایا ''افسوس'' اس نے کہا ''کردوں نے ہمارے بغدادی بھائیوں پر حملہ کر دیا ہے اور کارواں کو اس پرندے کی طرح پکڑ کر لے گئے ہیں جو اپنے بچے

ہوئے پر پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ غالباً ہمارے کچھ دوست تو اپنے گھوڑوں کی برق رفتاری لے سہارے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن باقی یرغمال کے طور پر کام آ گئے ہیں۔ ہم نے انہیں لے جاتے ہوئے کردوں ہی کی آواز سنی تھی۔ افسوس ان کے محافظ ان کی حفاظت نہ کر سکے ...... وہ اب کردوں کے غلام ہیں۔"

ایسے ہی ایک حملے میں اس کے کپڑوں کی ایک گانٹھ تو ضرور شائع ہو گئی تھی لیکن وہ خود بچ نکلا تھا۔

لیکن عمر ہنسا "ہماری شراب محفوظ ہے۔ جس قیمت کا مال ہمارے پاس ہے اس کے مقابلے میں ان تاجروں کا آدھا بھی نقصان نہیں ہوا۔ لٹے ہوئے کارواں کے بچے کھچے آدمیوں اور پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کے ساتھ وہ لوگ تیزی سے میدان کی اوپر کی سمت سفر کرنے لگے۔ کردوں کے خوف نے ان کی رفتار بھی تیز کر دی اور رات کو وہ پڑاؤ کرنے کے لیے بھی کسی جگہ نہ رکے۔ تھکے ہوئے بوڑھے چاند کے سائے میں وہ پہاڑوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھتے رہے اور جعفرک نے اقرونوس سے کہا کہ یہ لوگ بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے مردے اپنی قبریں تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔

"پھر بھی اہواد اور ویرانے میں خیام خوش نظر آتا ہے"۔

اچھا مجھے ایک بات بتا ارغنی نے جواب میں پوچھا تو نے کہا تھا کہ تین سال ہوئے تو اس لڑکی یاسمین کا پیغام لے کر گیا تھا۔ لیکن عمر کا بیان ہے کہ اسے اس لڑکی کے متعلق کوئی خبر نہ مل سکی حتی کہ اس نے تجھے حلب کے درویشوں کے درمیان

دیکھا“

خدا گواہ ہے جیسا کہ تو کہتا ہے کہ میں نے اسے بیت النجوم میں تلاش کیا۔ وہ وہاں نہ تھا آخر میں ایک نشانی اور پیغام وہاں چھوڑ آیا تھا“۔

”لیکن ظاہر ہے اسے کوئی پیغام نہیں ملا آخر ایسا کیوں ہوا؟ چل خیال سچ سچ بیان کر“۔

”نہیں ابھی نہیں وہ اس لڑکی کی یاد میں مغموم ہے مجھے ڈر لگتا ہے“۔

”کس بات سے ڈر لگتا ہے؟ چل آگے بڑھ!“ افرونوس نے اپنے خچر کو ایڑھ لگائی اور مسخرے کے گدھے کی لگامیں پکڑ کر کھینچتا ہوا عمر کے قریب لے آیا ”جعفرک کہتا ہے“ افرونوس نے عمر سے کہا ”تین سال ہوئے وہ یاسمین کا ایک پیغام لے کر تمہارے گھر آیا تھا اور ایک نشانی بھی وہاں چھوڑ گیا تھا لیکن تم اس واقعے کو بھول گئے ہو؟“

عمر نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے حیرت ہے حضور“ جعفرک نے چیخ کر عمر سے کہا ”آپ نے اتنے طویل عرصے تک نہ تو اسے اپنے پاس بلایا اور نہ تلاش کیا“

”وہ کیا نشانی تھی؟ کیا پیغام تھا؟“

”ایک نقرئی جڑاؤ بازو بند اور یہ پیغام کہ یاسمین بیمار ہے اور وہ مغرب کی سمت حلب جا رہی ہے“۔

وہ دن عمر کو اچھی طرح یاد تھا جب اس نے یاسمین کے بازو پر وہ بازو بند باندھا

تھا۔" مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ تو نے کس سے گفتگو کی تھی...... ملازم سے؟ یا خواجہ میمون سے؟"

جعفرک نے اپنی گردن ہلائی "وہ چھوٹے قد کا ایک مضبوط آدمی تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی جب وہ بولتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ یامین کیا واقعی سخت بیمار ہے؟ میں نے اس سے کہا تھا خداوند کریم یامین کی حالت پر رحم فرمائے"۔

"بس خاموش" عمر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا وہ توتوش تھا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا سفید جھوٹ"۔

جب عمر کچھ دیر تک خاموش رہا تو جعفرک پیچھے ہٹ گیا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کی گفتگو عمر کے کانوں تک نہ پہنچ سکے گی وہ ارمنی تاجر سے مخاطب ہوا۔

اس بات کا کیا مقصد تھا؟ تجھے اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اب اس کی کیفیت دیوانوں کی سی ہے"۔

"اس بات کی قیمت میرے لیے اتنی ہے جتنی کپڑے کے لدے ہوئے کئی اونٹوں کی"۔

اقرونوس مسکرایا لیکن وہ اپنا مافی الضمیر الفاظ میں ادا نہ کر سکا۔ اور جعفرک کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر سوچتا رہا کہ آخر نظام الملک کے جاسوسوں کے سربراہ توتوش نے عمر کو لڑوانے میں اقرونوس کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔

دریائے نیشاپور کے کنارے بیت النجوم

خواجہ میمون ابن نجیب الواسطی اپنے دونوں ہاتھ آستینوں میں لپیٹے دیوان خانے میں خاموش بیٹھا تھا۔ پہلو میں رصدگاہ کا مظفر الاسفزاری تھا۔ ان کے چھ مددگار دیوار سے پشت لگائے بیٹھے تھے یہ لوگ ایک سال تک مسلسل کام کرتے رہے تھے۔

ان کے سامنے چوکیوں پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے جن پر اعداد و شمار کی بے شمار جدولیں بنی ہوئی تھیں۔ خواجہ میمون اپنی خشک آواز میں بیان کر رہا تھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ لیکن داخل کوتاہیوں کا احساس بھی پریشان کر رہا تھا۔ سلطان کا نوجوان منجم جو حال ہی سے مغرب کے سفر سے واپس آیا تھا مسند پر ہاتھ پھیلائے سیدھا لیٹا ہوا تھا جیسے اس پر نشے کی کیفیت طاری ہو۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور دھیمے سروں میں زیر لب کچھ گنگنا رہا تھا۔

اس کے علاوہ عمر کی پشت پر سیاہ ٹوپی اور الجھی ہوئی بھوری ڈاڑھی والا کوزہ پشت منجم دیوار پر جھکا بیٹھا تھا۔ خواجہ میمون کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان ریاضی دانوں کے سامنے اس کے وقار کو دھچکا لگا ہے۔ سائنس دانوں کا دربان ایک منجم ابڑی عجیب سی بات تھی۔

اس نے تفصیلی روئیداد کو مختصر کرتے ہوئے سردمہری کے لہجے میں کہا ''موسم بہار میں ۲۰ مارچ کو نقطہ اعتدال پر طلوع آفتاب کے وقت اور ہمارے مقررہ وقت میں تین گھنٹے نو منٹ کا فرق رہا۔

''تین گھنٹے'' عمر نے دہرایا ''اور نو منٹ''

میمون نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں۔ عمر کی عدم موجودگی میں اس نے پوشیدہ طور پر اس بات کی انتہائی کوشش کی تھی کہ سورج کے طلوع و غروب کے اوقات کا زیادہ سے زیادہ صحیح تعین کرسکے تاکہ وہ اس تخمینے کی داد و تحسین کا حق دار گردانا جائے۔

ایک ہتھوڑا لے کر عمر نے کہا "اس پن گھڑی کو توڑ ڈالو"۔

نہیں نہیں عالی جاہ اسفزاری نے بات بنائی جس کے ذمے پن گھڑی کا حساب رکھنا تھا۔ سورج کے اوقات اور پن گھڑی کے اوقات میں سترہ منٹ سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔ ممکن ہے اس سے قدرے زیادہ ہو لیکن......"

یا خدا عمر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے چلا کر کہا گھڑی اس قدر صحیح ہے؟

انشاءاللہ

"اور اس کے باوجود تم لوگ ایک سال کے عرصے میں سورج سے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کے فرق پر ہو۔

"یہ ہماری بدقسمتی ہے......"

"تم سب دفان ہو جاؤ ان آلات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بازار سے لونڈے اور وقت کا شمار کرنے کے لیے اصفحان کی رقص کرنے والی نازک اندام لڑکیاں لے کر آؤ......تم کس منہ سے اپنے آپ کو ریاضی کا ماہر کہتے ہو۔ جاؤ مدرسوں میں جا کر لونڈے پڑھاؤ"۔

تمام مددگار اسفزاری کے ساتھ دیوان خانے سے باہر نکل گئے۔ صرف بوڑھا میمون بے حس و حرکت وہاں بیٹھا رہا۔

حضور جعفرک نے بڑی لجاجت سے کہا ''چھ گھنٹے تو یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ میں تو اکثر تربوز کھا کر کبھی کبھی غنودگی کے عالم میں اتنا وقت گزار دیتا ہوں اور اس کا خیال بھی نہیں کرتا''۔

''تو پھر تجھے بھی منجم ہونا چاہیے'' عمر نے تالی بجاتے ہوئے کہا ''شراب لے کر آ......شیراز کی سرخ شراب سربمہر صراحی میں سے''۔

جب خوفزدہ غلام نے شراب سے ساغر بھر دیا تو عمر آہستہ آہستہ پینے لگا۔ میمون کو یوں محسوس ہوا جیسے خیام کے جسم میں شیطان حلول کر گیا ہے۔ لیکن وہ طے کیے بیٹھا تھا کہ جب تک وہ خود کو حق بجانب ثابت نہ کر لے گا۔ وہاں سے نہ ٹلے گا۔ افرونوس بڑے پر اثر انداز سے دیکھ رہا تھا عمر نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر دیکھا۔

''یہ جدول کس نے بنائی ہے؟''

''عالی جاہ!'' میمون نے سنجیدگی سے کہا ''میں نے خود ان کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اس میں آپ کو کوئی غلطی نہ ملے گی''۔

عمر نے جدول کے ہندسوں پر ایک نظر ڈالی اور کاغذ کا ایک قطعہ اور اٹھا لیا۔ اس کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کیا ''تو قسم کھا کر کہتا ہے کہ تیرے تخمینے بالکل صحیح ہیں۔ اور اسفزاری بھی قسمیہ بیان کرتا ہے کہ پن گھڑی غلط نہیں ہے۔ تم میں سے ایک شخص ضرور غلطی پر ہے......لیکن کون؟''

''جہاں تک گھڑی کا تعلق ہے۔ وہ ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ہاں ایک مہینے کے

بعد اس کا فرق معلوم ہوا تھا'' میمون نے سرکشی کے انداز میں اپنا سر اوپر کیا'' چیخ کر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ دفان ہو جاؤ۔ لیکن میں کعبے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے بذات خود ان نتائج کی صحت کا یقین کر لیا ہے''۔

''بطلیموس کی جدول نجوم کے ذریعے؟''

''جی ہاں یقینا''۔

''نیشا پور کے عرض البلد کا تعین کر کے؟ بطلیموس نے اپنے مشاہدات اسکندریہ میں بیٹھ کر کیے تھے''۔

''مجھے تو اس کا یقین ہے۔ کیا عالی جاہ خود اس کی تصدیق فرمانا گوارا کریں گے؟ گزشتہ ماہ کی یہ جدول حاضر ہے''۔

عمر نے قلم اٹھا کر اک مختصر سا حساب لگایا اور میمون کے اعداد و شمار سے اس کا مقابلہ کیا اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' عرض البلد کا تعین بھی صحیح ہوا ہے۔ ستاروں میں بھی کوئی فرق نہیں۔ گھڑی بھی درست ہے۔ اسکے باوجود چھ گھنٹے کا فرق آتا ہے۔ بغداد کے علامہ! تیرے پاس اس کا کیا جواب ہے؟''

میمون نے آہستگی سے سر ہلایا'' یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے''۔

''بطلیموس کی جدول لے کر آؤ''

جب وہ عظیم مخطوط اس کے سامنے پیش کیا گیا تو عمر نے میمون کی یادداشتوں کا پہلا صفحہ اٹھایا اور سر جھکا کر حساب لگانے میں محسوس ہو گیا۔ افرونوس اٹھ کر اپنے بستر

میں جالیٹا اور جعفر ک ایک غالیچے پر سکڑ کر سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن میمون الو کی طرح ٹکٹکی باندھے خاموشی سے انتظار کر رہا تھا۔ جب چراغ کی لو سے شعلہ سا بھڑک کر بجھ گیا تو میمون نے اٹھ کر چراغ میں تھوڑا سا تیل ڈال دیا۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا'' عمر نے بے خیالی میں کہا اور نیا صفحہ اٹھا لیا اور جب روشن دانوں سے صبح کی روشنی چھن چھن کر اندر آنے لگی اور چراغ کی لو مدھم پڑ گئی تو عمر بھی کام کے اختتام تک پہنچ گیا۔ اور میمون دم بخود کوئی بات سننے کا انتظار کرنے لگا۔

''میرے اعداد و شمار بالکل صحیح ہیں'' وہ بڑبڑایا۔

چند لمحے عمر نے بطلیموس کے مخطوطے کے پہلے اور آخری صفحے کا بغور مطالعہ کیا۔

''تیرے تخمینے بالکل صحیح ہیں'' عمر نے زیر لب کہا ''اور اسی لیے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کا فرق مسلسل چلا آ رہا ہے۔ تیرا پہلا اندراج یہ ہے۔ اور ایسا ہی آخری اندراج ہے۔ اور دونوں میں سورج کے وقت سے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کا فرق ہے''۔

''میمون نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس کی تصدیق کی'' یہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

غلطی یہاں ہے'' عمر نے بطلیموس کے بوسیدہ مخطوط پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''خدا معاف کرے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ غلطی...... صدیاں گزر جانے کے بعد......'' فرط حیرت سے میمون کا حلق خشک ہو گیا۔

''ایک مستقل غلطی ہاں''۔

''لیکن کیوں کر؟...... اتنا بڑا شاہد...... اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا؟''

''کاش ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ اسے کسی طرح درست کیا جائے'' عمر مسکرایا اس کی

تھکی ہوئی آنکھوں سے تفکر کے آثار نمایاں تھے...... "لیکن اسکندریہ کے اس عظیم شخص کو قبر میں سوئے ہوئے زمانہ گزر گیا"۔

بوڑھے آدمی کے چہرے پر بطلیموس سے بے اعتقادی کے آثار پیدا ہوئے کیونکہ اس کی جدول نجوم صدیوں سے مسلمان سائنس داں استعمال کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ نیشاپور کی جامع مسجد کے میناروں کے گرتا ہوا دیکھ سکتا تھا لیکن یہ بات اس کے وہم وگمان میں بھی آسکتی تھی کہ بطلیموس غلطی کرسکتا ہے۔

"ہے ہے" اس نے دردانگیز لہجے میں کہا اور اس غلطی کی دریافت کا پورا تاثر اس پر حاوی ہوگیا۔ "تو پھر ہماری ساری محنت اکارت گئی خرمی کی بھی۔ اور دوسرے تمام لوگوں کی بھی...... قائم ستاروں کی تمام جدولیں غلط ہوگئیں۔ بالکل غلط] بہت دل برداشتہ ہوکر اس نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اگر کمرہ کا فرش کناروں سے بلند ہوگیا ہوتا تو اسے اس قدر تعجب نہ ہوتا لیکن عمر کی سیاہ آنکھیں ساکت تھیں۔

"ٹھہرو! میمون ذرا ٹھہرو۔ غلطی بہت معمولی ہے۔ لیکن متواتر اور مستقل"۔ یہ یہاں سے پہلے خانے میں اور آخری میں بھی۔ یہ مشاہدات بالکل صحیح کیے گئے تھے۔ مگر غلط بھی۔ قدرے غلط" وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے کمرے کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر خیرہ کار آفتاب کو تکنے لگا" صحیح اور غلط...... ایسا ہونا ناممکن نہیں لیکن ہے کاش ہم اس پردہ راز کو چاک کرسکتے"۔

میمون نے اس کے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔ "غیب کا حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ پوشیدہ رازوں کی کنجیاں تو صرف اسی کے قبضے میں ہیں"۔

''اگر وہ کنجی ہمیں حاصل ہو جائے...... وہ کنجی' عمر اک دم مڑا ''اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بطلیموس کے عرض البلد اور طول البلد صحیح ہیں''؟

''ارے اس میں کیا شک ہے...... کیا ہم نے گزشتہ تین نسلوں سے ان کو تسلیم نہیں کیا ہے''۔

تو پھر ٹھہرے ہوئے ستاروں کی جدول کی کنجی ضرور اس کے پاس ہوگی۔ صرف وہی ان جدولوں کو استعمال کر سکتا تھا لیکن اگر دوسرے لوگ...... جن کے پاس وہ کنجی نہیں ہے...... انہیں استعمال کریں گے تو اپنے حساب میں ہمیشہ ناکام رہیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم ناکام ہو گئے ہیں'' اس نے کھلے ہوئے مخطوطے پر اپنا ہاتھ مارا ''کنجی کی مدد سے ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں میمون ...... صرف ہم''۔

''سچ اور جھوٹ میں اگر بال برابر کا بھی فرق ہے تو جھوٹ کبھی سچ نہیں ہو سکتا''۔

عمر نے سائنس دان کو غور سے دیکھا اور اس کا چہرہ اتر گیا ''میمون بوڑھے استاد! مجھے معاف کرنا۔ میں ناحق تم پر ناراض ہوا۔ تم نے مجھے کنجی عطا کر دی ہے جس سے جھوٹ سچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں...... میں جانتا ہوں''

''یا اللہ یہ بات کوئی نہیں جان سکتا''۔

''یہ بہت چھوٹی سی کنجی ہے۔ تم نے اس جدول کی مدد سے نیشاپور کے عرض البلد کا تعین کیوں کیا؟''

اس لیے کہ...... منجم کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا...... ''ٹھہرے ہوئے ستارے

اسکندریہ کے مقابلے میں جہاں بطلیموس نے مشاہدہ کیا تھا۔ نیشاپور سے مختلف زاویے سے نظر آتے ہیں''۔

''اور فرض کرو'' عمر نے سوال کیا ''اگر وہ اسکندریہ سے نظر ہی نہ آتے ہوں''۔

''یا اللہ کیا بطلیموس کی رصدگاہ اسکندریہ میں نہ تھی؟''

''جی ہاں اور ہم نے یہیں سے دھوکا کھایا ہے''۔

میمون نے تھکے ہوئے انداز سے عمر کو دیکھا...... بالکل خالی الذہن ہو کر ''پاگل ہو گیا ہے'' وہ بڑبڑایا۔

''نہیں بطلیموس نے یہ جدولیں اسکندریہ میں بیٹھ کر نہیں بنائیں۔ وہ کسی اور نے ترتیب دی ہیں اس کے عہد سے بھی قبل۔ کسی اور مقام پر۔ اس نے بھی انہیں اسی طرح استعمال کیا جیسے ہم کر رہے ہیں...... اس نے انہیں اپنا سمجھ کر استعمال کیا لیکن نجوم کے اس ماہر کو وہ جانتا تھا جس نے یہ جدولیں مرتب کی تھیں۔ وہ یقیناً جانتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کے تمام تخمینے تمام پیشن گوئیاں صحیح تھیں''۔

خواجہ میمون کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ یکا یک پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں اس پر حقیقت روشن ہو گئی۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے عمر کسی فوق الفطرت طاقت کا مالک ہے جس کے ذریعے اس نے اس راز کو بے نقاب کر دیا ہے جو نو صدیوں سے پوشیدہ تھا۔ نظام الملک نے واقع سچ کہا تھا کہ عمر عجیب و غریب قوتوں کا حامل ہے؟''

''یقیناً ایسا ہی ہوگا'' اس نے آہ بھر کر کہا ''تاہم ہمیں یہ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ

یہ جدولیں کس نے مرتب کیں اور کہاں مرتب کیں؟ شاید وہ کوئی کلدانی ہوگا۔ یا کوئی بابل کا قدیم باشندہ یا پھر وہ کوئی ہندو یا مغرب کا یونانی ہوگا۔ کون جانتا ہے"۔

جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ مشاہدات کہاں کیے گئے تھے۔ یہ جدولیں صحیح کام کرنے کے سلسلے میں بے کار محض ہیں۔ بطلیموس کو معلوم تھا مگر عظیم مصری نے اس گم نام شاہد کی حیثیت کو پردہ راز میں رکھا۔

"چند روز میں" عمر نے اطمینان سے کہا "میں تمہیں وہ مقام بتا دوں گا جہاں یہ مشاہدات کیے گئے تھے لیکن اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے"۔

خواجہ میمون جب مینار سے اتر کر اپنے حجرے کی طرف جا رہا تھا تو اس کے دل میں ایک موہوم امید ابھر رہی تھی۔ ایک شخص جس نے یہ معجزہ دکھایا ہے ممکن ہے دوسرا معجزہ بھی پیش کر سکے۔ حالانکہ ریاضی کی دنیا میں معجزے رونما ہوتے ہوئے اس سے قبل اس نے کبھی نہ دیکھے تھے مگر جب اس نے اپنے حجرے کے باہر اپنے مددگاروں کو بے چینی کے عالم میں یکجا پایا جو نماز صبح کے بعد سے اس کا انتظار کر رہے تھے تو بوڑھے منجم نے اپنا سر بلند کر کے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔ اس نے سچ پوچھیے تو ان پر رعب جمانے کے لیے ایسا کیا۔

عزیز طالب علمو! اس نے بڑی تمکنت سے انہیں مخاطب کیا۔ "خواجہ عمر نے اور میں نے غلطی پکڑ لی ہے۔ نو سال کے بعد میں نے جغرافیہ داں بطلیموس کے مرتبہ ستاروں کی جدول میں غلطی کا انکشاف کیا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہم اس غلطی کی اصلاح بھی کر لیں گے لیکن اس وقت تو میں بے حد تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا

ہوں‘‘۔

وہ اپنی عبا سمیٹتا ہوا بڑے وقار سے اپنے حجرے میں داخل ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے تمام مددگار سناٹے کے عالم میں خاموش کھڑے رہے۔

لا الہ الا اللہ ایک نے سرگوشی کے انداز میں کہا ’’بوڑھا خبطی بھی شاید شیراز کی شراب سے مخمور ہو رہا ہے۔

دھوپ گھڑی کی سوئی کے سائے کی کیفیت اور ریت گھڑی کی مدد سے سورج کے طلوع و غروب کی ساعتوں اور دقیقوں کا اندراج یہ تھا بیت النجوم کا مقررہ کام، جس کے علاوہ اس کے آئندہ اور کوئی نیا کام شروع نہ ہوا۔ البتہ عمر مسلسل محنت کرتا رہا۔ بقول مددگاروں کے وہ اس طرح کام کرتا رہا جیسے اس پر کسی جن کا سایہ ہو۔ اس نے کتب خانے سے بطلیموس کے جغرافیے کا نسخہ منگوایا اور اس کے بعد قدیم یونانی منجموں کے ناموں کے فہرست بھی طلب کی۔

وہ زیادہ تر خاموشی سے کام کرتا رہا۔ اعداد و شمار سے بھرے ہوئے صفحے کے صفحے وہ میمون کو جانچنے کے لیے دیتا رہا۔ میمون مجبوری کے عالم میں ایک ایسا کام کرتا رہا جس کی صحیح نوعیت کا اسے علم نہ تھا۔ اس کی کیفیت ایک ایسے عمل جراحی کا مشاہدہ کرنے والے کی سی تھی جس کے کامیاب ہونے کی امید کم ہو۔ البتہ اسے یہ اندازہ ضرور تھا کہ عمر غلطی کا تناسب معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس تناسب کی مدد سے وہ اسکندریہ کے ثماریا جنوب میں اس رصدگاہ کا فصلہ متعین کرنا چاہتا ہے۔ جہاں جدول کے اندراج کیے گئے تھے۔ بہر حال آخر میں اس کا ایک اندازہ ضرور ہو

گیا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ پانچ درجہ عرض البلد کا فرق ہے۔

''نامعلوم منجم کی رصد گاہ'' عمر نے آکر کار فیصلہ صادر کیا ''اسکندریہ سے پانچ درجہ عرض البلد شمال کی جانب واقع ہے''۔

''جنوب میں کیوں نہیں؟''

''یہ صحیح ہے اس نقطے کے جنوب کی جانب نقشے میں سوائے ریگستان اور غیر معروف کوہستانی سلسلے کے اور کوئی مقام نہ تھا لیکن عمر کو نقشے پر اعتماد نہ تھا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ اسکندریہ کی جنوبی سطح زمین سے جدول میں مذکورہ بہت سے ستارے نظر نہیں آسکتے''۔

انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ مرکز جس کی انہیں تلاش ہے ہندوستان میں تو ہے نہیں اسے نیشاپور کے مغرب میں ہونا چاہیے۔ عمر کا خیال تھا کہ وہ حلب کے مغرب میں ہے جس کی وجہ سے ان کی تلاش اور بھی دشوار ہوگئی۔ کیونکہ مغرب بعید کے قدیم شہروں کا انہیں بہت کم علم تھا۔

ایک شام جب وہ اپنے تجربے کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے دروازے پر ایک خوش آئند آواز نے انہیں مخاطب کیا۔

''عقل و دانش کے دو ستونوں کو اللہ تندرستی دے! خدا تمہاری محنت ٹھکانے لگائے!''

عمر نے اس طرح مڑ کر دیکھا جیسے کسی نے اس کے دل میں نوک دار کیل چبھو دی ہو۔ لیکن میمون نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ توتش ایک نیلا عمامہ باندھے کھڑا مسکرا

رہا ہے۔

''بازار میں یہ کیسی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں'' توتوش نے کہا۔ کہ بیت النجوم میں کوئی عظیم دریافت ہوئی ہے؟''

عمر قلم چھوڑ کر کھڑا ہو گیا ''نہیں شاہزادہ اعظم پر میں نے ایک چیز دریافت کی تھی۔اس نے پرسکون انداز میں کہا اور اب تم مجھے اس کی تفصیل سے آگاہ کرو گے''۔

''غلام حاضر ہے'' توتوش نے سلام کیا'' آپ کا قدیم دوست بس آپ کے حکم کی دیر ہے''۔

''میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے وہ چاندی کا بازو بند جس پر رنگین نقش و نگار ہیں کہاں چھپا رکھا ہے اور وہ پیغام جو اس کے ساتھ بھیجا گیا تھا؟''

جاسوسوں کا سربراہ بڑا ذہین آدمی تھا۔ اسے وہ بازو بند تو یاد آ گیا جو اس نے چشمے کے کنارے کھیلتی ہوئی لڑکیوں کے درمیان پھینک دیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے آنکھیں جھپکاتا رہا۔ اور حیران تھا کہ کون سے جادو کے زور سے سلطان کے نجومی کو یہ بات معلوم ہو گئی۔

''او ہو لاکھوں کی تعداد میں نقشین بازو بند ملتے ہیں۔خواجہ شاید مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں''۔

''میں اس بازو بند کا ذکر کر رہا ہوں جو تجھے اس مسخرے نے دیا تھا اور ساتھ ہی ایک پیغام بھی پہنچایا تھا اسی کمرے میں تو نے وہ پیغام مجھ سے چھپایا اور اب ایک دوشیزہ کی موت کی ذمہ داری میری روح پر ہے۔ایک ایسا بار جو کبھی نہ اٹھ سکے گا''

عمر کے رخسار سفید پڑ گئے۔ اور اس نے اپنی پیٹی کا چاکر پکڑ لی ''اب تو مجھے یہ بھی بتا تو توش کہ دنیا میں بے شمار لڑکیاں ہیں۔ میں صرف ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا اور اسے تو اچھی طرح جانتا تھا پھر بھی تو نے مجھ سے صریح جھوٹ بولا''۔

عمر نے آہستہ آہستہ جاسوسوں کے فربہ اندام سربراہ کی طرف بڑھنا شروع کیا اور وہ یکا یک ان آنکھوں سے خوفزدہ ہو گیا جو اس کی روح میں پیوست ہو رہی تھیں۔

عمر نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا تھا اور اس کے خوف کا بھی اندازہ لگا لیا تھا۔

''خدا کے ننانوے اسمائے صفات کی قسم'' وہ چلایا ''مجھے اس سلسلے میں کچھ علم نہیں ہے اور نہ میں نے کبھی تیری منظور نظر لڑکی کو نظر بد سے دیکھا ہے۔ ہائے کیا ہو...... میمون...... مدد''۔

عمر نے اس کا ٹینٹوا دبا کر اسے جھٹکا دیا۔ توتوش کے گلے میں آواز اس طرح پھنس کر رہ گئی جیسے جال میں پھنسے ہوئے درندے کی۔ اس کے نرم گوشت میں انگلیاں اس طرح پیوست ہو گئیں جیسے فولاد۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر ابل آئیں۔ اس نے میمون کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنا۔ اور پھر خوف قابو پاتے ہوئے اس نے اپنی پیٹی سے چاقو نکال کر اندھا دھند مار دیا۔ چاقو کا پھل لباس اور گوشت کو کاٹتا ہوا ہڈی پر رکا۔ اس کے بعد اسے کلائی سے پکڑ کر فرش پر گرا دیا گیا۔

وہاں پڑا ہوا وہ تڑپتا اور سسک سسک کر سانس لیتا رہا۔ ایک سرخ دھند میں سے اس نے دیکھا کہ آدھی درجن ملازم اور حالم عمر کو اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے ہیں۔ ایک شانے پر سے اس کی عبا پھٹی ہوئی ہے۔ اور ایک سیاہ دھار اس کے سینے

سے بہہ رہی تھی۔

''میرے اور تیرے درمیان خون کی ندی بہہ رہی ہے کتے'' عمر نے پرسکون آواز سے کہا لیکن یہ وہ خون نہیں ہے وہ میرے دل کے اندر ہی اندر قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔ اور اسے اس طرح بند نہیں کیا جا سکتا۔ دور ہو جاو ورنہ مارا جائے گا''۔

لوگ توتوش کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ جب جعفرک نے ملازموں سے یہ واقعہ سنا تو باب طاقین پر اسی رات کو اقرونوس سے بیان کیا کہ عمر نے غصے سے مغلوب ہو کر جب جاسوسوں کے سربراہ پر حملہ کیا تو اس نے عمر کو زخمی کر دیا۔ اقرونوس نے اس واقعے کو اس قدر اہمیت دی کہ جعفرت کے رخصت ہونے کے بعد بازار سے ایک قاصد کو طلب کیا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دو لفظ لکھے اور بغیر بند کیے اسے دے کر کہا کہ اسے لے کر سیدھے چلے جاؤ اور وہاں پہنچ کا قافلہ کے سالار کے پاس جانا اور زور سے چلا کر اعلان کرنا کہ آقائے بیعتہ کے لیے ایک پیغام لایا ہوں اور جب وہ تیرے پاس آئے تو یہ پرچا سے دے دینا۔

''لیکن حضور!'' غلام نے اعتراض کیا ''یہ مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ وہ حقیقتا آقائے بیعتہ ہے؟ یہ بڑا عجیب سا نام ہے''

''جب وہ آئے گا تو تجھے بتا دے گا''۔

''واہ! یہ تو ایک طرح کا جادو ہوا''

اس نے غلام کو پیغام کے متعلق بڑا تجسس ہوا۔ اس نے کاغذ کھول کر کئی مرتبہ ان دو لفظوں کو دیکھا وجو وہ سیدھے سادے لفظ دکھائی دیتے تھے اور اسے اطمینان بھی

تھا لیکن مزید احتیاط کے لیے اس نے ایک ملا کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو اسے پڑھ کر یہ یقین دلا دے کہ ان الفاظ کے اثر سے اس پر کوئی مصیبت تو نازل نہ ہو جائے گی۔

''ساعت شد'' ملا نے بآواز بلند پڑھا ''وہ وقت آ گیا ہے یا آغاز کا وقت آ گیا ہے اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

شانے کی مرہم پٹی کے بعد عمر نے اپنے کمرے میں مقیم رہا۔ اسفزاری نے اتفاقاً جھانک کر دیکھا اور بیان کیا کہ وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کچھ لکھ رہا ہے۔ ان میں سے کچھ کاغذ فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔

رصدگاہ میں میمون نامکمل اعداد و شمار کی تکمیل میں مصروف رہا۔ بغیر عمر کی امداد کے وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ نقشہ غلط تھا اور یونانی منجموں کی فہرست اس کے لیے بے معنی تھی۔ کچھ بے نتیجہ تجربے کرنے کے بعد وہ رصدگاہ سے واپس آ گیا۔

وہ اس شب تک رصدگاہ سے واپس نہیں آیا تا کہ اسفزاری نے اسے مطلع نہ کیا کہ دفتر کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ حالانکہ کوئی مددگار بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ بوڑھا منجم تیزی سے اس طرف گیا اور چھوٹی میز پر عمر کو جھکا ہوا بطلیموسی مخطوطے کے مطالعہ میں غرق پایا۔

''جس نقطے کی ہمیں تلاش ہے وہ ایشیائے کوچک کے مغرب میں واقع ہے'' اس نے کہا ''مجھے اب یقین ہو گیا ہے''

میمون کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ''لیکن اس کے مغرب میں تو صرف سمندر

ہے"۔

عمر نے سر ہلایا۔

افسوس ہماری جستجو بیکار ہے۔

"نہیں اب وہ قریب الختم ہے۔ کیونکہ اس سرزمین پر پرانے زمانے میں بہت سے شہر آباد تھے۔ سمندر میں بھی اکثر چہر تھے عمر منجموں کے فہرست بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور ایک کے بعد دوسرا نام قلم زد کرتا جاتا تھا۔ ایک جگہ آ کر اس کا قلم رک گیا۔

"جزیرہ رہوڈس" اس نے زیر لب کہا "رہوڈس کے ہپارکوس نے ایک ہزار ستاروں کی جائے وقوع متعین کی تھی۔

بوڑھے منجم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اسکی باریک شریانوں میں گرم گرم خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ ایک بخیل کی حرص سے بھی زیادہ گرم، کسی ان دیکھے دیس کے کھوجی کی بھوک سے بھی زیادہ تیز وقت قریب تھا کہ وہ سائنس کا ایک ایسا راز معلوم کر لیں جو نو صدیوں سے پردہ خفا میں مستور تھا۔

"اوہو" اس نے بلند آواز سے کہا "تو گویا بطلیموس نے ہپارکوس کے ایک ہزار اسی نام اپنی المجسطی میں لکھ لیے۔ اگر یہ صحیح ہے..... اگر یہ صحیح ہے!"

"میں سمجھتا ہوں یہ صحیح ہے" عمر نے بے پروائی سے کہا "اب ہمیں رہوڈس کو مرکز تسلیم کر کے ان جدولوں کی جانچ کرنی چاہیے۔ شہر رہوڈس اور ایک ہزار چونتی سال قبل مسیح (۱۰۳۴ ق۔م)۔

"اچھا اب ہم دونوں الگ الگ اسے جانچتے ہیں" میمون پر ایک خوف طاری تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس دریافت کی شہرت میں شرکت کا بھی متمنی تھا۔

وہ تین دن تک مسلسل کام کرتے رہے۔ بہت کم سوئے۔ بغداد کے عالم نے شاذونادر ہی اپنے سامنے رکھے ہوئے صفحوں سے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں ہٹائیں مگر عمر بہت خوش خوش بڑی تیزی سے کام کرتا رہا۔ کھانا بھی انہوں نے کبھی کبھار کھالیا۔ کبھی کسی وقت رات کو یا پھر کسی دن صبح کے وقت حتیٰ کہ عمر نے اپنا صحت مند ہاتھ پھیلا کر ہنستے ہوئے کہا "بس کافی ہے اتنا ہی کافی ہے"

"نہیں ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے" میمون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کیونکہ اس کے خیال میں ابھی تو کام کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن جب دونوں نے اپنے اپنے اعداد و شمار کا موازنہ کیا تو میمون کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔

"قسم ہے کعبے کی قسم ہے آب زم زم کی...... یہ ایک حقیقت ہے کہ حکیم بوعلی سینا بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اور اسے بھی کبھی شک و شبہ نہ ہوا۔ خواجہ عمر!" اس نے خیام کو اپنے آغوش میں لے کر خوب پیار کیا۔ اب ہمارے پاس بالکل صحیح جدول موجود ہے۔ خواجہ عمر جس طرح بطلیموس نے رہوڈوس کے ہپارکوس کی جدول استعمال کی تھی ہم بھی اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں" میمن کو جی چاہا کہ وہ فوراً صحن میں جا کر بیٹھے اسے خواہش ہوئی کہ اس شاندار دریافت کی تفصیل اپنے شاگردوں کو بتا کر محظوظ ہو بلکہ نیشاپور کی بڑی درس گاہ میں جا کر اپنے ساتھیوں کے پاس بیٹھے

اور مزے لے لے کر انہیں اپنی اس کامیابی کی روئیداد سنائے۔ لیکن عمر نے اجازت نہ دی۔

عمر نے خواجہ میمون کو سمجھایا کہ پہلے ہی علمائے دین کہتے ہیں کہ وقت کی پیائش سر عام ممنوع ہے اور وہ خبیث روحیں اس کام میں ہماری مدد کرتی ہیں جو بیت النجوم کے مینار میں مقیم ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اپنے مقصد کے لیے ایک کافر یونانی کی جدولیں استعمال کر رہے ہیں تو تم خود ہی سوچو کہ وہ کیا کچھ نہیں کہیں گے'' اس وقت تک انتظار کرو کہ ہماری تحقیقات مکمل صورت میں سلطان کے حضور پیش ہوں''۔

''خواجہ عمر آپ سچ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک حنبلی نے ہمیں برا بھلا کہتے ہوئے ایک جلتی ہوئی مشعل مینار پر پھینکی تھی۔ اور آپ جب حلب میں تھے تو ایک شب جب ہم سورج گھڑی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مسجد سے آنے والے ایک ہجوم نے ہم پر پتھراؤ کیا تھا۔ ہمیں ابھی اس راز کے سلسلے میں اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت ہی لگا دینی چاہیئے''۔

اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ عمر اس قدر جلد نئے کام کی طرف کیوں کر متوجہ ہو گیا۔ اسے اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ عمر کا دماغ جدولوں سے ہٹ کر ایک ایسے علاقے میں جا پہنچا تھا۔ جہاں ایک لڑکی عالم نزع میں کراہتے ہوئے عمر کے بازو سے لپٹی جا رہی تھی۔

اس تصور کی حیثیت تپتی دھوپ میں اس سایہ دار جگہ کی سی تھی جو ایک بہتے دریا

کے کنارے واقع ہو۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ یاسمین کا حسین مجسمہ مسکراتے ہوئے چہرے اور اپنے سیاہ گھنے والوں کو جھٹکا دے کر اپنے شانوں پر ڈال رہی ہے لیکن عموماً دریا کا منظر اس کی نگاہوں میں تیرتا رہتا۔ اور ایک درد کی سی کیفیت اس پر طاری رہتی اسفزاری نے ایک دفعہ کہا کہ وہ اس انہماک سے کام کرتا ہے جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ یا پھر وہ یک لخت کام چھوڑ کر خاموشی سے شراب پینے بیٹھ جاتا۔

''وہ عجیب و غریب قوت کا حامل ہے'' میمون نے بڑے اعتماد اور وثوق سے جواب دیا یہ اس کی عادت ہے۔ اگر اس کی دماغی قوتوں نے اس کا ساتھ دیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بطلیموس کی تمام محنت پر پانی پھیر دے گا۔''

لیکن جعفر کی اکثر و بیشتر خیام کے پاس گزارتا۔ وہ اپنے دوست کے قدموں میں لیٹا چراغ کی لو سے پیدا ہونے والے سایوں کو دیوار پر تھرکتے دیکھتا رہتا اس دوران میں نہ تو وہ فقرے بازی کرتا نہ کوئی مسخرگی...... ''جب میرے آقا سلطان الپ ارسلان دوسری دنیا کو سدھارتے تھے'' اس نے لیٹے لیٹے کہا ''تو جب تک میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سمندر نہ بہ گیا میرے دل کو سکون نہ ملا مگر اے میرے دوست خیام۔ ساغر میں بھری ہوئی اتنی ساری شراب بھی تجھے رلانے میں کامیاب نہیں ہوتی''۔

عمر نے ساغر پر نظر ڈالی جو اس کے ہاتھ سے چھلک رہا تھا۔ یہ ساغر چاندی کا بنا ہوا تھا اور اس پر لاجورد کے بیل بوٹے تھے۔ جب تمہیں نیند نہ آئے تو تم شراب پی کر مدہوش ہو سکتے ہو۔ یہ بات بہر کیف اس سے تو بہتر ہے کہ تم اس سوچ میں

ڈوبے رہو کہ تم کیا ہو؟...... اور تم کیوں ہو؟''

''لیکن اس عمل سے دل کو سکون و اطمینان تو میسر نہیں آتا''۔

''اس سے خود فراموشی حاصل ہوتی ہے۔ جعفرک تم جانتے ہو کہ یہ جام (۲) اس وقت کیمیا کے کیسے کیسے رازوں کا حامل ہے۔ اس کا ایک گھونٹ ہزاروں تفکرات سے آزاد کر دیتا ہے۔ اسے پی کر تم یہ محسوس کرو گے کہ جیسے محمود کے سنہری تخت پر متمکن ہو اور تمہارے کانوں میں ایسی سریلی موسیقی رس گھولتی معلوم ہوگی جیسے براہ راست حضرت داؤد علیہ السلام کے لبوں سے آ رہی ہو...... اچھا اب تمہی بتاؤ جس شخص نے اس جام کو تخلیق کیا ہے کیا وہ اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟...... بولو!''۔

''نہیں...... خدا نہ کرے''۔

''تو پھر محبت ایک حسین وجود میں کس بات کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اور انتقام سے کیا چیز ضائع ہو جاتی ہے؟''

عمر نے فرش پر سے ایک مروڑے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر جعفرک کی طرف پھینکا۔ مسخرے نے اس کی تمام سلوٹیں دور کر کے روشنی کے سامنے کیا تو اسے نظر آیا کہ کاغذ پر منجم کے صاف ستھرے خط میں ایک رباعی کی چار سطریں تحریر تھیں:

این قافلہ عمر عجب می گزرد

دریاب دمی کہ باطرب می گزرد

ساقی غم روی حریفاں چہ خوری

ہیچ آر پیالہ را کہ شب می گزرد

"افسوس"، جعفرک نے ایک آہ بھر کر کہا یکا یک اس کا دانش افروز چہرہ چمک اٹھا

لکھو ...... اور بہت سے شعر لکھو ..... یہ تمہارے آنسوؤں کا نعم البدل ہے"۔

ایک سال گزر گیا جب بیت النجوم کے منجموں نے اپنی اپنی تحقیقات کا موازنہ اور مقابلہ کیا تو خواجہ میمون اور اسفزاری بے حد خوش ہوئے کیونکہ طلوع و غروب آفتاب کے اندراجات جو انہوں نے خود کیے تھے ستاروں کے اندراجات جو پن گھڑی کی مدد سے کیے گئے تھے ساعت بہ ساعت مل گئے تھے۔

یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ایک سال ۳۶۵ دن اور پانچ یا چھ گھنٹوں کا ہوا ہے اور یہ صورت حال قمری تقویم سے جو مسلمانوں میں رائج ہے یقیناً بہتر ہے۔ جس کی رو سے سال میں ۳۵۴ دن ہوتے ہیں انہیں معلوم تھا کہ قدیم مصری منجموں نے کوئی ایسی جنتری بنائی تھی جو بارہ مہینوں پر مشتمل تھی۔ ہر مہینہ تیس دن کا ہوتا تھا اور سال کے آخر میں پانچ دن تقریبات کے لیے رکھے تھے ..... اس طرح کل ۳۶۵ دن ہوتے تھے۔

"محض ایک چوتھائی دن ہمیں ۳۶۵ دنوں میں اور شامل کرنا ہوگا" اسفزاری نے تجویز پیش کی "اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم ہر چوتھے سال کے دنوں میں ایک پورے دن کا اضافہ کریں؟"

لیکن عمر اور میمون نے اسے یاد دلایا کہ ہماری جنتری صرف چار سال یا چالیس سال کے استعمال کے لیے ترتیب نہیں دی جا رہی۔ بلکہ اس کا نفاذ آنے والی

صدیوں تک رہے گا۔ لہذا انہوں نے طے پایا کہ یہ مشاہدات آئندہ سال بھی کیے جائیں تاکہ گزشتہ سال کے ماہدات سے ان کا موازنہ کرکے صحیح نتیجہ تک پہنچا جا سکے۔ اس کامیابی کی خبریں نیشاپور کے ملاؤں کے کانوں میں بھی پہنچ گئیں جو منجموں کے خلاف عوام کو بھڑکاتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں منجم کافروں کے بنائے ہوئے آلات استعمال کرتے تھے اور ان مردوں کی روحوں سے ہم کلام ہوتے تھے۔ جو قبرستان کی کہنہ و بوسیدہ قبروں میں مقیم تھیں۔

میمون نے اشور وغوغا کی طرف بہت کم توجہ دی اور عمر نے تو اسے بالکل نظر انداز ہی کر دیا لیکن اس کے بوڑھے منجم کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ خیام کوئی نیا مسئلہ حل کرنے میں منہمک ہے۔ جس کی نوعیت کا اسے اندازہ نہ تھا۔ لیکن اس بات کا اسے ضرور یقین تھا۔ یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ بطلیموس نے ہپارکوس کے علم سے استفادہ کیا تھا۔ عمر نے رہوڈ کے عالم کے مخطوطات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ ایک جدید انداز کی تحقیق میں مستغرق تھا۔

''اس کا تعلق چاند گرہن سے مشابہت رکھنے والی چیز سے تھا۔ یہاں تک تو بات بالکل صاف ہے۔ میمون نے اسفزاری کو بتایا۔'' اس کے علاوہ عمر اشکال ندلولی کی مدد سے بھی مسائل حل کرنے میں مصروف ہے۔ جن میں نامحدود اعداد سے بحث کی جاتی ہے''۔

خدائے رحمن ورحیم اس کی رفاقت کرے اسفزاری جو میمون کے مقابلے میں کم عمر اور جرات مند تھا ہنسنے لگا عام اعداد کا شمار ہی میرے دماغ کا کچومر نکالنے کے لیے

کافی ہوتا ہے''۔

وہ صفر (٣) کا دائرہ استعمال کر کے حساب لگا رہا ہے''۔

''یعنی خلا......''

''ہاں ......وہ دائرہ جس کے بعد کچھ نہیں ...... یونانی صفر لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا بیان ہے کہ صفر کے بعد......اس خلا کے بعد...... خیالی اعداد کا ایک لاامتناہی سلسلہ ہے۔

اسغزاری نے کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد بے خیالی میں سر کو جنبش دی ''یہ تو کسی یونانی کا خواب معلوم ہوتا ہے وہ ہمیشہ تکمیل کے خواب دیکھتے رہے اور آپس میں ایک دوسرے سے اس بات پر لڑتے جھگڑتے رہے کہ اس ''تکمیل' کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علماء میں سے جس کا نام رقم یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام تھا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعے زمین کو حرکت میں لایا جا سکتا تھا بشرطیکہ اسے زمین سے باہر کھڑے ہونے کے لیے کوئی جگہ مل جائے اور جب وہ یہ خواب دیکھ رہا تھا تو میدان جنگ میں اسے ایک معمولی سپاہی نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد قدیم زمانے میں ان کے سلطان اعظم سکندر نے ایشیا کے بیشتر ممالک فتح کیے۔ جی ہاں اس نے یہ طے کیا تھا کہ تمام روئے زمین کو اپنی سلطنت میں شامل کرے گا لیکن کیا نتیجہ ہوا۔ بے چارہ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے جوان مرگ ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ہمارے آقا عمر سے بس کچھ ہی زیادہ ہو گی۔ اور اس کے مرنے کے بعد اس کے امرا نے آپس میں لڑ مر کے اس کی مملکت کے حصے بخیے کر

لیے۔ اب تو مجاہدین اسلام ان یونانیوں کا قلع قمع ہی کر ڈالا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یونانیوں نے جو خواب کی تکمیل و ترقی کے دیکھے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا''۔

''آقائے عمر کہتا ہے کہ خیالی اعداد کا وجود ثابت ہے۔ جب وہ ایک خلا (عدم) سے وجود میں لاتا ہے تو صفر کی اس طرف ایک مثبت عدد خارج کر دیتا ہے''۔

''خدا کرے ملاؤں کو اس کی خبر نہ ہو''۔

اسفزاری اپنے نوجوان مددگاروں کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ دوران گفتگو نے کہا حجتہ الحق نے نشے کی ترنگ میں اشکاہدلولی کو ستاروں پر منطبق کر کے خیالی اعداد کی صفیں کی صفیں صاف کر دیں

''اور سنو ایک شب وہ مینار سے نیچے اتر کر نیچے قبرستان میں جا بیٹھا۔ اس کے ہمراہ وہ مالی بھی تھا جو باغ میں لالے کے تختوں کی دیکھ بھال کرتا ہے''۔

سال ختم ہو گیا تحقیقات و مشاہدات کے آخری اندراجات کی تکمیل کی گئی اور عمر اور میمون کو اپنی تقویم کو مکمل کرنے کے لیے آخری دن کے مناسب جزو کا حساب لگانے کے لیے جم کر بیٹھ گئے۔

ایک چوتھائی دن میں چند لمحوں کا فرق ہوتا تھا۔ میمون کے خیال میں 7/29 لیکن عمر کے حساب سے 8/33 کا (۴)

لہذا عمر نے فیصلہ کیا کہ اس طرح ہم ۳۳ سال میں آٹھ دن زیادہ شمار کریں گے''۔

دونوں نے مل کر سالہا سال پر مشتمل جدولیں مرتب کیں جنہیں نظام الملک کی

خدمت میں پیش کرتا تھا۔ وہ بے چینی سے ان کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ میمون اور اسفزاری درباری خلعت پہن کر قلعہ نیشاپور میں نظام الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقویم کا نسخہ پیش کیا۔

اور نظام الملک نے اسے سنہری نقش ونگار سے آراستہ کرانے کے بعد سرخ ریشم کے کپڑے کی جلد بنوائی جس پر اژدھے کی تصویر زردوزی کی گی تھی۔ اس مطلا میں منقش اور خوبصورت جلد کو اس نے بہ نفس نفیس **ملک** شاہ کے حضور میں پیش کیا۔

''سلطان الشرق و الغرب!'' نظام الملک نے بڑے ادب سے عرض کیا ''خداوند نعمت کے حکم سے حضور کے غلاموں نے نئے سرے سے وقت کا شمار کیا ہے۔ انہوں نے وقت کے پچھلے تمام تخمینوں کو غلط پایا۔ اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق یہ گوشوارے حاضر ہیں جن سے آئندہ آنے والے وقت کا صحیح شمار کیا جائے گا۔ میں حضور کے مبارک ہاتھوں میں وہ دستاویز دے رہا ہوں جو اس وقت تک استعمال ہو گی جب تک اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان اس خاک دان زیست میں سانس لیتا رہے گا''۔

ملک شاہ نے بڑے اشتیاق سے اسے لیا۔ زردوزی کیا ہوا اژدھا بھی اسے اسی قدر پسند آیا جس قدر کہ تقسیم جسے وہ ماحقہ سمجھ نہ سکتا تھا لیکن اژدھا اس کا اپنا نشان تھا۔ اس کا اپنا ستارہ تھا۔ آسمان بین اور دانش مند عمر خیام اسے دیکھ کر اس کے حق میں پیشن گوئی کر سکتا تھا کہ اس کا ستارہ اقبال روشن رہے گا۔

''خوب سلطان نے اظہار خوشنودی کرتے ہوئے کہا۔ ان تمام اہل علم کو خلعت

اور اشرفیوں کی تھیلیاں انعام میں دو جنہوں نے بیت النجوم میں بیٹھ کر انتھک محنت کی ہے۔ لیکن ہمارے منجم کو چھوٹا کوہستانی محل "قصر کوچک" میں عطا کیا جائے"۔

نظام الملک نے جھک کر کورنش بجا لاتے ہوئے اس انداز سے زیر لب کہا کہ سلطان کے کانوں تک پہنچ سکے "اب صرف حضور کے حکم کی دیر ہے کہ موسم بہار کی اس شام کو جب شب و روز نقطہ اعتدال پر ہوتے ہیں قمری جنتری کی جگہ حضور کی تمام قلمرو میں یہ نئی جنتری جاری کر دی جائے۔ اس شام ایک نئے دور کا آغاز اور پہلا سال شروع ہوگا اور وہ دور جو خداوند نعمت کے نام سے موسوم ہوگا اسم ہمایونی کی مناسبت سے ہم اسے جلالی سال کہیں گے"۔

اگلے موسم بہار میں مقررہ دن کی شام کو جب روشنی اور سایہ نقطہ اعتدال پر تھے ملک شاہ اپنے تمام درباریوں کو جلو میں لیے ہوئے قلعے کے مینار کی چوٹی پر جلوہ افروز ہوا۔

وسیع میدان کے اس پار سورج غروب ہو رہا تھا۔ نیشاپور کے عوام نے اپنے مکانوں کی چھتوں پر قالین بچھا رکھے تھے اور قندیلیں لٹکا رکھی تھیں۔ ہر طرف رونق تھی کیونکہ جس رات جشن منایا جا رہا تھا۔ چھتاروں (۵) کی آواز اور عورتوں کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ ہر طرف سڑکوں پر نقیب اعلان کر رہے تھے کہ نئے دور کی پہلی ساعت بس آیا ہی چاہتی ہے۔

سنہری زردوزی سے جگمگاتے ہوئے ایک خلعت میں ملبوس عمر خیام' نوجوان سلطان کے شانہ بشانہ کھڑا تھا جو زمین کے آخری کناروں پر آفتاب کو غروب ہوتے

دیکھنے کے لیے منہمک تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ البتہ سورج کے عقب میں بادلوں کی ایک تہہ ضرور نظر آتی تھی۔ جو ڈوبتے سورج کی سرخ کرنوں کے عکس سے اور زیادہ گہری اور سرخ ہو گئی تھی۔

دیکھو ایک بار یش ملا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اللہ نے موت کے پرچم آسمان پر کس طرح لہرا رکھے ہیں۔

ہر شخص نے مڑ کر اس ملا کی طرف دیکھا۔ لیکن امیر الامراء نے بڑے زور سے چلا کر کہا ملاحظہ فرمائیے سلطان عالم عظمت پناہ و نصرت دستگاہ! ملاحظہ فرمائیے حضور کے زرین دور کی پہلی ساعت شروع ہوتی ہے''۔

سورج کا آخری کنارہ بھی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ صرف خالی خولی خون آلود آسما اور اس کے نیچے تاریک زمین باقی رہ گئے۔ سڑکوں سے لاتعداد ملی جلی آوازوں کا شور اور قلعے کے مینار کے صحن سے شادیانوں کی صدائیں آنے لگیں۔ عمر نے فصیل کے قریب جا کر نیچے دیکھا ہر چیز سے بے پرواہ۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دھندلی دھندلی نظر آنے والی پن گھڑی اپنا کام خاموشی سے انجام دے رہی تھی۔ جو قطرہ ٹپکتا تھا نئے وقت کا اعلان کر رہا تھا' لیکن کیا وقت کی رفتار میں کبھی فرق آیا ہے؟ جمشید اور کیخسرو کے زمانے میں بھی یہی سورج سطح زمین کو اپنی روشنی بخش رہا تھا۔

''کیا آنے والی صبح'' ملک شاہ نے عمر کے کان میں کہا'' ہرن کے شکار کے لیے مبارک ہو گی''

عمر نے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہوئے کہا'' میں حساب لگا کر بتا سکتا ہوں

اگر سلطان معظم رخصت ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں‘‘

عمر محل سے نکل آنے پر بہت خوش ہوا۔ جعفر ک نے آدھی رات کے بعد جب اسے تلاش کیا تو وہ اپنے مطالعہ و عمل کے کمرے میں قندیل روشن کیے ہوئے تنہا بیٹھا تھا حالانکہ نیشاپور کا ہر فرد جشن منا رہا تھا‘ ہنوز درباری خلعت میں ملبوس تھا۔

’’ہمارے آقائے نامدار سلطان عالم مسخرے نے بلند آواز سے کہا ’’شکار کو روانہ ہونے کے لیے نیک ساعت معلوم کرنے کے منتظر ہیں‘‘۔

’’تو پھر جا کر عرض کر دے کہ میں نے زائچہ دیکھ لیا ہے...... نہیں...... ہاں جا کر کہہ دے کہ سلطان عالم جب وقت چاہیں اور جہاں چاہیں بلا خوف و خطر شکار فرما سکتے ہیں‘‘

’’لیکن ملا کہتے ہیں کہ موت کے پھریرے آسمان پر لہرا رہے ہیں‘‘۔

’’ملا تو اس لیے بری فال نکالتے ہیں کہ وہ نئی تقویم سے ناراض ہیں‘ لیکن ملک شاہ آج بھی آفات سے اتنا ہی محفوظ ہے جیسا کہ کل تھا‘‘۔

’’آقا آپ کو یقین ہے؟

’’بے شک!‘‘ عمر نے بڑے وثوق سے کہا

جعفر ک کو اب بھی تامل تھا ’’اچھا میں جاتا ہوں لیکن کیا آپ یہاں اسی طرح تنہا بیٹھے رہیں گے۔ محل قہقہوں اور نغموں سے گونج رہا ہے۔ وہاں ہر شخص خوشی سے سرشار ہے‘‘۔

’’اور میں...... یہاں‘‘ عمر نے بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا ’’میرے

شریک نشاط! تو وہ کچھ دیکھے گا جو تجھ سے انسانوں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا"۔

جعفرک نے اثبات میں زیرِ لب کچھ کہا تکلیف اور اعتبار کے ملے جلے جذبات کے ساتھ خاموشی اور تنہائی میں اسے کبھی خوشی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اپنے بھاری خلعت سے بے پروا عمر اک دم کھڑا ہو گیا اور مینار کے زینے کی سمت چل پڑا۔ وہ اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر تانبے کے بنے ہوئے گلوب کے نزدیک پہنچ گئے۔

"ادھر دیکھ جعفرک تجھے کچھ نظر آتا ہے؟"

"ستارے صاف شفاف آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے"۔

وہ اپنا سر ایک طرف جھکا کر غور کرنے لگا۔ تو صحیح ہے کہ وہ ستاروں کو حرکت کرتے ہوئے تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن بیت النجوم کے قیام کے دوران میں اسے اس بات کا علم ضرور ہو گیا تھا کہ ستارے بھی چاند سورج کی طرح طلوع ہوتے اور ڈوبتے ہیں۔ وہ جوزا کے چمکدار سرے کو دیکھ کر یہ بتا سکتا تھا کہ رات آدھی ڈھل چکی ہے۔ "وہ اکثر کہتا ہے یقیناً ستارے حرکت کرتے ہیں۔ وہ ہر روز آہستہ آہستہ زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ میں نے اس سے قبل بھی اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہے"۔

"اور یہ ہماری زمین یہ کیا چیز ہے"؟

"گیند کی طرح گول ہے۔ میرے آقا بالکل اس تانبے کے بنے ہوئے کرے کی طرح۔ یہ ہر چیز کا مرکز ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور بس صرف یہ زمین ہی

ساکت ہے اور اپنی جگہ رپ قائم ہے۔ خواجہ میمون نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔

کچھ دیر عمر انتظار کرتا رہا۔ دریا کے کنارے رات کو اڑنے والے پرندے اپنے بازو پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ایک الو خاموشی سے اڑتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کے چہروں پر سرسرانے لگے۔

'میں نے یہ مشاہدہ کرنے کے لیے دو سال کی محنت کی ہے'' عمر نے شگفتہ لہجے میں کہا'' اور اب میں دیکھ رہا ہوں جعفر ک ذرا ایک بار پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھ۔ روشنی کے یہ لاتعداد نقطے ہمیشہ باقی رہنے والے ستارے حرکت نہیں کرتے انسان کے وجود سے پہلے بھی یہ وہاں موجود تھے دور بہت دور''۔

''نہیں میرے عزیز! بے وقوف یہ زمین جس پر ہم کھڑے ہیں حرکت کرتی ہے۔ یہ گیندسی گول زمین ایک دن اور ایک رات میں اس طرف سے اس طرف چکر لگا لیتی ہے۔ اوپر نظر اٹھا کر ان ستاروں کو دیکھ یہ کیسے نظر آتے ہیں''۔

یکا یک جعفر ک نے اپنی گردن جھکا لی اور کانپنے لگا'' آقا مجھے ڈر لگ رہا ہے''۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''رات بدلی بدلی نظر آ رہی ہے کسی غیر مرئی طاقت نے آپ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں۔ مجھے یہ مینار گھومتا ہوا محسوس ہو رہا ہے'' اس کے جسم کی کپکپاہٹ اور زیادہ ہو گئی اور اس نے فصیل کی دیوار کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرے آقا! اپنے الفاظ واپس لیجیے ......نہیں تو......نہیں تو ......نہیں تو ہم گر پڑیں گیل مجھے یہ مینار حرکت کرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اور ہم ضرور گر پڑیں گے''۔

عمر نے تحکمانہ انداز میں چلا کر کہا ''نہیں ہرہرگز نہیں کر سکتے صرف زمین گھومتی ہے اور ہم ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ ہم بھی دوسری دنیاؤں کے ساتھ ساتھ خلا میں پرواز کر رہے ہیں جو ممکن ہے سورج کی طرح طاقتور دورافتادہ اور قائم بالذات ہوں۔ کیا تجھے نظر آتا ہے کیا تو یہ سب محسوس نہیں کر سکتا جعفرک؟''

''خدا مجھے اپنی حفظ وامان میں رکھے''۔

اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر جعفرک سسکیاں لینے لگا۔ اب اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ آقا جس پر وہ جان چھڑکتا ہے پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''مجھے اب جانا چاہیے۔ مجھے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر شکار پر روانہ ہونے کے لیے نیک فال کی گزارش کرنی چاہیے۔

اور وہ زینے کے اندھیرے کنوئیں میں اتر گیا۔ خوف نے اس کی آنکھوں پر تاریک نقاب ڈال دی تھی۔

حوالہ جات

ا۔ ایک قسم کا خوشبودار پودا جس کی پتیاں بھوری سبز ہوتی ہیں اور عام طور پر پکانے کے کام آتی ہیں۔

۲۔

می خور کہ ز دل کثرت و قلت ببرد

و اندیشہ ہفتاو و دو ملت ببرد

پرہیز   مکن   زکیمیائی   کہ   ازہ

یک   جرعہ   خوری   ہزار   علت   ببرد

۳۔ صفر گیارہویں صدی کے مسلمان سائنسدان قرون وسطیٰ کے یورپی علماء سے بہت پہلے صفر کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے بہت سے کم لوگوں کو یہ علم تھا کہ اعداد مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی (ہیر لڈلیم)۔

۴۔ علماء کے رخ سے اس میں عمر خیام کا محسوب ملال بڑی حد تک صحیح ہے جس کی رو سے سال میں 54، 19 سیکنڈ زائد نکلتے ہیں۔ حالانکہ آج کل جو سال رائج ہے اس میں 26 سیکنڈ زائد ہوتے ہیں۔

۵۔ ایک طرح کا ستار جس میں چھ تار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اختتام------------------------حصہ اول

ہیرالڈلیم

مترجم جمیل نقوی

Умари Хайём - Omar Khayam

باب چہارم

نیشاپور کا بڑا بازار۔ بردہ فروشوں کی گلی میں نیلام گھر...... سلطان ملک شاہ کی زیچ کا ساتواں سال

نقیب نے کھڑے ہو کر پیتل کی ایک تھالی بجاتے ہوئے اعلان کیا "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اب نیلام شروع ہونے والا ہے۔ خریدارو ادھر توجہ دو"۔

تمام لوگ پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ امراء تاجر' زمیندار جو تن درست اور جفا کش باندیوں کی تلاش میں آئے تھے۔ نیشاپور کے شرفاء میں جنہیں نئی کنیزوں کی ضرورت تھی یہ خبر پہلے ہی سے گشت کر رہی تھی کہ شام کے ان علاقوں سے غلاموں کا نیا کارواں آیا ہے جہاں ملک شاہ کو زیادہ فتوحات ہوئی ہیں۔

مجمع اتنا کثیر تھا کہ دلال کو پتھر کے بڑے ستون کے قریب چبوترہ خالی کرانے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ تا کہ وہ اپنی پیش کش کی نمائش خوب اچھی طرح کر سکے۔

ملاحظہ فرمائیے اے ذی علم امراء۔ اس نے با آواز بلند کہا یہ ایک یونانی لڑکا ہے جس کی عمر بمشکل چودہ سال ہو گی۔ تندرست و توانا۔ اس کے منہ میں پورے بتیس دانت ہیں۔ اس کے جسم پر نہ کوئی داغ ہے نہ اسے کوئی بیماری ہے۔ بانسری خوب بجاتا ہے اور اس اسلامی طریق پر اس کے ختنے بھی ہو چکے ہیں۔ کون اس کیلئے تیس دینار

خرچ کرنا پسند کرے گا؟ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ''پچیس دینار اچھا بیس دینار جلدی کیجیے یہ قیمت تو ایک کروی گھوڑے سے بھی کم ہے''۔

لڑکا بے حس وحرکت کھڑا تھا۔ اس کا جسم کمر تک نیم برہنہ تھا۔ دلال نے اس کا بازو اوپر اٹھا کر آہستہ آہستہ اس کے جسم کو نمائش کے لیے چاروں طرف گھمایا۔ تا کہ اس کا بے داغ گورا بدن ہر شخص دیکھ سکے۔ اس سے کچھ روز قبل نوجوان غلاموں کی کثیر تعداد میں آمد کی وجہ سے قیمتیں بہت گر گئی تھیں مگر غلاموں کی نئی کھیپ آنے سے پہلے ان قیدیوں کا فروخت ہونا بھی ضروری تھا۔

یونانی لڑکے کی پسلیاں اوپر سے صاف نظر آ رہی تھیں وہ نیم فاقہ زدہ نظر آتا تھا اور بھوک سے بیتاب اور نڈھال ہو رہا تھا۔

بے شک ایک وجیہ ایرانی نے چلا کر کہا ''ایک گھوڑا اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ نہ تو یہ ہماری زبان سمجھتا ہے اور عمر کے اعتبار سے بھی یہ خواجہ سرائی نہیں کر سکتا۔ میں گیارہ دینار دے سکتا ہوں''۔

گیارہ خدا کی قسم یہ کافی......نہیں اس نوجوان میں مسلمان کی رگوں میں شریف خاندان کا خون گردش کر رہا ہے۔ آپ ہی سوچئے کیا اس کی قیمت ایک گائے سے بھی گئی گزری ہے؟ صرف گیارہ دینار؟''

''اس قسم کا یونانی تو نیزہ اور ڈھال اٹھانے کے بھی قابل نہیں'' ایک اور تاجر نے بلند آواز سے کہا ''بارہ''۔

''بارہ......درہم''۔

یہ نیلام ہو رہا ہے یا خیرات بٹ رہی ہے۔؟ دلال نے طنزیہ طرح پر بلند آواز سے کہا۔ وہ پہلا ہی سودا اتنے سستے داموں بیچنے کو تیار نہ تھا۔

''خیرات نہیں تو اور کیا ہے'' وجیہ ایرانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''ایسے ایسے لونڈے تو سوق بغداد میں دس درہم سے بھی کم فروخت ہو رہے ہیں۔ اچھا تو میری بولی ہے بارہ اور چار''۔

ایک سوداگر نے اس لڑکے کو تیرہ دینار اور تین درہم میں خرید لیا۔ ایک حبشی عورت نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کے کان میں کہا کہ ہم لوگ تو اور بھی سستے داموں میں فروخت ہوں گے''۔

حبشن نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا ''ایک مرتبہ ایک سردار نے مجھے تین سو سنہری سکوں کے عوض خریدنا چاہا تھا''۔

''ارے اب تو نہ معلوم کتنے بچے جن چکی ہے'' لڑکی نے زیر لب جواب دیا ''یہ بڑی پرانی بات معلوم ہوتی ہے''۔

''ترک ان لوگوں سے بدرجہ بہتر ہیں'' حبشن نے بات آگے بڑھائی ''یہ لوگ تاجر ہیں کنجوس تیرے لیے تو عائشہ کوئی سو دینار بھی دینے کو تیار نہ ہو گا''۔

عائشہ نے اپنا سر گھٹنوں میں دبا لیا اور سوچنے لگی۔ اس کے دانت بہت خوبصورت تھے۔ اور جسم بھی خاصا سڈول تھا۔ بلکہ ایرانی مذاق کے مقابلے میں قدرے نازک۔ وہ نسبتاً عرب تھی۔ بنو صفا کے قبیلے سے۔ اور اس کا رنگ ایرانی عورتوں کے مقابلے میں ذرا میلا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں جیسا کہ حبشن کا اگر اسے نچی

طور پر فروخت کیا جاتا تو یقیناً کسی نوجوان امیر کی نگاہ انتخاب اس پر پڑ سکتی تھی۔

اس تجربہ کار حبشن کے برخلاف عائشہ اپنی تقدیر پر شاکر ہونے کو تیار نہ تھی۔ دل ہی دل میں وہ اس تصور ہی سے کھول رہی تھی کہ کہیں اسے کسی ایسے دکان دار کے ہاتھ فروخت نہ کر دیا جائے جو بیک وقت اس سے روٹیاں بھی پکوائے اور......"

اس غصے اور خوف کی کیفیت میں اس نے خدا سے دعا کی کہ کاش ایسا کبھی نہ ہو۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم اتنے ہی داموں میں بکو گی جتنی تمہاری قیمت ہے۔ زقوم کے درخت میں پھل کبھی نہیں آتا" حبشن نے یہ کہتے ہوئے اپنے بالوں کی لٹ جو اسکی پیشانی پر لٹک رہی تھی اوپر کی اور آئینے کے ایک ٹکڑے میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اری ذرا سن تو۔ ہی ان دو چیچک رو یمنیوں کو اس یہودی نے بیس دینار میں خریدا ہے۔ ہائے ہائے کیا برا وقت آ گیا ہے......کیا زمانہ آ گیا ہے"

عائشہ ایک دفعہ پہلے بھی بغداد میں فروخت ہو چکی تھی۔ صحرا میں آزاد رہنے والی روح اس کے اندر چیخ اٹھی۔ اس نے اپنی نقاب کے گوشے سے خریداروں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ دل ہی دل میں انہیں کوتی رہی۔ پھر یکایک بالکل ساکت ہو گئی۔

ایک سوار مجمع کے قریب آ کر رکا...... ایک ایسا شخص جو مجمع سے قطعاً بے پروا معلوم ہوتا تھا۔ اسکی پگڑی کے طرے میں ایک بڑا سا زمرد جگمگا رہا تھا۔ بظاہر وہ کوئی مشہور شخص معلوم ہوتا تھا اس کیونکہ ہر شخص نے بلا ارادہ اسے گردن موڑ کر دیکھا۔ اور ایک محافظ نے دوسرے سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ شخص شاہی منجم ہے جو دربار سے

واپسی پر مٹر گشت کرتا ہوا ادھر آ نکلا ہے۔

عائشہ نے سوچا کہ یہ نووارد ضرور کوئی صاحب اقتدار عہدیدار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے چہرے پر تھوڑی سی کرختگی ہے اور جڑی بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں شاہین کی سی نظر آتی ہیں لیکن اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ عائشہ نے ایک گہرا سانس لیا اور دفعتاً اپنے گھٹنوں پر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جا" محافظ نے عائشہ کو ڈانٹا "ابھی تیری باری نہیں آئی"۔

لیکن عائشہ جھپٹ کر مجمع کو چیرتی پھاڑتی ایک خوف زدہ ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی سوار کے پاس پہنچ گئی۔ اور اس کی رکاب مضبوطی سے پکڑ لی۔ غریبوں کے والی اس نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا "مدد کیجیے میں ایک عالی مرتبہ شیخ گھرانے کی فرد ہوں...... میرے والد بنو صفا کے سردار تھے"۔

یہ ایک سفید جھوٹ تھا...... اور اب اے امیروں کے امیر یہ لوگ مجھے ان چھوکروں اور بے ہنگم لوگوں کے ساتھ بیچ بازار میں فروخت کر رہے ہیں"۔

عمر نے اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا جن سے التجا ٹپکتی تھی۔ اس نے سڈول اور جوانی سے بھرپور شانوں کا گداز محسوس کیا۔ اور خوبصورت گردن کی قوس پر بھی نظر ڈالی۔ عائشہ نے اس وقت شرما کر نقاب گرا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی لرزش تھی۔ جیسے وہ کوئی زیر لب درخواست کر رہی ہو۔ دل ہی دل میں وہ دعا مانگ رہی تھی کہ کاش عمر عربی سمجھتا ہو۔

عائشہ نے جو کچھ کہا تھا عمر اسے اچھی طرح سمجھ گیا تھا لیکن اس کی آنکھیں

عائشہ کی آنکھوں پر مرکوز تھیں جنہوں نے دس سال کے بعد یاسمین کی یاد تازہ کر دی تھی۔

دلال مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور عائشہ کے شانے کو غصے سے پکڑتے ہوئے چلایا ''بس اب نخرے ختم کر...... چل اپنی جگہ...... مادہ پلنگ!'' اور عمر کو بڑے احترام سے سلام کیا ''امید ہے آپ نے اس کا باتوں کو برا نہ مانیں گے۔ خواجہ اس لڑکی کا مزاج ہی آسیب زدوں جیسا ہے''۔

عائشہ بدستور عمر کی رکاب تھامے کھڑی تھی۔ اس کے رخسار عمر کے گھٹنے کو مس کر رہے تھے۔

اس کی قیمت کیا ہے؟ عمر نے سوال کیا۔ خیر کوئی بات نہیں...... میں سو سنہری سکے پیش کرتا ہوں۔

معقول منافع کی خوشبو لیتے ہوئے دلال نے مڑ کر مجمع پر نظر ڈالی جو چبوترے سے اتر کر ان کے چاروں طرف جمع ہو گیا تھا۔ اور بلند آواز میں کہا ''مومنو ایسی لاثانی دوشیزہ کا مول بھی کہیں سو دینار ہو سکتا ہے۔ سینہ اور قد سرو کی طرح حسین ہے۔ مزاج ہرن کے بچے کی طرح چلبلا۔ اور جو بلبل کی طرح چہچہاتی ہے۔ اس کا گانا دماغ کی پریشانیوں کو محو کر دیتا ہے۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا جو بولی آگے بڑھانے کے لیے مجمع میں شامل ہو گیا تھا ''کوئی ہے جو اس سے زیادہ دام لگائے''۔

''ایک سو اور دس'' مصنوعی خریدار نے چلا کر کہا۔

''دوسو'' عمر نے آواز لگائی ''اب یں اسے اپنے ہمراہ لے جا رہا ہوں نیلامی میرے گھر آ کر اپنی رقم لے جانا''۔

''الحمد اللہ'' نیلامی نے زور سے کہا۔ اسے اس عرب لڑکی کے بدلے ستر دینار سے ایک کوڑی زیادہ موصول ہونے کی امید نہ تھی۔ مومنو دیکھتے ہو ہمارے معزز آقا کا ہاتھ کس قدر کھلا ہوا ہے۔ کیسا شاندار مذاق ہے اس کا۔ کیا شاہانہ فیاضی ہے بہر حال اب اس گانے والی کنیز عائشہ کو خواجہ عمر نے خرید لیا ہے۔ دوسو......'' اور اس نے سوچا کہ اس وقت مجمع کی توجہ عمر کی طرف ہے اور اس طرح تھوڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔...... ''بیس دینار کی حقیر رقم میں جو میری کمیشن ہے۔ ارومزید پانچ دینار بازار کی مسجد کے لیے چندہ سبحان اللہ کیا سخاوت ہے۔ اس حسین معطربہ کی سواری کے لیے ایک میانہ مہیا کیا جائے گا اس کی نگہبانی کے لیے ایک حبشی خواجہ سرا کی خدمات حاصل کی جائیں گی؟ اور اس کی قیمت کتنی قلیل ہے!!''

لیکن عمر نے اپنے ملازم کو جو اس کے پیچھے ایک گھوڑے پر سوار کھڑا تھا اترنے کا اشارہ کیا۔ اور عائشہ جلدی سے خالی زین پر سوار ہو گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات ختم ہوتے ہوتے اس کا آقا اپنی رائے بدل دے۔ اس نے تعظیماً عمر کے سامن اپنا سر جھکا دیا تا کہ وہ اس کے چہرے پر پوری طرح نقاب ڈال دے وہ اب اس کی ملکیت بن چکی تھی۔۔

جیسے ہی گھوڑوں نے آگے قدم بڑھایا۔ عائشہ نے گردن موڑ کر حبشی لونڈی پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی۔

"لڑکی" "عمر نے اس سے مخاطب ہو کر کہا" کیا تو واقعی بنو صفا کے شیخ کی بیٹی ہے؟"

دل کا چور اس کے ہونٹوں پر آ کر رک گیا۔ اُسے عمر کے چہرے پر اس انداز سے نظر ڈالی جیسے ایک کتا یہ سمجھنے کے لیے اپنے مالک کے منہ کی طرف دیکھتا ہے کہ الفاظ کے پس منظر میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ "نہیں عالی جاہ! میں شیخ کی بیٹی نہیں ہوں"۔ اس نے بلند آواز سے اپنی غلط بیانی کی تردید کی۔ وہ جھوٹ تھا۔ لیکن گاتا مجھے واقعی آتا ہے۔"

عمر مسکرایا۔ اور عائشہ حیران ہو کر یہ سوچنے لگی کہ یہ کس مزاج کا آقا ہے جو ایک حسین دوشیزہ کے منہ سے سچی بات کہلوانا چاہتا ہے۔

دامن کوہ میں قصر کو چک کا پائیں باغ نیشاپور کے مشرق میں دو روز کی مسافت پر

عائشہ کو اس بات پر بڑا عجب ہوا اور یہ تعجب ایک حد تک بجا بھی تھا...... کہ سلطان کے ستارہ شناس پر نہ تو اس کے حسن و شباب نے کوئی اثر کیا اور نہ وہ اس سے شب باش ہوا۔ لیکن اس نے خود ہی دل کو تسلی دی کہ غالباً عمر ایک مہینہ انتظار کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس زمانے کی رسم تھی۔ صحرائی جنگ و جدل کے زمانے میں جنگجو قیدی عورتوں سے یا تو جنگ کا جوش ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی لطف اندوز ہو لیتے تھے یا پھر رسم و رواج کے مطابق ایک ماہ انتظار کرتے تھے۔ عائشہ کو جب ایک محافظ دستے کے

ہمراہ نئے آقا کے گرمائی محل روانہ کیا گیا تو اس نے کسی قسم کی سنگی محسوس نہیں کی۔ اس
ن وہاں پہنچتے ہی عمر کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کر لیں

پہلی بات جو اسے وہاں جا کر معلوم ہوئی وہ خلاف امید بڑی حیران کن تھی۔ محل جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا تھا بہت ہی مختصر تھا۔ وہ خوبصورت نیلے رنگ کے ٹائلوں سے بنایا گیا تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک کوہستانی باغ تھا۔ جس کے اس طرف بھورے رنگ کا میدان چھپا ہوا تھا۔ عائشہ کو رہنے کے لیے جو کمرہ ملا تھا اس کے دروازے چھت کی طرف کھلتے تھے۔ اور ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی اسے یہ معلوم کر کے تسکین ہو گئی کہ اس کے قماش کی دوسری عورت وہاں موجود نہیں ہے۔

''نہیں! ہمارے آقا کی کوئی بیوی ہی نہیں ہے'' بوڑھی زلیخا نے یقین دلاتے ہوئے کہا ''سنا ہے کہ ایک دفعہ اس نے شادی کی تھی لیکن دلہن گھر پہنچنے سے پہلے ہی طاعون سے مر گئی تھی''۔

مطبخ کی منتظمہ ہونے کی حیثیت سے بوڑھی زلیخا کو دنیا جہان کی خبریں معلوم رہتی تھیں۔

''کبھی کبھی'' اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ ناچنے والی لڑکیوں کو چند ساعتوں کے لیے یہاں لاتا ہے لیکن بہت جلد ان سے تھک جاتا ہے اور تحفے تحائف دے کر انہیں رخصت کر دیتا ہے''۔

عائشہ نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ اسے تحفے دے کر یونہی اس قدر جلد رخصت نہ کرے گا۔ بے شک اس نے اسے خریدا ہے اور اس طرح اس پر کچھ ذمے

داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ لیکن عائشہ کو ایسی نوجوان کنیزوں کا حشر بھی اچھی طرح معلوم تھا جو اپنے آقاؤں کی دل بستگی کا سامان مہیا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ بہر حال قصر کوچک میں قیام اسے بہت ہی خوش گوار محسوس ہو رہا تھا۔

پائیں باغ میں ایک نہر تھی جو سرو کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے گزرتی ہوئی ایک حوض میں گرتی تھی۔ حوض کے چاروں طرف قالین بچھے تھے ہر طرف سفید گلاب کی بیلیں چڑھی تھیں حتیٰ کہ مٹی کی بنی ہوئی فصیل سرتاوران سے ڈھکی ہوئی تھی ایک کونے میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا خیمہ ایستادہ تھا۔ عائشہ اس میں موٹے گدیلوں پر لیٹی مزے لے لے کر مصری ڈلیاں چوستی رہتی۔ فوارے کی بہار دیکھتی۔ ناخنوں پر مہندی لگاتی رہتی۔ غرضیکہ عائشہ کے لیے قصر کوچک کی زندگی بڑی پر بہار تھی۔

''اس کے علاوہ'' زلیخا نے فخر سے بتایا ''اور بھی بہت سی جگہیں ہیں ہمارے آقا کا ایک محل نیشاپور میں ہے۔ دوسرا قصر سلطانی کے قریب مرو میں ہے۔ اس کا ایک اور محل بھی ہے جسے بیت النجوم کہتے ہیں۔ وہاں لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے عالم کام کرتے ہیں ہمارے آقا کے حکم سے وہ وہاں بیٹھ کر کتابیں تصنیف کرتے ہیں۔''

''واہ کتابیں تصنیف کرتے ہیں''؟

''ہاں کتابیں ہمارے آقا کے یہاں کتابیں اس طرح ہیں جیسے کھجوریں۔ خود اسنے سلطان کے لیے الجبرے کی ایک کتاب تیار کی تھی''۔

''ارے کیا کہہ رہی ہو؟''

''ایک الجبر اس کا تعلق جادو کے اعداد و شمار سے ہے۔ ہمارا آقا اس قدر دانش مند ہے کہ اسے وہ سب کچھ معلوم ہے جو گزر گیا۔ اور وہ بھی جو آئندہ ہونے والا ہے..... خدا کے فضل سے۔ اسی وجہ سے تو سلطان بغیر اس کے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کا اقتدار بھی اتنا ہی بلند ہے جتنا نظام الملک کا۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ شاہی دعوتوں میں وہ فوجی اعلیٰ عہدے داروں سے بھی پہلے بیٹھتا ہے۔ حالانکہ ہمارے سلطان کو فوج سے زیادہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں علاوہ شکار کے''۔

یہ بات عائشہ کی سمجھ میں آسانی سے آ گئی۔ جنگ حملے شکار طاقت ور لوگوں کے مشاغل کا اہم جزو تھے۔ جو عورتوں کو یا تو تفریح کا ذریعہ تصور کرتے تھے یا پھر ان سے نسل کشی کا کام لیتے تھے۔ انسان جتنا طاقت ور اور با اقتدار ہوتا تھا اسی تناسب سے اس کے یہاں عورتیں خوبصورت اور زیادہ تعداد میں موجود ہوتی تھیں۔

''اور وہ بڑی شاندار دعوتیں کرتا ہے!'' زلیخا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ پہلے ہی دن سے اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ عائشہ گھریلو معاملات میں دخل نہ دے گی۔ وہ اس کے ساتھ بہت گھل مل کر باتیں کرتی تھی۔ ایک چیونٹی کے بل میں تو شبنم کا ایک قطرہ بھی طوفان کے برابر ہوتا ہے۔ ''میں کیا بتاؤں وہ باغ میں بیٹھ کر صراحیاں کی صراحیاں خالی کر دیتے ہیں۔ بھنے ہوئے تیتر' ہرن کے کباب' منوں چاول اور زعفران۔ شاہی لکڑوں کی قابیں کی قابیں' پہاڑی بلندیوں پر برف میں لگے ہوئے تربوزوں کے ڈھیر' بس وہ بیٹھے کھاتے رہتے ہیں اور مسلسل باتیں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ستارے ماند پڑنے لگتے ہیں''۔

''کیوں نہ ہو! تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی تو بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو اس طرح مہکتی ہے جیسے نجد کے کسی باغ کی خوشبو۔ لیکن آ کر وہ باتیں کیا کرتے ہیں۔ دل بہلانے کے لیے ان کے پاس حسین لونڈیاں بھی نہیں ہوتیں''۔

''کبھی وہ نجوم اور ریاضی کے مسائل پر بحث کرتے ہیں کبھی مذہب اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں اور نہ جانے الم غلم کیا کیا بک بک جھک جھک کرتے ہیں۔ میری جان! وہ ایسے موٹے موٹے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان کو سمجھنے کی کوشش میں میرا تو سر چکرانے لگتا ہے۔''

عائشہ نے بھی سوچا کہ ایسی بھاری بھرکم باتیں سن کر سر نہ چکرانا تعجب کی بات ہے۔ زلیخا کی گفتگو خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زلیخا معمول میں باتیں کر رہی ہو۔

وہ ان ایرانیوں سے اپنا مقابلہ کرنے لگی۔ چند ہے دربان سے لے کر اس کوزہ پشت تک جو سفید خچر پر سوار ہو کر آتا جاتا ہے۔ سارے کے سارے اپنے آقا کی فیاضی پر گزر بسر کرتے تھے۔ وہ سونے سے زیادہ باتیں کرتے تھے۔ اور کام کرنے سے زیادہ سوتے تھے۔ ان کے سر پر کوئی نگران نہ تھا جو انہیں اپنے فرائض سرانجام دینے پر مجبور کرتا۔

باغ کی نگرانی کے لیے بیس باغبان مقرر تھے جن میں بڑے مالی سے لے کر خاکروب تک شامل تھے۔ سوائے اپنے ذاتی معاملات اور باغ کے متعلق تھوڑی بہت باتیں کرنے کے شاید ہی کبھی وہ کام کو ہاتھ لگاتے ہوں۔ وہ اپنی خواب گاہ کی

چھت سے ان سب کی باتیں سنتی رہتی تھی ''ارے بھائی علی! پچھلی برسات بنفشہ کی کیاریوں میں پانی کے ریلے کے ساتھ سنگ ریزے بہہ کر آ گئے تھے۔ میں سوچتا ہوں وہ کیاریاں صاف کر کے ان کی گدائی کر دوں......'' علی جواب دیتا ''بھائی حسین! شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کام کے لیے وہ زمانہ نہایت مناسب ہوتا ہے۔ جب آفتاب خط استوا کو قطع کرتا ہے۔ پھر یہ کام احمد کا ہے اور اللہ اسے شفا دے۔ بے چارہ کب سے بیمار ہے......''

''لیکن آقا نے اگر کسی وقت یہاں آن کر ان اجڑی ہوئی کیاریوں کو دیکھ لیا تو کیا اس کی خفگی حق بجانب ہو گی......'' اس میں کیا شک ہے۔ انشاء اللہ میں اس کام کو بہت جلد کروں گا۔ سنگ ریزے نکال کر مرجھائی ہوئی پتیوں کو صاف کر کے۔ کل ضرور کیاریوں کی گدائی کر دوں گا''۔

لیکن کل پھر علی انتظار کرے گا کہ احمد کا لڑکا آ کر اس کا بیلچہ درست کر دے جو پچھلے سال خزاں کے موسم میں ٹوٹ گیا تھا۔

اور حسین بھئی سنتے ہو! یہ بہت ضروری کام ہے کہ روشوں میں جو گڑھے پڑ گئے ہیں انہیں فوراً بھر دیا جائے۔ مبادا چلتے چلتے ہمارے آقا کا پاؤں کسی گڑھے میں جا پڑے تو بس سمجھ کہ قیامت ہی برپا ہو جائے گی......'' ''بھئی علی آ کل میں تو گلاب کی کیاریاں کھودنے میں لگا ہوا ہوں وہ کام تو ایک ساتھ نہیں کر سکتا؟''

اور واقعہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ گلاب کی کیاریوں کی گدائی وغیرہ تو کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ البتہ گاؤں کی پن چکی والے کی لونڈیا کیلئے عمدہ عمدہ سرخ پھولوں

کا ایک ہار بنانے میں مصروف تھا۔ لیکن دل سے وہ یہی چاہتا تھا کہ گلاب کے تختوں کی گدائی نرائی کرے ان کی شاخوں کو کانٹ چھانٹ کر انہیں جاذب نظر بنائے......

حسین نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ کل سے ضرور یہ کام کر دے گا۔

اور اگر اتفاق سے وہ کسی دن صبح کے وقت تھوڑا بہت کام کر لیتے تھے تو بس پھر گیا تھا۔ دن ڈھلے تک سرو کے درختوں کے سایے میں پڑے خراٹے لیتے رہتے۔ سارے اوزار بے ترتیبی سے دھوپ میں پڑے رہتے تھے۔ اس دوران میں اگر کسی وقت ان کی آنکھ کھ جاتی تو دھوپ کی تیزی کا خیال کر کے پھر اونگھنے لگتے اور بالآخر بقیہ کام دوسرے دن کے لیے ملتوی ہو جاتا۔

اس کے باوجود ہمیشہ باغ ہرا بھرا رہتا۔ ساری فضا گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مہکتی رہتی۔ گلاب کی ہری بھری شاخوں کے شامیانے کے نیچے ہمیشہ ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں موجود رہتی۔ عائشہ اکثر وہاں آ کر لیٹ جاتی۔ اونگھتی رہتی اور عمر کے آنے کا انتظار کرتی رہتی۔

عائشہ کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں اور آخر ایک دن عمر سچ مچ آ ہی گیا۔ سارے قصر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ دربان نے اپنے آقائے نامدار کو جیسے ہی دور سے دیکھا جلدی جلدی اپنی بہترین پوشاک پہن کر استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ سارے باغبان...... حتیٰ کہ احمد بھی جو بیماری کا بہانہ کر کے ہر وقت پڑا اینڈتا رہتا...... اپنے اپنے اوزار سنبھال کر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ اور عمر کو آتا دیکھ کر اس طرح سربستہ کھڑے ہو گئے جیسے اس کی آمد سے ان کی مصروفیت میں ذرا دیر کے

لیے خلل واقع ہوگیا تھا.....ادھر زلیخا نے باورچی خانے میں دھڑا دھڑ اٹھا پٹخ کر کے وہ طوفان بدتمیزی برپا کی کہ باورچی خانے پر بھوت گھر کا شبہ ہونے لگا۔

عائشہ کا باغ میں آنا جانا موقوف ہوگیا۔ تقریباً آدھے درجن مہمان عمر کے ہمراہ آئے تھے۔ اور قصر کوچک کا والی کئی ہفتے تک دن رات اپنے معزز مہمانوں کی خاطر مدارت میں مصروف رہا۔ کچھ مہمان اگر رخصت ہو جاتے تو ان کی جگہ دوسرے آ جاتے تھے۔ غرض کہ اسی طرح مہمانوں کے آنے کا سلسلہ ہفتوں جاری رہا۔ عائشہ یا تو اپنے کمروں میں وقت گزارتی یا کبھی کبھی گہرا نقاب ڈال کر چھت پر جا بیٹھتی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے رہتے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ عمر اسے بالکل بھول ہی گیا ہو.....

جب تک مہمان دیوان خانے میں موجود رہے عائشہ کو عمر سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اور وہ بھی تھی بھی تو ایک نوخرید کنیز.....زلیخا کے ذریعے عمر کو کسی قسم کا پیغام بھیجنے کی اس میں ہمت نہ ہو سکی۔ کبھی وہ سوچتی کہ شاید عمر نے اسے چھت پر بیٹھے دیکھ لیا ہوگا۔ وہ اپنا پیسہ ضائع ہونے پر پچھتا رہا ہوگا۔ اور اسے کسی کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ کر رہا ہوگا۔ عائشہ پہروں اکیلی بیٹھی اسی قسم کی باتیں سوچتی رہتی لیکن اس کے باوجود وہ ہر روز غسل کرتی بڑی احتیاط سے بال بناتی اور سولہ سنگار کر کے بے چینی سے عمر کی اندر آنے کا انتظار کیا کرتی۔ اسے عمر سے ڈر بھی لگتا تھا لیکن وہ کسی اور کے ہاتھ فروخت ہونا بھی تو نہ چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک مرتبہ بھی عمر اسے قریب سے بے نقاب دیکھ لے تو پھر اس سے بے التفاتی نہ

برت سکے گا۔

اس کی قیام گاہ کے نیچے باغ میں جتنی باتیں ہوتیں وہ انہیں کان لگائے برابر سنتی رہتی۔ جسے ہر عورت اپنا حق سمجھتی ہے......حضرت حوا کی پیدائش سے آج تک......!

جب مغرب کے بعد شمعوں کی روشنی میں مرد کھانا کھاتے تو وہ اپنی خواب گاہ کے پردے کے پیچھے آرام سے لیٹ جاتی اور ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک حرف سنتی رہتی۔ مہمان کی گفتگو سے اس کے کردار کا اندازہ لگاتی رہتی......اس کے کان گلدار کی طرح تیز تھے......!

مہمانوں میں بھورے بالوں والا ایک ارمنی تاجر بھی شامل تھا جس کا نام افرونوس تھا۔ اس کے متعلق وہ صحیح نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ وہ عمر سے اکثر تنہائی میں گفتگو کرتا تھا۔ وہ فیروزے کے کانوں، ہاتھی دانت سے لدے ہوئے کاروانوں اور ہزاروں دینار کے منافع کی باتیں کرتا۔ عائشہ اس قسم کے معاملات اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ افرونوس اس کے آقا کا تجارتی شریک ہے اور یہ بھی کہ عمر کے پاس بے اندازہ دولت ہے۔ اس قسم کی باتیں سن کر اسے اب وہ رقم بالکل حقیر معلوم ہونے لگی جس کے عوض عمر نے اسے خریدا تھا۔ اس کا دل اب کچھ کچھ مطمئن ہو چلا تھا......!

جو لوگ قصر کوچک میں مقیم تھے ان میں ایک شاعر بھی تھا۔ چکنے بالوں والا۔ لوگ اسے معزی کہتے تھے۔ عائشہ کو اس سے نہ معلوم کیوں چڑ سی ہو گئی تھی حالانکہ وہ عمر کی سب سے زیادہ تعریفیں کرتا رہتا تھا......سلطان کا منجم ریاضی میں ید طولیٰ رکھتا

ہے...... علم نجوم میں لاثانی ہے۔ اور معزی کے قول کے مطابق اسے یعنی عمر کو موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا...... کبھی وہ کہتا کہ اس سے بڑا اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ سارے ملک کے مدرسوں میں مسلمانوں کے لاتعداد بچے اس کی کتابیں پڑھ رہے ہیں...... لیکن عائشہ کے خیال میں یہ تمام باتیں بڑی گھٹیاں تھیں۔

ایک مرتبہ سب نے معزی کو اشعار سنانے پر مجبور کیا تو اس نے بڑے تکلفات کے بعد ایک قصیدے کے چند شعر سنائے۔

اے نگارندہ نگارے کہ زتو مجلس من
گہہ چو تصویر بود گاہ چو فرخار بود
گر گنہگار نہ شد زلف تو بر عارض تو
چوں پسندی کہ ہمہ سال نگوں سار بود
ورگنہ کرد رایافت نجلد اندر جائے
خلد آراستہ کیں جائے گنہگار بود

عائشہ ان اشعار سے بہت لطف اندوز ہوتی۔ جب معزی نے والی کو چک سے اصرار کیا کہ وہ ان اشعار کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے تو خیام نے صرف اتنا کہا کہ

''اب مجھے معلوم ہوا کہ تجھے سلطان نے درباری شاعر ہونے کا اعزاز کیوں بخشا ہے''۔

معزی نے اس رات بے تحاشا شراب پی۔ اور ایک صوفی سے اس بت پر بہت

دیر تک بحث کرتا رہا کہ اسے قصیدے میں عارض کے بجائے چہرہ کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ صوفی اپنی گفتگو میں ہستی اور نیستی اور آفاقی عشق کی طرح عجیب عجیب الفاظ استعمال کرتا رہا عائشہ کے پلے خاک نہ پڑا لیکن جب معزی نے باآواز بلند اعلان کیا کہ وہ اپنے یہاں کی ایک دعوت کے چند پوشیدہ واقعات بیان کرنا چاہتا ہے تو عائشہ نے ہمہ تن گوش ہوکر اس کی آواز پر کان لگا دیے۔

"اسے ایک لطیفہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اے میرے ہم پیالہ دوستو! بڑا ہی شگفتہ لطیفہ میں اپنے مکان کے پائیں باغ میں...... جو اس چاندنی میں جگمگاتے ہوئے باغ کے سائے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا...... چوگان کے میدان سے کچھ امرا کو مدعو کر کے لایا۔ جب ہم شکم سیر ہوکر کھا چکے اور شراب کا بھی ایک سرسری دور ہو چکا...... ایسی روح افزا شراب کا نہیں جو ہم ابھی پی چکے ہیں...... تو میں نے ناچنے والی نوجوان لڑکیوں کو بلانے کے لیے تالی بجائی۔ لیکن وہ دراصل لڑکیاں نہیں تھیں۔ میں نے پہلے ہی سے چند پری چہرہ لڑکے مامور کر رکھے تھے جنھیں ناچنے والی لڑکیوں کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے چہروں پر نقاب بھی ڈال دیے تھے۔ بہرحال وہ آگئے تھوڑی دیر ناچے اور بھاگ گئے۔ میں نے اپنے مہمانوں کو اکسایا کہ وہ انھیں خود جا کر ڈھونڈیں اور پکڑ کر پھر محفل میں لے آئیں۔ سارے مہمان اسے مذاق سمجھ کر دوڑ پڑے اور باغ کے اندھیرے میں کنجوں میں غائب ہو گئے۔"

اور یہ کہہ کر معزی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ عائشہ نے پردے سے جھانک کر عمر پر نظر ڈالی اس کے چہرے سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہ ہوتا

تھا۔

عرب دوشیزہ کا غصہ کے مارے چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ جب قصر کوچک کے حرم میں داخل ہوئی تھی تو ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زلیخا نے اسے بڑے اعتماد کیساتھ اس امر کا یقین دلایا تھا کہ اس قصر کے والی کے پاس شہر سے گانے بجانے والی نوجوان عورتیں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں مگر وہ جلد اکتا کر انہیں رخصت کر دیتا تھا۔ عائشہ کا ذہن معاً لڑکوں کی طرف گیا تھا۔ لیکن اسے وہاں کوئی بھی بے ریش لڑکا بھی دکھائی نہ دیا تھا۔...... بہر حال وہ معزی کو شدت سے ناپسند کرتی تھی۔ دل ہی دل میں وہ اس کے لیے ایسے نادر دشنام تراشتی رہی کہ اگر سلطان کا حاسی مرتبت منجم ایک دفعہ سن لیتا تو عش عش کرنے لگتا۔

وہاں ایک ہندو مہمان بھی تھا جو سائے کی طرح خاموش سب کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ایک ہم نشین کے کان میں چپکے سے کہنے لگا کہ عمر کا یہ علمی تجز اس کے پچھلے جنم کی یادگار ہے جو اسکے تحت الشعور میں رچا ہوا ہے اور اسے اپنے علم کے اس پوشیدہ سرچشمے کا قطعی علم نہیں ہے۔

یہ بات عائشہ کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ لیکن غیر شعوری طور پر وہ اتنا ضرور سمجھتی تھی کہ یہ ہندو روحانی طور پر اس نڈر آنکھوں والے نوجوان کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتا ہے۔ جو اکثر اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی عبا پہنے قصر میں آتا جاتا تھا۔ لوگ اسے غزالی کہتے تھے صوفی غزالی۔

عمر اور غزالی عموماً باغ میں ٹہلتے ہوئے گفتگو کرتے تھے۔ اول تو عائشہ ان کی

باتیں سن ہی نہ پاتی تھی اور اگر ایک آدھ فقرہ کبھی کان میں پڑ بھی جاتا تو اس کا مطلب پلے نہ پڑتا تھا وہ اپنی گفتگو میں مرئی اور غیر مرئی وغیرہ قسم کی اصطلاحیں استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر:

عمر: اگر ہم آسمانوں کو ان کی اصلی ہیئت میں دیکھ سکتے تو بالکل ایک نیا منظر نئی وسعتیں ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں گی۔ واللہ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم اس اپنی بوڑھی دنیا کو چھوڑ کر نئے آفاق کی ندرتوں سے سکون قلب ونظر حاصل کرتے۔

غزالی: ہم آفاق کے چہرے سے اس وقت تک نقاب نہیں اٹھا سکتے جب تک عشق الٰہی میں ڈوب کر کاملیت اور معرفت کے درجے پر فائز نہ ہو جائیں......۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ عمر نے باتیں کرتے کرتے شراب کا ایک چھلکتا ہوا جام اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور غزالی نے فوراً اسے ٹوکا کہ یہ حرام ہے۔

اس وقت عمر نے اطمینان سے شراب پی کر مسکراتے ہوئے خالی پیالہ نیچے رکھ دیا اور کہا تھا ''کم سے کم شراب کی بے حرمتی نہ کرو۔ یہ صرف اس لیے تلخ ہے کہ میری زندگی ہے اور زندگی تلخیوں اور ناکامیوں کا دوسرا نام ہے''۔

شراب زندگی ہے! عائشہ نے حیرت سے سنا اور انتظار کرنے لگی کہ دیکھو اب صوف کیا کہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد صوفی اس مسئلے پر بحث کرنے لگا کہ باوجودیکہ دنیا میں لاتعداد مذاہب ہیں۔ لیکن سب ہی خدا کو مانتے ہیں جو وحدہٗ لاشریک ہے۔

خود اسلام میں کتنے فرقے ہیں۔ کچھ فرقے عقائد کے اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں ان کے برعکس صوفیاء کا طبقہ ہے جو رجعت پسندی کے مخالف ہیں۔

مثلاً علوی ہیں جو حضرت علیؓ کو نا معلوم کیا کیا سمجھتے ہیں۔ اسلام میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے جسے مہدی موعود کے ظہور کا شدت سے انتظار ہے۔ مسلمان ہونے کے باوجود ان تمام فرقوں کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ہاتھی کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ ...... ہندوستان میں ایک ہاتھی والے نے اپنے ہاتھی کی نمائش کرنے کے لیے سب کو مدعو کیا اور ہاتھی کو ایک اندھیرے مکان میں بٹھا دیا۔ جب تماش بین وہاں آئے تو اندھیرے کی وجہ سے وہاں انہیں ہاتھی نظر نہ آتا تھا۔ ایک شخص نے اس کی سونڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ یہ جانور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لچکدار شہتیر۔ ایک اور شخص نے جب ہاتھی کو ٹٹول کر دیکھا تو اس کا ہاتھ ہاتھی کے کان پر جا پڑا تو اس نے رائے دی کہ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے تاڑ کا ٹیڑھا پنکھا۔ ایک تیسرا شخص ہاتھی کی ٹانگوں پر ہاتھ پھیر کر دیکھ چکا تھا کہنے لگا کہ تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ نہ یہ شہتیر کی طرح ہے نہ پنکھے کی طرح یہ تو دراصل ستون کی مانند ہے۔ اگر کوئی شخص اس مقام کو شمع جلا کر روشن کر دیتا تو ہر شخص ایک ہی اور بالکل صحیح رائے قائم کرتا''۔

اور اس وسیع دنیا کو روشن کرنے کے لیے شمع کہاں سے ملے گی؟ عمر نے سوال کیا۔

''اہل طریقت۔ صوفیوں کے روشن خوابوں سے''غزالی نے با آواز بلند جواب دیا''کیونکہ صرف انہی کی آنکھیں حقیقت نگر آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ تاریکی کے اس پردے کے پیچھے کیا اسرار پوشیدہ ہیں''۔

''لیکن ان کی پہچان کیا ہے''عمر نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں نے انہیں بہت تلاش کیا لیکن ...... لیکن وہ کہاں ہیں؟ غالباً وہ سب آفاق کی ظلمتوں کے اس پار اپنے اپنے مقام پر جمے بیٹھے ہیں، شاید وہ تھوڑی دیر کو جاگے۔ پرانی داستانیں سنائیں اور تاریک پردوں کے پیچھے جا کر پھر گہری نیند سو گئے۔''

غزالی کی گفتگو سے عمر کے ذہن و دماغ پر ایک عجیب قسم کا ردعمل ہوا۔

عائشہ غزالی کی بے حد ممنون ہوئی کیونکہ نوجوان صوفی کے واپس جانے کے بعد عمر معزی اور مہمانوں سے ایک دم اکتا سا گیا۔ ایک روز جب وہ سب بڑی شد و مد سے بحث مباحثے میں مشغول تھے تو عمر جعفرک کے سفید گدھے کو گھسیٹتا ہوا ان کے پاس لایا۔ یہ منظر دیکھ کر سارے مہمان یک لخت خاموش ہو گئے۔ عمر نے نہایت سنجیدگی سے انہیں سمجھایا کہ ان سب کو اس گدھے کی مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے...... ''یہ گدھا پچھلے جنم میں ایک دارالعلوم کا پروفیسر رہ چکا ہے۔''

اس واقعے کے بعد سارے مہمان رخصت ہو چکے تھے اور عمر تاروں بھرے آسمان کے نیچے پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ عائشہ ہمت کر کے آخر اس کے پاس پہنچ ہی گئی۔ اس نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر عمر کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔

''خدا میرے آقا کو سلامت رکھے!''

''اور تجھ پر بھی سلامتی ہو۔''

''میرے سرتاج! میں نے ابھی ابھی دیکھا تھا کہ ایک شخص دبے پاؤں آپ کا

پیچھا اس طرح کر رہا تھا جیسے کوئی جاسوس ہو۔ وہ پھر چپکے سے گلاب کی ان جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ میں نے اس کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔''

''احمد باغبان تو نہیں تھا؟''

''ہاں! احمد ہی تھا۔ اس کے دورے لگانے چاہئیں۔''

وہ دوشیزہ جو ریگستانی قبیلوں میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ جاسوس کو سب سے بڑا دشمن خیال کرتی تھی اور اس کی بیخ کنی کی اس طرح قائل تھی جس طرح سانپ کی۔

عمر ایک لمحہ خاموش رہا۔ ''نہیں! جن لوگوں نے اسے یہاں مامور کیا ہے اس کے ان کے پاس جا کر گدھے والا قصہ بیان کرنے دو۔ اگر میں اسے مارپیٹ کر باہر نکال دوں تو پھر وہی لوگ احمد سے بھی زیادہ خطرناک شخص میری نگرانی کے لیے مقرر کر دیں گے۔''

عائشہ کو عمر کا یہ جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اس کے آقا کو گویا احمد کی جاسوس کا پہلے ہی سے علم تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ بنو صفا کے سردار کی لڑکی نہیں۔ اس کے سحر کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔ یقیناً اس نے اس وقت جب کہ وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل سر جھکائے کھڑی تھی، بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے خیالات پڑھ لیے ہوں گے۔

لیکن عمر اپنے ہی خیالات میں گم تھا۔ ''لوگ جنت کا ذکر کرتے ہیں۔ جنت کی حقیقت یک لمحہ سکون سے زیادہ نہیں۔''

عائشہ خاموشی سے سنتی رہی۔

”یہ باغ کس قدر خاموش اور پرسکون ہے۔ لیکن یہاں بھی جاسوس چکر لگاتے رہتے ہیں۔ باتونی لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ گشت کرنے والے اجازت کے بغیر اندر آجاتے ہیں...... عائشہ! میرے نوکر چاکر تجھے کسی قسم کی تکلیف تو نہیں پہنچاتے؟“

”بالکل نہیں آقا! کیا...... کیا میرے سرتاج پسند کریں گے اگر میں بانسری پر نغمے سنانے کی جسارت کروں۔“

”اب بہت رات گزر چکی ہے...... تھوڑی دیر کے بعد افق پر سپیدۂ سحری نمودار ہو جائے گا۔ جاؤ، اب جا کر سو رہو۔ عائشہ۔“

نوجوان لڑکی خاموشی سے۔ مگر دل ہی دل میں غصے سے کھولتی ہوئی۔ اپنی خواب گاہ میں واپس آگئی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو آقا بھلا کاہے کو اس کی طرف متوجہ ہونے لگا؟ اس نے اس کا سر اس طرح تھپتھپایا تھا جیسے وہ اس کے اصطبل کی ایک گھوڑی ہے۔ اور اسے سو جانے کی اس طرح ہدایت کی تھی جیسے وہ کوئی ننھی بچی ہو۔

عمر ایک محویت کے عالم میں حوض کے کنارے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ غزالی کی عمر زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ہوگی جتنی کہ خود اس کی عمر تھی جب وہ رحیم کے ہمراہ محاذِ جنگ پر گیا تھا اور...... اور یاسمین نے اسے ایک گلاب کا پھول یاد کے طور پر دیا تھا۔ غزالی کس قدر مطمئن تھا۔ خود اعتمادی سے بھرپور جو جوانی کا لازمہ ہے۔ کیسا عجیب زمانہ ہوتا ہے یہ! کاش دورِ شباب کبھی رخصت نہ ہوتا۔ اس نے محسوس کیا جیسے جوانی اس سے منہ موڑ چکی ہو۔ یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟ اسے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ بہر

حال اس کی کتاب زندگی کا یہ زریں باب یکا یک ختم ہو گیا اور ایک نیا باب شروع ہو گیا............ بے کیف، بدمزہ.......!!

زندگی جو غزالی کے لیے ایک جیتی جاگتی تھی اس کے لیے ایک فسانہ بن گئی تھی۔ مبہم، نامکمل، تشنہ، ایک خشک مزاج زاہد کے لیے زندگی شباب کی پوری رعنائیوں کو جلو میں لیے، اس کی نگاہ التفات کا انتظار کر رہی تھی لیکن ایک منجم کے لیے زندگی کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہونے کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں حائل تھیں۔

''وہ ایک اعلیٰ درجے کا معلم ثابت ہوگا۔'' عمر نے سوچا۔ ''اور مجھے افسوس۔ کبھی پڑھانے کا موقع نہ مل سکا۔''

بیٹھے بیٹھے اسے ایک دم کچھ خیال آیا اور اس نے تالی بجائی۔ عمارت سے نکل کر ایک ملازم بھاگا ہوا آیا اور ادب سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''میرے منقش نگینوں اور پرانے سکوں کا صندوقچہ لے کر آؤ۔'' عمر نے ملازم کو ہدایت دی۔ ''نیلے گنبد میں چینی کمبلوں کے انبار کے پاس رکھا ہے'' اس نے گردن اٹھا کر پہلی دفعہ اس شخص کے چہرے پر نظر ڈالی........ ''احمد''

صندوقچے کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اس نے اپنی بیٹی سے کنجی نکالی اور اس کا قفل کھول لیا۔ اس صندوقچے کو بند رکھنا ضروری تھا۔ کیونکہ مقفل صندوقچے کو چرانے کا کوئی بھی خیال نہ کرے گا البتہ اگر اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا تو اس کے اندر رکھے ہوئے سنہری سکے دیکھ کر زلیخا نیاکسی اور خادمہ کے منہ میں پانی بھر آنا ایک فطری امر تھا۔ ان کی انگلیاں سنہرے سکوں کے مس کے لیے بے قرار ہو جاتیں۔ اور اگر آقا ان میں

سے کسی پر چوری کے شبہے کا اظہار بھی کر دیتا تو وہ روتے روتے اپنی جان ہلکان کر ڈالتیں۔

''اور کوئی حکم! آقا؟''

''نہیں! اب تو جا سکتا ہے۔'' خیال نے احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔

وہ تھوڑی دیر بیٹھا ان نایاب سکوں کو نکال نکال کر دیکھتا رہا۔ ان میں ایک بازنطینی سکہ تھا جس پر ایک صلیب کے نیچے ایک شہنشاہ اور اس کی ملکہ کے چہرے بنے ہوئے تھے۔ عمر کو یونانی زبان کی تھوڑی سی شد بد تھی ان میں سے ایک تو جسٹینین کا چہرہ تھا۔ یہ سکہ اس کے جلوس کے چھٹے سال ڈھالا گیا تھا۔ عورت کا چہرہ وہ شناخت نہ کر سکا۔ اس عورت کا نام اس کے پر کندہ نہ تھا۔ پھر وہ مٹی کی ایک مہر اٹھا کر دیکھنے لگا جس پر ایک اڑتی ہوئی چڑیا کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ وہ مہر اسے پامیرا کے کھنڈروں میں پڑی ملی تھی۔ مشہور شہر پامیرا۔ جہاں ملکہ زنوبیا نے رومیوں کو شکست دی تھی۔ اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا........ ان نشانیوں سے انسانی عزائم کی کیسی کیسی داستانیں وابستہ تھیں۔

جسٹینین نے رومی سلطنت کے بہت بڑے حصے کو فتح کر لیا تھا لیکن ایشیا پر ایک بے نتیجہ یلغار کے دوران میں وہ مارا گیا۔ زنوبیا........ عمر کو یاد آیا کہ یہ ملکہ ایک وسیع مملکت کی حکمران تھی لیکن آخر کار رومی افواج کے ہاتھوں تباہ ہوئی جو اس حسین و جمیل ملکہ کو اپنی فتح کے نشان کے طور پر گرفتار کر کے لے گئی تھیں۔

وہ تمام نام اور قیصر مدتیں گزریں زمین کا پیوند ہو چکے۔ سکوں پر ابھرے ہوئے

ان کے چہروں کو اس قدر انہماک سے دیکھنا عمر کو عجیب سا لگا۔ چند روز ہی بات تو ہے۔ کہ نظام الملک نے اعلان کیا تھا کہ موجودہ قیصر قسطنطنیہ نے **ملک شاہ** کے لیے تحائف بھیجے ہیں.......... زمانہ گردش کرتا رہا۔ انسانی تقدیریں بدلتی رہیں۔ حتیٰ کہ سارا مغرب اسلام کی پیش قدمی کی تاب نہ لا کر اس کے قدموں میں گر پڑا!.........

غزالی نے کہا تھا کہ وہ یعنی عمر آرام طلب ہو گیا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ گزشتہ سال سال سے وہ تین آدمیوں کے برابر کام کرتا رہا تھا۔ اور اس پر بھی نظام الملک کی فرمائشیں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ پرانے سکول کا یہ صندوقچہ۔ کاش احمد کے بجائے کوئی اور لایا ہوتا۔ احمد کا چہرہ جذبات سے قطعاً عاری تھا جسے دیکھ کر اسے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ نظام الملک اور خود اس کے دشمن کس طرح پوشیدہ طور پر اس کی نگرانی کراتے تھے۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک سے پیچھا چھڑا بھی لے تو دوسرا بدستور مسلط رہے گا۔ اور پھر وہ کسی بات کو چھپاتا بھی تو نہ تھا۔ نہ اس کا کوئی راز تھا...... چلو یہ بھی صحیح، مگر کاش وہ لوگ اسے گلاب کے اس مہکتے ہوئے رنگین پائیں باغ میں تو چند لمحے سکون سے گزارنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا کرتے!

ایک دوسرے ملازم نے نمودار ہو کر زیرِ لب کچھ کہا۔

”نہیں! میں کوئی خطوط نہیں دیکھوں گا! نہ کسی کا پیغام سنوں گا۔ رات کو کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔ چلا جا یہاں سے! اور اسحاق! دیکھ اگر کوئی بھی باغ میں داخل ہوا تو بس......! لے پکڑ یہ صندوقچہ! دور ہو جا یہاں سے!“

”لیکن.........“

''لیکن کیا؟ اگر اس چاردیواری میں گیدڑ بھی داخل ہوا تو تیری ٹانگیں توڑ ڈالوں گا۔''

دربان نے سکول کا صندوقچہ لے لیا اور خاموش کھڑا بے چینی سے اپنے پیروں کو حرکت دیتا رہا۔ ''لیکن آقا۔ یہ ایک ....''

''یا اللہ!'' عمر نے اتنے زور سے چیخ کر کہا کہ ملازم ڈر کر فوراً بھاگ گیا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ درختوں کے سائے شام کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور گزر گیا۔ حوض میں ٹھہرا ہوا پانی ہلکورے لینے لگا...... غزالی پہاڑی پگڈنڈیوں پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا شہر کی طرف جا رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہ قابل احترام نوجوان صوفی جب اس طرح تنہا ہوتا تھا، تو اس کا دل ایک نامعلوم خوشی سے لبریز ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن عمر سوچ رہا تھا کہ بیشتر اوقات اس کے چاروں طرف لوگ جمع رہتے تھے مگر داخلی طور پر وہ اپنے آپ کو صوفی سے کہیں زیادہ تنہا محسوس کرتا تھا۔ غزالی تو بہر حال اپنے مریدوں اور شاگردوں کے سامنے اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ لیکن عمر کے دل کا حال سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس کسی کی سامنے نہ نکال سکتا تھا۔

بربط کے تاروں کی دھیمی دھیمی جھنجھناہٹ سے شام کے دھندلکے گونج اٹھے۔ ساتھ ہی ایک عورت کے گانے کی میٹھی میٹھی آواز کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوئی۔ وہ ایک بیانیہ گیت گا رہی تھی۔ میدان جنگ سے واپس آتے ہوئے سپاہی ریگستانی شاہراہ کے کنارے ایک کنوئیں پر ٹھہر گئے تھے۔ مال غنیمت سے لدے ہوئے

اونٹ ان کے پیچھے قطار در قطار کھڑے تھے۔ جنگجو مردوں کے ہمراہ جو قیدی تھے وہ رہ رہ کر نالہ و فریاد کر رہے تھے۔ .... یہ ایک عربی گیت تھا۔ عمر نے اندازہ لگایا کہ گانے والی کہیں قریب ہی بیٹھی ہیں، دھیرے دھیرے بربط کے تاروں سے کھیل رہی ہے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' عمر نے سوالیہ انداز میں زور سے کہا۔

گہرے دھند لکے سے نکل کر عائشہ سامنے آئی۔ مست ہرنی کی طرح چلتی ہوئی۔ بے نقاب عمر کے پہلو میں دوزانو ہو کر وہ پھر بربط پر جھک گئی۔ ''بنو صفا کا ایک گیت'' اس نے بربط کے تاروں کو جھنجھناتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اور باقی ہے...... بہت طویل ہے یہ گیت! کیا میرے سرتاج سننا پسند کریں گے۔؟''

''میں یہ پوچھتا ہوں تم یہاں کیوں آئیں۔ عائشہ؟ میں نے حکم دیا تھا۔''

''لیکن آقا! جب آپ اسحاق کو حکم دے رہے تھے۔ میں پہلے ہی سے باغ میں موجود تھی۔''

''اچھا! بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔''

عائشہ نے بڑے ادب کے ساتھ بربط ایک طرف رکھ دیا اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ بالکل خاموش، اپنے ہونٹوں کو سختی سے بند کر کے۔ لیکن جسمانی طور پر اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ پہلے تو اس نے گردن کو جھٹکا دے کر اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے سیاہ گھنے بال جن میں سے مشک کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ڈالنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے بعد وہ سر اٹھا کر آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو

اس طرح غور سے دیکھنے لگی جیسے وہ ان کے متعلق بہت کچھ جانتی ہے۔ اور پھر ایک دم اس نے اپنے کھلی ہوئی متناسب کلائیوں میں سے نقرئی چوڑیاں ایک ایک کر کے اتارنی شروع کر دیں۔ اس اثناء میں کبھی کبھی عمر کو کنکھیوں سے بھی دیکھتی جاتی تھی۔

عمر اپنے خیالات کا سلسلہ قائم نہ رکھ سکا۔ اور عائشہ کی بھری بھری کلائیوں کو غور سے دیکھنے لگا جو اپنے گود ہی میں رکھی ہوئی چوڑیوں کو ایک دوسرے پر چننے کی کوشش کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چوڑیوں کی ڈھیری اونچی ہوتی رہی۔ ایک چھناکے کے ساتھ ساری چوڑیاں فرش پر گر پڑیں۔ عائشہ نے ڈر کر اپنا سانس اس طرح روک لیا جیسے معصوم بچے خود اپنی شرارت پر تعجب سے سانس روک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ جھک کر چوڑیاں سمیٹتے ہوئے عائشہ کا شانہ عمر کے پہلو سے مس ہو گیا۔ باریک ریشمی آستین کے نیچے گداز شانے کی حرارت کو عمر نے محسوس کیا............ اندھیرے خاصا گہرا ہو چکا تھا۔ گرد و پیش کی کوئی چیز صاف دکھائی نہ دیتی تھی۔

عائشہ پھر اپنے مہکتے ہوئے مشکی بالوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیسے ہی اس نے بال سمیٹنے کے لیے بازو اوپر اٹھائے، اس کے بدن کی بھینی بھینی خوشبو عمر کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ بدستور خاموش تھی لیکن رفتہ رفتہ ماحول پر اس طرح چھا گئی تھی کہ عمر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی رات کا ایک جزو بن کر اس نے عمر کا رابطہ باہر کی ہر چیز سے منقطع کر دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے عمر خاصے اہم مسائل پر غور کر رہا تھا لیکن اب...... ایک شوخ و شنگ دوشیزہ کی جسم کی معمولی سے معمولی حرکت اس کی پوری توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

عمر نے بے ارادہ اپنا ہاتھ بڑھا کر عائشہ کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ اس کے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اپنے بازو نیچے کیے بغیر عائشہ نے مڑ کر عمر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ عمر جیسے ہی اس کا بوسہ لینے کو جھکا وہ ایک ہرنی کی طرح تڑپ کر نکل گئی۔

''عائشہ!'' عمر نے دھیمی آواز میں پکارا۔

لیکن وہ خاموش لڑکی اس طرح بدل چکی تھی جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ اب وہ پہلی سی فرمانبردار کنیز نہ تھی وہ اپنے آقا کی ناراضی سے خائف تھی۔ وہ اس حسین رات کا ایک شاہکار تھی۔ رات کی رانی، سرکش، غیر یقینی، ایک حسین چھلاوا .... ایک خوبصورت دھوکا۔ جب وہ اس کے تعاقب میں بھاگا تو وہ لپک کر چنار کے گھنے سیاہ درختوں میں گھس گئی جہاں ستاروں کی روشنی بھی اندھیروں ہی میں گھل جاتی تھی۔

اس تگ و دو میں ایک مرتبہ اتفاقاً اس کا شانہ عمر کے بازو سے چھو گیا۔ عمر نے اسے پکڑنا چاہا، لیکن وہ پھر اس کی گرفت میں آتے آتے بچ کر نکل گئی۔ ننگے پاؤں وہ ہر طرف کلیلیں کرتی پھرتی رہی۔ عمر برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور جتنا وہ اس کے تعاقب میں دوڑتا جا رہا تھا، اس کے خون کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

جب وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا تو رک کر اس کی آواز پر کان لگائے۔ اس کے کانوں میں اسے صرف اپنے ہی دل کے دھڑکنے کی صدا آ رہی تھی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ اسے اپنے قریب ہی چپکے چپکے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ

اس کی طرف پھر جھپٹا مگر ایک درخت سے ٹکرا کر رک گیا۔ عائشہ نے ہنس کر پھر اس پر چوٹ کی۔ اس دفعہ وہ بے پاؤں اس کی طرف بڑھا اور عائشہ اٹھا کر بھاگنے ہی والی تھی کہ عمر نے آخر اسے پکڑ ہی لیا۔

ایک لمحے کے لیے وہ پھڑ پھڑائی۔ آخر وہ مرد تھا۔ تندرست، توانا۔ اس نے اپنے لب اس کے لبوں سے ملا دیئے اور دوسرے ہی لمحے وہ اس کے بازوؤں میں آسودہ ہوگئی۔ عمر اس کے دل کی تیز دھڑکنوں کو محسوس کر رہا تھا۔ اور صحرائی عرب دوشیزہ اپنے قبائلی انداز میں، مچل مچل کر، اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی......!

عائشہ کو رات کے جادو نے ایک عجیب چیز بنا دیا تھا۔ وہ عمر کے بازوؤں میں کسمساتی اور پھڑ پھڑاتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اک دم تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکلی اور حوض کی طرف بھاگ گئی۔

جب عائشہ نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھا تو تاروں کی مدھم روشنی میں اس کے سڈول جسم کے تمام اتار چڑھاؤ عمر کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ گرم پانی میں داخل ہو کر اس نے عمر پر پانی اچھالنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی عائشہ نے حوض میں قدم رکھا، وہ حوض جو نہ معلوم کب سے ساکت اور جلد پڑا تھا یک بیک زندہ ہو گیا۔ جاگ اٹھا۔ وہ رات، پانی، دھوپ سے تپے ہوئے گلاب کی خوشبو ....وہاں کی ہر چیز عائشہ کی ذات کا ایک جزو بن گئی تھی..........!

''کتنا اچھا موسم ہے'' اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

حوض سے نکل کر عائشہ یکا یک چونکی ہوگئی۔ اس نے ڈر کر ایک ہلکی سی چیخ ماری

اور آواز پر کان لگا دیئے۔

"کچھ لوگ ادھر آرہے ہیں" ایک لمحے کے بعد اس نے زیر لب کہا.........عمر کچھ نہ سن سکا۔ "ادھر، اور.........وہ دیکھو! وہ لوگ ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے ہیں۔"

ادھر دیکھتے ہوئے جس طرف عائشہ نے اشارہ کیا درختوں کے جھنڈ میں عمر نے مشعلوں کی روشنی دیکھی اور تلواروں کی چمک بھی۔ مشعل برداروں کے پیروں تلے سوکھی ہوئی جھاڑیوں کے چیخ کر ٹوٹنے کی آوازیں بھی اسے صاف سنائی دینے لگیں۔

"آپ کے پاس تو مدافعت کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔ خوف زدہ لڑکی نے چلا کر کہا۔ "چلو بھاگ کر اندر چلیں اور محافظوں کو جگائیں۔"

عمر بہر حال مطمئن تھا کہ رات کے وقت اس پر حملہ کرنے کے لیے اس طرح کوئی نہیں آسکتا تھا۔ وہ وہیں کھڑا، آنے والوں کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ لوگ کھلی جگہ میں آگئے تو عمر نے اسحاق دربان کو پہچانا گ جس کے ہمراہ چار مسلح آدمی اور بھی تھے۔ عائشہ کی پریشانی بدستور قائم رہی اور وہ چہرے پر نقاب ڈال کر گلاب کی جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئی۔

اسحاق بڑھ کر حوض کے قریب آیا اور عمر کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا ایک نعرہ بلند کیا۔

"یا آقا! جب ہمیں درختوں میں چلنے پھرنے کی آوازیں آئیں تو ہیں

پریشان ہوگیا اور میں نے ان انجان لوگوں سے کہا کہ ہمیں چل کر صورت حال معلوم کرنی چاہیے۔ خدانخواستہ کسی نے ہمارے آقا کو............!''

عمر کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہوگیا۔''تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے اس باغ میں بھی تنہائی نصیب نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ سارا غلام ٹولا فوراً مہال کی مکھیوں کی طرح یورش کر کے مجھے گھیرے لے گا؟''

عمر نے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص کے ہاتھ سے سروہی چھین لی اور اس کے کند کنارے سے خوف زدہ اسحاق کے شانے پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے۔ کندھے سے خون بہنے لگا۔ اسحاق زور زور سے کراہتا رہا اور اپنے قصور کی پاداش میں پٹتا رہا۔ آخر وہ اپنے آقا کی خلوت میں کیوں دخل انداز ہوا تھا۔ وہ یقیناً سزا کا مستحق تھا۔ وہ ایک طرح خوش بھی تھا کہ چلو جو سزا ملنا تھی فوراً ہی مل گئی اور اس کے بعد آقا اس کی اس نازیبا حرکت کو معاف بھی کر دے گا ورنہ یقیناً وہ کھال کھنچوا کر بھس بھروا دیتا۔ باقی آدمیوں نے بھی اپنی تلواریں میان میں کر لیں اور دل ہی دل میں دعا مانگتے رہے کہ خدا کرے آقا اسحق کو زدوکوب کرنے میں لگ کر انہیں بھول جائے۔ لیکن اس مار پیٹ کے باوجود اسحاق اور اس کے ہمراہی اس امر پر متفق تھے کہ بہرکیف انہوں نے تفتیش حال کے لیے وہاں جا کر صحیح قدم اٹھایا تھا۔

یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوگیا۔ عمر نے مارنا بند کر دیا اور سروہی پھینک دی اسے نہ معلوم کیا سوچ کر ہنسی آ گئی۔''چلو اب دفان، ہو! بیوقوف کہیں کے............ لیکن یاد رکھو کہ اب سے یہ باغ حرم کا ایک حصہ ہے............ یہاں کسی مرد کو آنے کی

اجازت نہیں۔"

"سر آنکھوں پر" اسحاق نے سر جھکا کر اپنے ہونٹوں سے خوف پونچھتے ہوئے کہا۔

"لیکن آقا! باغبانوں کے لیے کیا حکم ہے؟...... حسین، علی اور احمد......"

"ان سے کہہ دو کہ وہ اپنے حجرے میں بیٹھ کر مکھیاں ماریں۔ ان کے بغیر بھی باغ ہرا بھرا رہے گا۔"

جب ملازم رخصت ہو گئے تو عائشہ بھی گلاب کے کنج سے باہر نکل آئی۔ وہ ہنس رہی تھی...... اچھا ہی ہوا کہ آپ کے ملازموں کی سستی اور کاہلی اس وقت کام آ گئی۔

عمر نے کئی ہفتے تک نہ اپنی ڈاک دیکھی نہ کوئی خط پڑھا۔ اور خط وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا وہ درحقیقت دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ بجز عائشہ کے۔ وہ آزادی کے ساتھ بے پردہ پائیں باغ میں چل پھر سکتی تھی۔ اور ہر شام وہ تفریح کے لیے نئے نئے طریقے استعمال کرتی تھی۔

وہ عمر کی شریک حیات تو بن گئی لیکن اس کے خیالات کی شریک نہ بن سکتی تھی اسی عجیب حقیقت نے ان دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ خیام اپنے خیالات و تصورات سے پیچھا چھڑانے کا متمنی تھا۔ اور عائشہ نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا۔ بعض باتوں میں وہ عمر سے زیادہ سمجھداری کا مظاہرہ کرتی تھی...... اور جب خاموش رہتی تو ہزار عقلمندوں سے زیادہ عقلمند معلوم ہوتی تھی۔

اس کی محبت میں ایک خلوص تھا۔ ایک شفقت آمیز خلوص اور اس سے بڑھ کر کوئی اور چیز بے پناہ شدت کی حامل۔ قصر کوچک کے تمام لوگوں کو یہ بات بہت جلد معلوم ہو گئی کہ عرب دوشیزہ کے آقا کی توجہ کا واحد مرکز بن گئی تھی۔

عائشہ مطبخ میں جا کر اپنے ہاتھ سے خیام کے لیے کھانے تیار کرتی۔ زلیخا نے صرف ایک مرتبہ اس کے اس طریق عمل پر احتجاج کیا تھا۔

''کیا تیرے لیے اتنا کافی نہیں ہے'' عائشہ نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا کہ ''تیرے سارے چھوکرے اور ذلیل بھائی بھتیجے اپنے دامنوں میں چھپا کر توشہ خانے سے گوشت اور جانے کیا کیا اجناس لے جاتے ہیں؟ اور تیری لونڈیا کا وہ چیچک رو عاشق تھی۔ ارے وہی چھوکری جو دن بھر سڑک پر دھما چوکڑی مچاتی رہتی ہے۔ اگر بیاہ ہو جائے تو...... تو اپنے کام سے کام رکھ۔ جو تیری مرضی آئے کر۔ لیکن خبردار جو آقا کے کھانے پینے کے معاملات میں کبھی دخل دیا ہو گا۔''

اس کے بعد زلیخا زیادہ سے زیادہ کر سکتی تھی کہ صحرا نژاد خانہ بدوشوں کی آڑ لے کر عائشہ کی بدمزاجی کے متعلق بڑبڑاتی رہے۔

عمر کو عائشہ کی جو بات سب سے زیادہ پسند تھی وہ اس کی تنہا پسندی اور عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی ادا تھی۔ وہ صرف عمر کی موجودگی میں زندگی و شباب کا جیتا جاگتا مرقع بن جاتی تھی۔ ورنہ اسے دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ اس کے گردن کے اتار چڑھاؤ سے لے کر اس کے حسین جسم کے ایک ایک خط تک سے واقف ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں کیا تھا۔ عمر کو کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ جب کبھی وہ اس کے آغوش

میں لیٹی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتی تو اکثر عمر کو یہ وہم ہونے لگتا کہ شاید وہ کوئی ایسی بات سننے کی کوشش کر رہی ہے جو اسے سنائی نہیں دیتی۔

اور پھر کبھی کبھی وہ چونکا دینے والی باتیں بھی تو کرتی تھی.......... ایک مرتبہ اس نے سنجیدگی کے لہجے میں عمر سے پوچھا: کیا میری نگرانی کے لیے کوئی خواجہ سرا مقرر کر دیا گیا ہے۔

''نہیں تو'' عمر نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب! لیکن ایک خواجہ سرا اس وقت بھی ڈیوڑھی پر بیٹھا ہوا ہے۔''

عائشہ کو خواجہ سرا کے تقرر پر تعجب میں نہ ہوا تھا کیونکہ یہ بات شرفا کے رواج کے عین مطابق تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے اس بات کو دقت بھی تھی کہ ہر وقت اس کے پیچھے ایک دم چھلا لگا رہے۔

عمر تحقیق کرنے کی غرض سے اٹھ کر ڈیوڑھی تک گیا اور اس نے دیکھا کہ واقعی ایک شخص دروازے پر بیٹھا ہے۔

''تو کون ہے؟''

''خدا غریب پرور کو سلامت رکھے مجھے زنبل آغا کہتے ہیں۔ اسحاق نے مجھے آپ کی خدمت پر مامور کیا ہے۔''

پاٹ دار آواز اور بے رونق آنکھوں سے عمر نے سمجھ لیا کہ عائشہ نے بیک نظر جو اندازہ لگایا تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔

''میرے ساتھ آؤ'' اس نے کہا۔

دروازے پر پہنچ کر اس نے اسحاق کو آواز دی جس کے سر پر ہنوز پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''میں نے تجھ سے کب کہا تھا کہ خانم کی خواب گاہ کی دربانی کے لیے کسی خواجہ سرا کا انتظام کیا جائے؟''

اسحاق نے نہایت احترام سے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھتے ہوئے کہ میرے آقا کی توجہ آجکل کس طرف مرکوز ہے۔ میں خود ہی ضرورت کی نزاکت کا احساس کر کے اس شخص کو یہاں لے آیا تھا۔''

''اچھا! تو پھر اب اسکو چلتا پھر کر دو۔''

''بسرو چشم...... لیکن آقا پائیں باغ خاص وسیع ہے اور مکان کے دروازے سے سارا منظر دکھائی نہیں دیتا۔''

''مگر اسے بہر حال رخصت کر دو۔''

اسے اس خیال سے ہی غصہ آنے لگا کہ اس کے پائیں باغ میں زنبل آغا جیسی مخلوق پہرا دے رہی ہے۔ اس کے علاوہ عائشہ نے ایسے ماحول میں پرورش بھی نہ پائی تھی جہاں خواجہ سرا حرم کی نگہبانی کرتے تھے اور پھر وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ کوئی شخص ہر وقت عائشہ کی نقل و حرکت پر خواہ مخواہ نگاہ رکھے۔

اسحاق برا مان گیا اور زنبل آغا کے سامنے اپنی بڑائی جتانے کے لیے اس نے موضوع گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔ ''تقریباً بیس دن ہوئے کہ اعلیٰ حضرت نظام الملک کا خط آیا رکھا ہے۔ میں نے آپ کو مطلع بھی کیا تھا کہ وہ بہت ضروری خط

ہے۔ ایک ہرکارہ بہت جلدی میں وہ خط لایا تھا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ نظام الملک سلطنت کے اہم امور کے متعلق ہی آپ کو خط لکھنے کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں ....حکم ہو تو ابھی حاضر خدمت کروں؟''

عمر واقعی اس خط کو بھول چکا تھا۔ جب اس نے کھول کر اسے پڑھنا شروع کیا تو دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتا جاتا تھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن رحیم۔'' آگے چل کر خط میں لکھا تھا۔ ''یہ خط ملتے ہی ایک گھنٹے کے اندر ملک شاہ کو لکھ بھیجو کہ از روئے نجوم آپ کا اس وقت نیشاپور واپس آنا مناسب ہے۔ میں قطعی طور پر یہ چاہتا ہوں کہ وہ سمرقند کے شمال میں جنگ جاری رکھے۔ مجھے اس کے پڑاؤ سے اطلاع پہنچی ہے کہ وہ خرساں واپس آنے کا ارادہ کر رہا ہے اور فوج کی آدمی جمعیت کو سرما ختم ہونے تک برخواست کرنے کے متعلق بھی سوچ رہا ہے۔''

عمر نے پھر ایک بار خط پڑھا اور پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا۔ اس قسم کا پیغام لکھ کر بھیجنا بے حد خطرناک تھا.......... نظام الملک کو اس بات کا خود ہی اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ اور پھر منجم اس سے قبل نظام الملک کی فرمائش پر کتنی ہی غلط پیشین گوئیاں کر بھی چکا تھا یہ مان لیا کہ وزیر سلطنت کی بہتری اور سلطان کے مفاد ہی یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر پھر بھی ملک شاہ مطلق العنان بادشاہ تھا۔ سلطان مسلسل پچھلے کئی سال سے جنگ کے میدانوں ہی میں زندگی گزار رہا تھا۔ اگر وہ سرما کا ایک موسم آرام سے گزارنے کا خواہش مند تھا تو اس کی مخالفت کیوں کی جائے؟

اگر عمر نیشاپور میں ہوتا تو اس مسئلے پر شاید کسی اور انداز سے سوچتا۔ لیکن وہ غزالی

سے دنیا کی بے ثباتی پر طویل بحثیں کر چکا تھا۔ عائشہ نے اسے نئی لذتوں سے آشنا کر دیا تھا............ اس نے اسحاق کو حکم دیا کہ کاغذ، قلم، دوات اور مہر لگانے کے لیے لا کھ حاضر کیے جائیں۔ اس نے نظام الملک کے خط کے جواب میں صرف ایک لفظ لکھا ''نہیں'' اور نیچے اپنے دستخط کر دیے........... ''خیام'' اور خط بند کر کے اپنی انگوٹھی سے اس پر مہر لگا دی۔ ''ایک تیز رفتار سوار کے ہاتھ اسے فوراً نظام الملک کے پاس نیشاپور روانہ کر دیا جائے۔''

''لیکن اس وقت تک'' زنبل آغا نے لقمہ دیا ''وزیر رے پہنچ چکا ہوگا۔ ایک مذہبی شورش دبانے کے لیے۔''

رے، نیشاپور کے مغرب میں خاصی دور واقع تھا۔ اگر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کیا جائے تو کم از کم ایک ہفتے کی مسافت پر تھا۔

''معلوم کرو کہ وہ کہاں ہے اور اس خط کو فوراً بھیج دو۔''

'سر آنکھوں پر'' اسحاق نے خط کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔'' عجیب و غریب مختصر خط ہے۔ میرے آقا اور..........''

''ہاں!'' میں تجھے بتا دیتا ہوں کہ اسے میں صرف ایک لفظ لکھا ہے یعنی ''نہیں'' اور اس کے نیچے میرا تخلص لکھا ہے ''خیال'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' احمد کو نہ بھیجنا۔''

جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوتا تو سڑک کے کنارے ایک الاؤ کے پاس ٹھہر گیا۔ جہاں تینوں باغبان، احمد، علی اور حسین آگ روشن کیے تاپ رہے تھے۔ اسے

دیکھ کر وہ سب ادب سے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

''خدا کرے آپ کا ہر دن، عید کے دن کی طرح خوش آئند ہو، آقا۔'' حسین نے گردن جھکا کر کہا۔

عمر نے نظام الملک کے خط کے پرزے آگ میں ڈال دیئے اور جب تک وہ سب جل کر خاک سیاہ نہ ہو گئے وہیں کھڑا رہا۔ تینوں مالی بڑی دلچسپی سے کاغذ کا جلتے دیکھتے رہے اور جب وہ عمر کے جانے کے بعد پھر بیٹھے تو انہیں ایک نیا موضوع گفتگو مل گیا تھا۔

''اس میں کوئی شبہ نہیں'' حسین نے کہا۔ ''کہ یہ کوئی بہت اہم خط تھا۔ کیا خوبصورت لکھا ہوا تھا۔''

''اور تم نے وہ مہر دیکھی تھی۔'' علی نے بڑے عالمانہ انداز میں کہا۔ ''خون کبوتر کی طرح سرخ بالکل ایسی تھی جیسی نظام الملک کے فرامین وغیرہ پر لگی ہوتی ہے۔ ایک ایک قطرہ پگھل کر کس طرح آگ میں گر رہا تھا۔

وہ لوگ لاکھ کے سرخ قطروں کو غور سے دیکھتے رہے جو آخر راکھ میں جذب ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد اٹھا اور گھومتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں زنبل آغا اپنے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

عائشہ کی آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ ایک روز جب عمر نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کوئی چیز تو منگوانا نہیں چاہتی تو اس نے تھوڑی دیر سوچ کر بتایا کہ اگر ممکن ہو تو اس کے لیے کچھ ریشمی کپڑا، تھوڑا سا روپہلی کلابتو کشیدہ کاری کے لیے منگوا دیا

جائے اور مشک کی ایک بوتل، کچا عنبر اور روغن خشخاش بھی۔ اور بس۔ ایک روز عمر نے
جب اسے چمکتا ہوا سنہرا موباف لا کر دیا تو وہ مارے خوشی کے کھلکھلا کر خوب ہنسی۔
اور اس روز وہ گھنٹوں اس موباف سے اپنی چوٹی گوندھ کر ایک نقرئی آئینے میں مختلف
زاویوں سے اپنی صورت دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ قالین پر عمر کے پہلو میں چاروں
شانے چت لیٹ جاتی اور گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی بے خبر سو جاتی۔ قصر کے
ایرانی ملازموں سے اسے عموماً کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ تقریباً سبھی خوش مزاج، کاہل
اور نیک تھے۔

''کل'' اس نے ایک دن عمر سے مزاحاً کہا۔ ''وہ ہر بات آنے والے کل پر ٹال
دیتے ہیں۔ گزرے ہوئے کل کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں اور آنے والے
کل پر سارے کام اٹھا رکھتے ہیں۔''

''لیکن اس کے باوجود وہ خوش و خرم رہتے ہیں۔''

عائشہ نے ان کی زندگی کے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا واقعی ان کے جذبات
عجیب تھے۔ ذرا سی دیر میں ہنسنے لگتے۔ ذرا سی دیر میں رونے لگتے۔

''اور اے عائشہ تو خود'' عمر نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تیرا تعلق صرف آج سے
ہے۔ جو ہر وقت موجود ہے۔''

''صرف آپ کی موجودگی میں۔'' اس نے عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے
ہوئے کہا۔

ایسے موقعوں پر عمر کو یاسمین یاد آ جاتی تھی۔ عائشہ کے آنکھیں اور گردن تیزی

سے کھانے کا انداز بالکل یاسمین کی طرح تھا۔ عمر نے سوچا کہ وقت کی لاتعداد گردشیں بھی یاسمین کی یاد اس کے دل سے نہ بھلا سکیں۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ وہ کس قدر جلد اس سے جدا ہوگئی تھی۔ اور اس کی موت کا غم۔ جس کا اظہار اس نے جعفر کے سامنے بھی کبھی نہ کیا۔ آگ کے شعلوں کی طرح ہمیشہ اس کو جلاتا رہا۔ مدتیں گزر گئیں۔ اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ بیداری کی حالت میں اس خواب کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

عائشہ کے پہلو میں اسے وہ خوشی کبھی نصیب نہ ہوسکی جو یاسمین کے آغوش میں تکلیف وہ حد تک بڑھ جاتی تھی۔ عائشہ کے ساتھ اس کی زندگی بڑی پرسکون تھی۔ اس کی محبت پردہ باغ کے ان گلاب کے پھولوں کی مانند تھی جو بادِ صبا کے لطیف جھونکوں کے لمس سے کھل جاتے ہیں اور زمان و مکان کی قید سے بے پروا، نامحرموں کی نگاہوں سے پوشیدہ، اپنی نازک رنگین پتیاں زمین پر بکھیرتے رہتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں یاسمین کی یاد اس پرسکون باغ میں دبے پاؤں داخل ہوجاتی ہے۔

ایک روز عائشہ دھوپ میں بیٹھی حسب عادت اپنے سنہرے موباف سے کھیل رہی تھی۔ عمر نے دور سے اسے دیکھا تو چلا کر کہا ”میری نادان محبوب! دھوپ میں بیٹھ کر کیوں جان ہلکان کرتی ہے۔ تو سونا نہیں ہے کہ مرنے کے بعد جب تجھے زمین میں دفن کردیا جائے تو لوگ دفینہ سمجھ کر پھر تجھے کھود کر نکال لیں (1) گے۔“

جب عائشہ نے یہ سنا تو حیرت زدہ ہوکر پہلے تو خوب ہنسی۔ پھر اس نے اپنے گندمی رنگ کے سڈول بازوؤں کو ازراہ مذاق دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیشک میں سونے

کی بی ہوئی تو نہیں ہوں۔'' عمر کے الفاظ کے معانی سے قطع نظر کر کے وہ بڑی دیر تک اس بے تابی پر غور کرتی رہی جو عمر کے لہجے پر غالب آ گئی تھی۔ ''مردے؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تو پھر مردے ہی ہوتے ہیں۔'' ''ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

''ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی نہیں بدلتے۔'' اس نے اپنی بات کو پھر دہرایا۔

عمر برسوں سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا جسے ایک صحرائی لڑکی نے بڑی سادگی سے حل کر دیا تھا۔ ٹھیک ہی تو تھا کہ مردوں کو پھر زندہ ہو کر اس زمین پر چلتے پھرتے کس نے دیکھا ہے۔ وہ خاک ہی سے اٹھے تھے اور خاک ہی میں دبا دیئے گئے .... لیکن اس کے باوجود یاسمین کی یاد اس دل میں ہمیشہ سے زندہ ہے، ہمیشہ اسی طرح زندہ رہے گی۔ جب وہ کام کرتے کرتے تھک کر لیٹ جاتا تو نہ جانے کیوں اس کا دل بے اختیار چاہنے لگتا کہ کاش وہ جب سر اٹھا کر دیکھے تو سامنے سے یاسمین بیت النجوم میں داخل ہوتی ہوئی نظر آ جائے۔ اس کی نقاب ہوا سے اڑ رہی ہو۔ اور ...... اور ...... وہ پھر کوئی اور بات سوچنے لگتا۔

وہ ہفتے کے بعد پسینے میں شرابور گھوڑے پر سوار ایک قاصد قصر کو چک کے دروازے میں تیزی سے داخل ہوا۔ وہ نظام الملک کا ایک حکم نامہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ وزیر المالک نے عمر کو جلد از جلد رے پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

جب دوسرے روز علی الصباح عمر نے عائشہ کو خدا حافظ کہا تو عائشہ کی آنکھوں

میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ گھنٹوں پہلے سے عمر کے ساتھ جانے کے لیے ضد کر رہی تھی۔............''خدا حافظ'' اس نے پژمردگی سے کہا............''اجنبیوں کے مجمع میں بغیر ہتھیار لیے کبھی نہ جانا۔''

صدر دروازے پر اسحاق نے آگے بڑھ کر رخصتی سلام کیا۔ عمر کو شبہ ہوا جیسے اس نے سفید عمامہ اور سرخ خلعت والے زنبل آغا کو باغ کے گوشہ میں غائب ہوتے دیکھا ہے۔ اس نے اک دم اپنے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔

''اسحاق یہ کیا بات ہے، وہ سیاہ فام ہیجڑا ابھی تک قصر کے چکر کیوں لگا رہا ہے؟''

اسحاق نے ادب سے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ ''رات عشاء کے بعد میں نے سنا تھا کہ علی الصباح غریب پرور رے کے سفر پر روزانہ ہو جائیں گے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپسی ہو۔ کیا حرم کی نگہبانی کا شرف اسے حاصل نہ تھا؟''

''پھر؟''

''تمام عمارتیں نگہبانی کی محتاج ہوتی ہیں۔ یقیناً کوئی شخص خواب میں بھی یہ تصور نہیں کرسکتا کوئی نوجوان عورت اتنے بڑے باغ میں تنہا گھومتی پھرے اور زنبل آغا کچھ زیادہ دور بھی نہ جانے پایا تھا۔ میں نے سوچا۔''

عمر نے اپنی پشت پر کھڑے ہوئے مسلح دستے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم میں سے ایک شخص فوراً جا کر اس ہیجڑے کو تلاش کرے۔ اصطبل سے ایک گھوڑا لے اور اسے نیشاپور لے جا کر بازار میں دھکا دے آئے اور اس کا خیال رکھے کہ وہ کمینہ پھر اس دروازے میں قدم نہ رکھنے پائے۔''

وہ عائشہ کو خود اسی کے گھر میں کسی پہرے دار کی نگرانی میں دے کر جانا نہ چاہتا تھا۔ وہ تین دل مسلسل مغرب کی سمت سفر کرتا رہا۔ رات ہو جاتی تو سونے کیلیے بڑی شاہراہ کے کنارے کسی سرائے میں قیام کرتا اور پھر صبح سویرے روانہ ہو جاتا۔ وہ نیشاپور کے باہر ہی سے گزر گیا۔ مبادا لوگ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے سڑکوں پر جمع ہو جائیں اور مفت میں وقت ضائع ہو۔ اور یہ ایک قدرتی امر تھا کیونکہ ملک شاہ اپنا بیشتر وقت سرحدوں پر فوج کشی میں گزارتا تھا۔ رہا بوڑھا نظام الملک سو اسے کاغذات سے انبار صاف کرنے ہی سے کب فرصت ہوتی تھی۔ لے دے کر صرف سلطان کا منجم ہی رہ گیا تھا۔ جب کبھی وہ نیشاپور کے بازاروں سے گزرتا تھا۔ لوگ اسے اپنے سلطان کے اقتدار دولت و اقبال کا مظہر سمجھ کر دیکھنے کے لیے جوق در جوق سڑکوں پر جمع ہو جاتے تھے۔

جب عمر اور اس کے ہمراہی تیسری رات آرام کرنے کے لیے ایک جگہ ٹھہرے تو ایک اجنبی سوار نے آکر عمر کو ادب سے سلام کیا۔ اس کی کلائی پر ایک خوبصورت باز بیٹھا ہوا تھا۔

''خواجہ! خدا آپ کا سفر خوش گوار کرے۔ ملاحظہ فرمائیے یہ کیا چیز ہے مجھے تو کسی قسم کا ٹونا ٹوٹکا معلوم ہوتا ہے۔'' اجنبی نے اپنی پیٹی میں ہاتھ ڈال کر چاندی کی ایک نلکی نکالی۔ زیادہ سے زیادہ زبان قلم کے برابر ہوگی۔ ''ایک گھنٹہ ہوا کہ میں نے اپنے باز کو کھلے میدان میں پہنچ کر ہوا میں اچھالا۔ میں چاہتا تھا کہ باز بگلے پر جھپٹے جو دریا میں سمت پرواز کر رہا تھا۔ لیکن جب باز ہوا میں بلند ہوا تو بجائے بگلے کا پیچھا کرنے

کے اس نے مرب کی طرف اڑتے ہوئے کبوتر کو جا دبوچا۔"

"ملاحظہ فرمائیے میں نے اسے کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچایا.......... یہ پیغام بر کبوتر معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پنجے میں یہ نلکی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک کاغذ بھی رکھا ہوا ملا ہے۔ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں!"

کاغذ کا پرزہ زیادہ سے زیادہ انگوٹھے کے نشان کے برابر تھا اور اس پر صرف ایک سطر باریک قلم سے لکھی ہوئی تھی۔

"عمر خیام رے کی طرف سفر کر رہا ہے۔"

دستخط کی بجائے اس پر ایک ہندسہ لکھا ہوا تھا۔

"اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے" عمر نے باز کے شکاری کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ کبوتر مغرب کی سمت پرواز کر رہا تھا، کیوں؟"

"بیشک جیسے کسی نے ڈوبتے ہوئے سورج پر تیر چھوڑا ہو۔ جب میں نے یہاں پہنچ کر خواجہ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو اپنے ہمراہیوں سے کہا۔ بیشک اللہ کی مرضی کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔"

نازک نلکی کو عمر اپنی انگلیوں میں گھما کر سوچنے لگا کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ پیغام کس نے بھیجا ہے اور کس کے لیے بھیجا ہے۔ صرف کبوتر ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں جانے والا تھا۔ لیکن کبوتر تو بے زبان ہے۔ نلکی میں سے مشک کی بھینی بھینی مہک آ رہی تھی۔ صرف قصر کوچک کے لوگوں کو ہی اس کا علم تھا کہ وہ رے روانہ ہو رہا تھا۔ اور وہ جان بوجھ کر نیشاپور میں داخل نہ ہوا تھا۔ بہت ممکن ہے نظام

الملک کے کسی جاسوس نے اس کبوتر کے ذریعے یہ اطلاع روانہ کی ہو۔ پھر دستخط کی جگہ بھیجنے والے نے ایک ''عدد'' لکھ دیا تھا۔ یا تو وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس تحریر کو نام کی مدد سے پہچان لے یا پھر مرقوم عدد اس بھیجنے والے کی نشاندہی کرتا ہوگا۔ بہر حال ایک فیصد بھی اس امر کا امکان نہ تھا کہ عمر حقیقت سے آگاہ ہوسکتا۔

لیکن اس نے غیر ارادی طور پر نلکی میں کاغذ کا پرزہ واپس رکھ کر اسے اپنے بٹوے میں حفاظت سے رکھ لیا۔ یہ بھی محض حسن اتفاق ہی تھا کہ ایک اجنبی شخص کے بازی وجہ سے یہ پیغام اس تک پہنچ گیا تھا۔

رے کے قدیم شہر میں کتب خانے کی عمارت

نظام الملک اور عمر خیام قالین پر آمنے سامنے خاموش بیٹھے تھے۔ زندگی میں پہلی بار نظام الملک نے شاہی منجم کو اپنی رائے کا مخالف پایا تھا۔ اور اس واقعے سے وہ کچھ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔

''لیکن آخر کیوں؟'' اس نے اپنے مطمح نظر کو زیادہ واضح کرتے ہوئے کہا۔ تم میری رائے سے اختلاف کرکے ترقی کے راستے میں روڑا اٹکانا چاہتے ہو؟''

نظام الملک پھر خاموش ہوگیا اور متجسس نگاہوں سے خیال کو دیکھنے لگا۔ وہ دن دونی رات چوگنی پھلتی پھولتی سلجوقی مملکت کا دو پشتوں سے انتظام کرتا چلا آرہا تھا۔ اس وقت سلطنت کی حدیں اگر ایک طرف دیوار چین سے قسطنطنیہ کی اس فصیل تک پھیلی ہوئی تھیں جہاں ایک پتلی سی آبنائے یورپ کو ایشیا سے جدا کرتی ہے تو دوسری

طرف شمال میں برفانی علاقے سے عرب کے بے آب و گیاہ ریگستان تک وسیع تھیں۔ نظام الملک نے اس حیرت پر قابو پانے کے لیے جو اس پر مسلسل طاری تھی بے خیالی سے مہر دار انگوٹھی کو اپنی انگلی میں گھماتے ہوئے کہا۔ ''سلطان ایک آفاق گیر خاندان کا سربراہ ہے۔ اس کا ہر عمل اس کے بلند مرتبے کے شایان ہونا چاہیے۔ اس کی جنگی مہارت اور قابلیت ہی کا صدقہ ہے کہ آج غیر مہذب اقوام اور غیر مسلم افراد اسلامی حکومت کے زیر اقتدار ہیں۔ اس کی فتوحات نے ملک میں اس کا وقار بلند کر دیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک شاہ بہر حال ایک جاں باز ترک کا پوتا ہے۔ اگر وہ اپنے چار لاکھ سواروں کے ہمراہ خراسان کے پرامن شہروں کی طرف واپس آ جاتا ہے تو عوام سوائے اس کے اور کیا محسوس کریں گے کہ ایک جنگجو بادشاہ نے اپنے لاؤ لشکر سمیت پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے سپاہی جو میدان جنگ کے عادی ہو چکے آئے دن قرب و جوار میں طرح طرح کے ہنگامے برپا کریں گے۔''

''یہ فوج ہے کیا؟'' نظام الملک نے سوال کیا۔ ''خواجہ عمر! جیسا کہ تم جانتے ہو اس میں شمالی علاقوں کے ترک ہیں۔ غلام ہیں۔ وہ غلام جو ترکوں کی اولاد ہیں اور انہیں جنگ و جدل کی تربیت دی گئی ہے۔ ایک بڑی تعداد گرجستانیوں کی ہے۔ کچھ ترکمان اور باقی عرب قبائل ہیں۔ فوج میں خراسانیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایرانی اور بغداد کے عرب ان سے بھی کم تعداد میں ہیں۔ اس قسم کے سرکش لوگوں کو جن سے خانہ جنگی کا اندیشہ ہے زمین کا قبضہ نہیں دے سکتے۔ ہرگز نہیں۔ جب مشرق میں

جنگ ختم ہو جائے تو ہمیں چاہئے کہ مغرب کا رخ کر کے اللہ کے حکم سے، دو دولت مند ملک .... قسطنطنیہ اور مصر .... فتح کر لیں۔"

اس خیال کی ندرت نے ایک لمحے کے لیے خیام کو چونکا دیا۔ جہاد۔ ایک مذہبی جنگ۔ معتزلی خلیفہ کے ملک کی فتح۔ جو قیاصرہ کا آخری قلعہ ہے۔ کیا اس نے بچشم خود یروشلم کو اسی طرح فتح ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ نظام الملک کا وجود اس کی نگاہوں کے سامنے تحلیل ہو کر، ایک سوکھی ہوئی کھال میں تبدیل ہو گیا۔ ایک نا قابل تسخیر وجود۔ قوت و اقتدار کا پتلا۔ ایک جادوگر جس کے ہاتھوں میں تقدیر انسانی باگ ڈور ہے۔

پھر یہ خیال پیکر، تصوراتی وجود خود بخود نظروں سے غائب ہو گیا۔ عمر نے سوچا گویا ہر نئی جنگ کی قیمت اس دولت اور ان انسانی جانوں سے ادا کی جانی چاہیے جو ایک دوسری جنگ سے حاصل کی جائیں۔ نظام الملک کی نئی حکومت کی حدود میں اس فاتح مشین یعنی سلجوقی فوج کے لیے جو اس نے خود بنی ہے کوئی جگہ نہیں۔ آخر وہ ان جنگی ہاتھیوں کا کیا کریں جو ہندوستان سے لائے گئے تھے اور ان ترک افسروں کے لیے کیا کام مہیا کا جا سکتا ہے جو لوٹ مار کی زندگی کے عادی ہو چکے تھے؟"

"فوج کی مدد سے" عمر نے کہا۔ آپ نے ایک عظیم مملکت قائم کی ہے جس کی حفاظت کے لیے اس سے بھی بڑی فوج کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اس جدید فوج کو تنخواہ دینے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ نئی فتوحات کی جائیں۔ آخر یہ سلسلہ کہاں ختم ہو گا؟"

نظام الملک نے گھبرا کر منجم کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ نجوم کے مسائل، اور رامش ورنگ کے سوا عمر کچھ اور سوچتا ہی نہیں۔ جب تک عمر اور ملک شاہ ہم خیال ہیں اس کے۔ یعنی نظام الملک کے......... تمام منصوبے بغیر کسی دشواری کے عملی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ملک شاہ خراسان واپس آ کر اپنے جنگی گھوڑے کی پشت سے اترے گا، حکومت کی باگ ڈور یقیناً اپنے ہاتھوں میں لے لے گا۔

اور یہ آخری بات تھی جسے نظام الملک پسند کر سکتا تھا۔ اسے اس بات کا کامل یقین تھا کہ جس طرح ملک شاہ کی فتوحات ازل سے مقدر ہیں اسی طرح انتقال مملکت بھی اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اس کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔

''یہ خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا'' اس نے با آواز بلند کہا کہ ''ہمارے سلطان کو یہ فتوحات عطا کی جائیں اور یہ بھی کہ ان ممالک پر ہمارا حکم چلے۔''

عمر نے قالین کے نقش و نگار کو غور سے دیکھتے ہوئے نظام الملک کی گفتگو کو آگے بڑھایا۔ ''اور یہ بھی مقدر ہو چکا تھا کہ ستاروں کی رفتار کی آڑ لے کر میں سلطان سے جھوٹی پیشین گوئیاں کروں؟''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ستاروں سے انسان کی قسمت کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے؟''

''نہیں''

''اور میں بھی اسے غلط سمجھتا ہوں'' نظام الملک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار

ہوئی۔ اس نیس وچا کہ شاید اب عمر کی سمجھ میں اس کی بات آجائے۔ ''لہٰذا اگر ستاروں سے قسمت کا حال بتانا غلط ہے تو پھر تمہیں ملک شاہ کو یہ لکھنے میں کیا تامل ہے کہ اگر وہ جنگ جاری رکھے تو نجوم کے حساب سے فتح مندی اس کے قدم چومے گی؟'' اسے یکا یک ایک اور بات یاد آ گئی جس کی وجہ سے وہ کئی دن تک ذہنی الجھن میں مبتلا رہا تھا۔ ''ایک شخص جو اپنے آپ کو حسن بن صباح کہتا تھا۔ تمہارا خط۔ جو تم نے قصر کو چک سے لکھا تھا۔ ملنے سے چار دن پہلے میرے پاس اسی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بھی مستقبل کا حال بتا سکتا ہے اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ شاہی منجم کی جانب سے چند روز میں مجھے ایک پیغام ملے جو صرف ایک لفظ ''نہیں'' پر مشتمل ہوگا۔ یہ حسن کون شخص ہے جسے تمہارے راز معلوم ہو سکتے ہیں؟''

''یہ ایک نئے عقیدے کا مبلغ ہے۔ بیت المقدس میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔''

عمر نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''لیکن وہ پیغام روانہ کرنے سے پہلے میں نے تو اس کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے! تمہارا قاصد جو وہ پیغام لایا تھا قصر کو چک سے روانہ ہو کر آٹھ روز میں میرے پاس پہنچا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی آمد سے روز قبل حسن کو یہ بات معلوم ہو گئی۔

''کوئی سوار،'' عمر نے سوچنے کی انداز میں کہا۔ ''حتیٰ کہ سلطان کا قاصد بھی جو ہر پڑاؤ پر گھوڑا تبدیل کرتا ہے یہ مسافت چار روز میں طے نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن تھا

گھرے میں کوئی شخص، یہاں پہنچنے سے پہلے اس پیغام کی سن گن بھی پا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہوا میں اڑ کر کوئی یہ خبر پہنچا دے۔ اسے اپنی جیب میں رکھی ہوئی چاندنی کی نلکی یاد آ گئی۔ ایک نامہ بر کبوتر یہ اطلاع لا رہا تھا کہ وہ رے کی طرف سفر کر رہا ہے ہو سکتا ہے کہ کبوتر کے ذریعے سے نظام الملک کے نام سے اس کے خط کا مفہوم قصر کو چک سے چار روز میں رے پہنچا دیا گیا ہو۔

تو پھر اس کے اپنے گھروں والوں میں سے کوئی اس کی مخبری کرتا ہے۔ اور اس نے کبوتر کے ذریعے دو مرتبہ رے اطلاع بھیجی ہے۔ کیا وہ عائشہ ہو سکتی ہے یا پھر اسحاق دربان؟ لیکن دونوں یہ کہتے ہیں کہ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔

''ایک کبوتر یہ فاصلہ تین دن میں طے کر سکتا ہے۔'' اس نے بلند آواز سے کہا۔

''خدا ہی تمام تعریف کے لائق ہے'' نظام الملک نے عمر کی اس بات کا غلط مفہوم لیا اور جھک کر اس کے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم ضرور راہ راست پر آ جاؤ گے۔ فوراً سلطان کے نام ایک پیغام لکھو! ہم اسے نامہ بر کبوتر کے ذریعے سمرقند روانہ کر دیں گے۔ بس اس قدر لکھ دو کہ اگر سلطان نے جنگ ترک کی تو اسے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''اس میں کوئی خطرے کی بات نہیں'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ مجھے یہ لکھنے کی اجازت دیں گے کہ نظام الملک کا یہ فیصلہ ہے کہ جنگ جاری رہے۔''

''معاذ اللہ! کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''تو پھر نہ میں یہ لکھوں گا نہ وہ۔ نہ جھوٹ لکھوں گا نہ سچ۔ میں کچھ بھی نہیں

لکھوں گا۔“

نظام الملک نے اپنے کانوں میں شدید قسم کی جھنجھاہٹ محسوس کی۔ اس کی آنکھیں مارے غصے کے ابل پڑیں اور گھٹنے پر رکھے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ ”میرے روبرو یہ بات کہنے کی تمہیں کس طرح جرات ہوئی؟“

”مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا“ عمر نے سنجیدگی سے سر ہلا کر کہا۔ ”اور اب میں اپنے الفاظ واپس نہیں لوں گا۔“

نظام الملک ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ ”تو ایک مفلوک الحال طالب علم تھا۔ میں نے تیری سرپرستی کر کے تجھے ایوان حکومت کے تیسرے رکن کے بلند درجے پر فائز کیا۔ جب زیج بنانے پر ملا تجھے سنگ سار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے تجھے پناہ دی۔ میں نے جید علماء کو تیرا علمی مددگار مقرر کیا۔ اس وقت تیرے تصرف میں کتنے محلات ہیں۔ جنس اور نقد کی صورت میں تیرے پاس کس قدر دولت ہے؟ لوگ کہتے ہیں تو ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے سامنے تو نے ملک شاہ سے کتنی دفعہ جھوٹ بولا ہے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو مجھے سچ سچ بتا کہ آخر میرے منصوبوں کو خاک میں ملانے پر تو کیوں تلا ہوا ہے؟“

”سچی بات؟ ملک شاہ کو محاذ جنگ پر مصروف رکھنے میں آپ غلطی پر ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ آپ سے کوسوں دور فوج کے ایک کمان دار کی حیثیت سے برسر پیکار رہے اور آپ خود اس وسیع مملکت پر حکمرانی کرتے رہیں۔“

نظام الملک نے رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی

تھیں۔ ''کیا تم اس سے انکار کر سکیت ہو کہ جتنی مدت میں اس نے اسلام کی خدمت کی ہے۔ بے لوث خدمت، محض وہی تمہاری عمر سے دوگنی ہے؟''

''یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں۔'' عمر یہ کہتے کہتے رک گیا کہ پچھتر سال کی عمر میں نظام الملک کو جو حیثیت حاصل ہے وہ پینتیس سال کی عمر میں کہاں حاصل تھی۔

''اچھا! اب میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔'' نظام الملک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں خزانچی کے نام دس ہزار طلائی دینار تمہیں ادا کرنے کا حکم نامہ لکھے دیتا ہوں۔ منظور ہے؟''

''قطعی نہیں۔ اگر آپ مجھے سلطان محمود کا طلائی تخت بھی دینا چاہیں تو مجھے منظور نہیں ہے۔''

''پندرہ ہزار طلائی دینار۔''

عمر نے بوڑھے مدبر کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ کتنی بڑی رقم پیش کی جا رہی ہے۔ ''نظام الملک! تو نے بے شک میری سرپرستی کی ہے۔ لیکن میں نے کسی وقت بھی اپنے آپ کو تیرے ہاتھ فروخت نہیں کیا۔ اور نہ اب میں تیرے ہاتھ فروخت ہونے کو تیار ہوں۔''

''تو پھر میں تجھے رخصت کرتا ہوں۔ جا! افرونوس کے پاس چلا جا۔ کافروں کے گروہ میں شامل ہو جا۔ جا۔ عمر خیام، جہاں تیرا جی چاہے جا۔ لیکن سرپرستی کے لیے میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔ کیونکہ جو میرا نمک کھاتے ہیں وہ میری طرح اسلام کی خدمت کرتے ہیں۔''

اس نے اپنا منحنی بازو اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ عمر اٹھا اور پیٹھ موڑ کر چل دیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو اس کے کانوں میں نظام الملک کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ نظام الملک نے عمر کو آواز نہیں دی تھی۔ بلکہ وہ مصلے پر قبلہ رو بیٹھا، بلند آواز سے درود و استغفار پڑھ رہا تھا۔

"خدا تجھے سلامت رکھے۔" عمر نے دل ہی دل میں کہا۔

کتب خانے کی عمارت کے بالمقابل ایک زیر تعمیر مسجد کا بلند چبوترہ تھا جس میں لگے ہوئے نیلے رنگ کے ٹائل گیلی مٹی میں دور سے چمک رہے تھے۔ اس قسم کی بے شمار مسجدیں اور خانقاہیں ریگستانی سرزمین کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ مسافر خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ عظیم الشان منڈیاں ان کے علاوہ تھیں۔ یہ سب مل کر اسلامی حکومت کی عظمت اور شوکت کی شہادت دے رہے تھے۔ اور ان سب کو بوڑھے نظام الملک نے تعمیر کرایا تھا۔ اسلام کا بول بالا تھا۔ آدھی سے زیادہ جانی پہچانی دنیا میں لوگ بالکل اسی طریقے سے اور اسی زبان میں عبادت کرتے تھے جس طریقے سے اور جس زبان میں ناظم الملک عبادت کرتے تھا۔ اب عمر نے محسوس کیا کہ اس پر ایک اور دروازہ بند ہو گیا ہے جو پھر کبھی نہ کھل سکے گا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا۔ اپنے گرد وپیش سے بے خبر چوک طے کر رہا تھا۔ یکایک اس کے قریب ایک شخص چیخا۔ پلک جھپکتے ایک کثیر انبوہ جمع ہو گیا اور دھوپ میں تلواروں کی چمک نے چکا چوند پیدا کر دی۔ "ملحد! لامذہب! مارو.........قتل کر دو۔

”ایک ساتھ بہت سی آوازیں گونجیں۔

پہلے جس شخص پر عمر کی نظر پڑی وہ سفید عبا پہنے تھا اور اس کی کمر میں ایک سرخ پٹکا سپاہیوں کے انداز میں بندھا ہوا تھا۔ اس کی گردن سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اور وہ ایک ایسے جانور کی طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جو جال میں پھنس کر نکل نہ سکتا ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور اس کے نتھنوں میں انگلیاں ڈال کر ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن اوپر کو اٹھا دی۔ پاس ہی کھڑے ہوئے ایک دوسرے شخص نے اپنے تلوار کی ایک ضرب سے اس کا سر تن سے جدا کر کے تلوار کی نوک پر علم کر دیا۔ تاکہ ہر شخص اسے دیکھ سکے۔

ایک دوسرے سفید پوش نے تیزی سے دوڑ کر چوک کے اس پار جانے کی کوشش کی۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرنے ہی والا تھا کہ چاروں طرف سے اس پر تلواروں، نیزوں اور برچھیوں کی بارش ہو گئی۔ اس کا سفید لباس آناً ”فاناً“ سرخ ہو گیا۔

”ملحدوں کے لیے موت ہے“ ایک باریش ملا نے اپنے بازو ہوا میں بلند کر کے اس مجمع کے غیظ و غضب کی آگ کو اور بھڑکانے کی کوشش کی جو حیرت انگیز طور پر جمع ہو کر اس قتل و خون میں شریک ہو گیا تھا۔ ملا کی آواز سن کر وہاں کھڑے ہوئے ایک لڑکے نے جس کی عمر بمشکل دس سال ہو گی رونا شروع کر دیا۔ جیسے ہی ملا کی نظر لڑکے پر پڑی اس نے پھر یا آواز بلند مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”برادران اسلام۔ ذرا سعیتہ کے اس چھوکر کو بھی لینا۔“

لڑکا ڈر کے مارے روتا چلاتا ہوا بھاگا۔ عمر کو دیکھتے ہی وہ اس کے قدموں میں گر

پڑا اور اس کی عبا کا دامن پکڑ لیا۔ ''اے خواجہ! اے شہزادے مجھے ان کے ظلم سے بچاؤ۔''

ایک نوجوان نے، جس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا، بڑھ کر سسکیاں بھرتے ہوئے لڑکے کی گردن پکڑ لی لیکن عمر نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہنگامہ ہے۔ کیا تم لوگ رہے میں بچوں کا شکار کرتے ہو؟ الگ کھڑے رہو۔''

اتنے میں ملا غصے میں لال پیلا، عمر کے قریب آ گیا۔

''خواجہ عمر بن ابراہیم'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''ان سبعی کافروں کے قتل سے نظام الملک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انصاف کی تلوار اس الحاد کا خاتمہ کرنے کو کافی ہے۔''

ملا کی اس گفتگو سے حملہ آور نوجوان کو اور بھی شہ مل گئی اور اس نے بڑھ کر اپنے نیچے سے کافر بچے پر بھرپور وار کر دیا۔ چپقلش جاری ہی تھی کہ وہ مضبوط ہاتھوں نے پیچھے سے عمر کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے کر گھسیٹتے ہوئے کان میں کہا۔ ''میرے ساتھ چلے آؤ ورنہ خود مجھے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جلد ہی چلو۔'' یہ اقرونوس کی آواز تھی۔

چیختے چلاتے ہوئے لڑکے پر اس وقت تک ان گنت وار ہو چکے تھے۔ اور اس کی چیخوں کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

اقرونوس نے اپنا بازو عمر کے بازو میں ڈال لیا اور آگے بڑھتا رہا۔ ''مجھ سے باتیں کرو .... جیسے ہم اصفہانی کھجوروں کی قیمت پر جھگڑ رہے ہیں نہیں نہیں۔ نظام الملک کی عدالت میں اس مقدمے کو لے جانے سے بھی کوئی نتیجہ

نہیں نکلے گا............ ذرا آہستہ چلو۔"

لیکن عمر چوک میں برپا ہنگامے کو مڑ کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ اس بھگدڑ میں بھی اس کی نظر ایک موٹے تازے سوار پر پڑ گئی۔ باوجود فاصلہ زیادہ ہونے کے عمر نے پہچان لیا کہ یہ نیلے عمامے والا گھڑ سوار سوائے توتوش کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ توتوش۔ نظام الملک کے جاسوسوں کا سربراہ۔

یہ سب کچھ تقریباً دو منٹ میں ہوگا۔ عمر نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک سایہ دار گلی میں کھڑے پایا۔ جہاں ایک کھلی ہوئی دکان میں ایک کوزہ گر نے گیلی مٹی چاک پر چڑھا رکھی تھی اور چاک کو اپنے پاؤں سے جنبش دے کر تیزی سے گھما رہا تھا۔ ہمیشہ سے، نہ جانے کب سے کوزہ گر اسی طرح گیلی مٹی کو چاک پر گھما کر اپنی انگلیوں کے لمس سے کوزے بناتے چلے آئے ہیں۔ یہی ان کی زندگی ہے مقصد زندگی بھی۔ لیکن گرد و غبار کے اس دھندلکے میں عمر چمکیت ہوئے فولاد کو انسان کے خاکی جسم میں پیوست ہوتے دیکھ رہا تھا جس سے خون نکل کر گرد و غبار میں جذب ہو رہا تھا۔

"ذرا سکون کے ساتھ" اقرونوس نے عمر کے کان میں کہا۔ "میرے ساتھ آہستہ آہستہ چلو۔ خفیہ پولیس کا سربراہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے............ گیارہ میں سے آٹھ قنطارے ہم نے فروخت کر دیئے۔ باقی تین خراب ہو گئے تھے۔ فروخت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔"

ایک گھوڑے نپے تلے قدم رکھتا ہوا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی لگام

کی جھنکار سنائی دے جاتی تھی۔ لوگ دکانیں چھوڑ چھوڑ کر چوک کی سمت بھاگ رہے تھے۔

''ناپاک کتا۔'' عمر نے بلند آواز میں کہا۔

افرونوس نے بڑی ملامت سے کہا۔ ''وہ کتا نظام الملک کا پروردہ ہے کیا نظام الملک سے تمہارے تعلقات ہنوز خوش گوار ہیں۔''

''اگر ہم جھگڑا بھی ہو گیا ہے تو کیا ہوا؟ میں وزیر کا دشمن نہیں ہوں۔ اور اس سے ڈرنے کی بھی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

'لیکن مجھے مجمع سے ڈر لگتا ہے۔ تم نے کبھی ایسا مجمع دیکھا ہے جس کی قیادت ملا کر رہے ہیں۔ جہاں خون کی بو آتی ہو؟ ذرا اون سے بنی ہوئی ان خرجیوں کو دیکھنا۔ ایسے ہی تھیلوں کو تو نہیں تلاش تھی۔'' لٹکی ہوئی بے شمار زمینوں کے نیچے سے جھک کر اندر داخل ہوتے ہوئے افرونوس عمر کو اون فروش کی دکان کے اندر لے آیا جو اس افراتفری کو آڑ سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔

'ہفت'' افرونوس نے ایک تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں سات کی تلاش ہے۔''

بغیر ایک لفظ زبان سے نکالے دکان دار اٹھا اور انہیں دکان کے پچھلے حصے میں لے گیا۔ اور تیزی سے ایک پردہ سرکا دیا جس نے ایک دروازے کو چھپا رکھا تھا۔'' سات چیزوں کے مالک'' اس نے فقرہ ادا کیا۔ ''آپ حضرت شراب سے شوق کیجئے اور تازہ دم ہو جائیے!'' مہمانوں کو وہاں بٹھا کر اس نے پھر پردہ درست کیا اور

باہر نکل آیا۔

''میری کمر کا پٹکا مضبوطی سے پکڑ لو۔'' اقرونوس نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کے بعد ایک زینہ نیچے اترتا ہے۔ اس میں بیس سیڑھیاں ہیں۔''

اس سے پہلے کہ عمر کچھ کہتا اقرونوس سے اندھیرے میں نیچے اترنا شروع کیا۔ ایک لمحے بعد سیڑھیوں کے ایک موڑ پر روشنی کی جھلک نمودار ہوئی۔ ایک طاق میں شمع روشن تھی۔ اقرونوس نے اس انداز سے وہ شمع اٹھا لی جیسے وہ اس سے پہلے کئی دفعہ اس راستے سے گزر چکا ہو۔ سامان سے اٹے ہوئے اس تہہ خانے میں عمر کی رہنمائی کرتا ہوا اقرونوس اون کی ایک بہت بڑی گانٹھ کے قریب جا کر رک گیا جو ایک دیوار کے سہارے رکھی تھی۔ ''اسے کھسکانے میں میری مدد کرو۔ بس۔ ذرا ادھر کو۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس پولیس کے سربراہ کے برابر طاقتور نہیں ہے۔ سنتے ہو۔''

''لیکن تم چوہے کے بل میں کیوں گھسے جا رہے ہو؟ تم میری حفاظت میں ہو۔''

اقرونوس نے بے چینی کے ساتھ تہہ خانے کے دوسرے سرے پر زینے کو تجسس کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور اس وزنی گانٹھ کے پیچھے گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''خواجہ عمر! شاید میں تمہارے مکان کے اندر زیادہ محفوظ رہ سکوں گا۔ کیا وہ لڑکا تمہاری حفاظت میں نہ تھا؟ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے کہ میں ایک مذہبی بلوے سے فرار ہو کر آیا ہوں۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ توتوش میرا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا تاکہ مجھ پر کوئی نہ کوئی الزام لگا کر مجھے موت کے گھاٹ اتار دے۔ اس کے بعد وہ اور اس کے حواری میرے گودام میں پہنچ کر اسے لوٹ لیں گے ....

صرف میرا ہی نہیں تمہارا بھی یہی حشر ہو گا۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اچھا اب یہ رسی کھینچ کر اون کی اس گانٹھ کو پھر دیوار سے ملا دو۔"

اب وہ ایک تنگ راستے پر کھڑے تھے۔ جس کا دہانہ اون کی گانٹھ سے چھپا ہوا تھا۔ ایک لمحہ اس نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور اس کے بعد عمر کو ساتھ لے کر افرونوس وہ تنگ راستہ طے کرنے لگا جو بلند ہوتا ہوا ایک بند دروازے پر ختم ہو گیا۔ شمع کے قریب رکھی ہوئی ایک میز پر لٹکاتے ہوئے ارمنی تاجر نے وہ دروازہ بلا تکلف کھول لیا۔ عمر ایک ٹھنڈے کمرے میں داخل ہوا جس میں شراب کی بو بسی ہوئی تھی۔ دیواروں کے سہارے شراب کے بے شمار چھوٹے بڑے پیپے چنے ہوئے تھے۔ ایک کھلی جگہ میں چھ افراد ایک لالٹین بیچ میں رکھے قالین پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ افرونوس پر تو انہوں نے محض ایک سرسری نظر ڈالی لیکن اس وقت عمر ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ارمنی تاجر نے بڑے تپاک سے جھک کر سلام کیا اور ادب سے پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک شخص نے جو بظاہر کسی علمی ادارے کا پروفیسر معلوم ہوتا تھا آگے بڑھ کر نجومی خیر مقدم کیا۔

"خوش آمدید! اے فلکیات کے استاد! آیئے! مردود انسانوں کی اس مجلس کو عزت بخشئے!"

"آج کے دن ہم میں سے ہر شخص کے سر کی ایک قیمت مقرر ہے۔" ایک دوسرے شخص نے پروفیسر کے آخری فقرے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

عمر نے تجسس آمیز نگاہوں سے ان کا جائزہ لیا۔ ایک خالص مصری لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایک نے ڈھیلی ڈھالی عبا پہن رکھی تھی اور درویشوں کی طرح عصا اور کشکول لیے ہوئے تھا۔ باقی دوسرے مال دار تاجر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ایک پہلو سے وہ یکساں نظر آتے تھے.......... ان سب کی آنکھوں میں ذہانت اور طباعی کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ اور ان کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب باعمل انسان ہیں۔

''اجازت دیجیے! خواجہ! کہ میں اپنے عمدہ ساتھیوں کا آپ سے تعارف کراؤں جن کے سروں پر وقتی طور سے ننگی تلواروں کا سایہ ہے۔ میں خود ایک پروفیسر ہوں۔ وہ سامنے دھاری اور عبا پہنے ہوئے جو صاحب بیٹھے ہیں ایک سیاح ہیں۔ ساری دنیا کا سفر کر چکے ہیں۔ جب قصے سنانے پر آتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ اور درویش کو تو آپ دیکھتے ہی ہیں۔ اور وہ فربہ اندام شخص۔ تخم کنجد اور دوسری بدنام مگر مزے دار جڑی بوٹیوں کا تاجر ہے.......... اور باقی دو حضرات اصفہان کے خوش وقتوں میں سے ہیں۔ بساط پر پانسے کے معاملے میں کبھی ان کا اعتبار نہ کیجیے گا۔ حضرت، اب میں گذارش کرتا ہوں چونکہ اس وقت ہماری تعداد سات ہو چکی ہے اس لیے ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ زہے نصیب! اگر استاد فلکیات بھی ہمیں اپنی ہم سفری کا اعزاز عطا فرمائیں۔''

''آپ نے اپنی مہمان نوازی سے جو میری عزت افزائی کی ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عمر نے سعیتہ کے متعلق سنا تھا کہ وہ خراسان میں ایک نئے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے متعلق طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ سعیتہ وہ سرپھرے ہیں جو کسی ساتویں ہادی کے آمد کے منتظر ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ ملحد ہیں اور ایک نئے مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔ سعیتہ کے متعلق ایک یہ بات بھی مشہور تھی کہ وہ جادوگروں کا ایک طبقہ ہے جو کسی رحمانی یا شیطانی قوت کے حامل ہیں۔ عمر کو بہر حال یہ سوچ کر بڑا تعجب ہوا کہ آخر یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ قریب ہی چوک میں ان کے ہم عقیدہ لوگوں کا خون بہایا جا رہا ہے اور یہ آرام سے یہاں بیٹھے غپ لڑا رہے ہیں۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ اس غم میں آنسو بہانے اور کپڑے پھاڑنے سے آخر حاصل بھی کیا ہو سکتا ہے۔

''کیا حسن بن صباح کا تعلق بھی آپ ہی کے گروہ سے ہے؟'' عمر نے سوال کیا ''مجھے اس کی تلاش ہے۔''

چھوں آدمی حیرت سے عمر کو دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ پروفیسر بھی چپ چاپ اسے تکنے لگا۔ آخر اقروئوس نے اس مہر خاموش کو توڑا۔

''حسن کو خود آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ خواجہ عمر۔ مہینوں سے وہ آپ کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے ہیں۔''

چھوں آدمیوں نے سکون کا سانس لیا۔ پروفیسر کی گویائی بھی واپس آ گئی۔

''حسن اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ چند روز پہلے وہ نظام الملک سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ لیکن آج کل وہ پہاڑیوں میں ہیں۔''

بہت عرصہ گزرا عمر نے جو بات سنی تھی اس کے حافظے میں محفوظ تھی۔ حسن سے اس کی پہلی ملاقات بابل کے کھنڈروں میں ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے کہا تھا کہ وہ پہاڑوں کی بلندیوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ حسن اس کوہستانی علاقے ہی میں تو پیدا ہوا تھا جس کا سلسلہ رے کے اس پار پھیلا ہوا ہے۔ اور لوگ سعیتہ کے رہنما کو ''شیخ الجبال'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

عمر اس لیے اور بھی حسن سے ملنے کا خواہش مند تھا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ آخر اسے قصر کوچک سے نامہ بر کبوتر کے ذریعے ایک بے نام پیغام کیوں بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ رے میں وہ زیادہ عرصے رہنا بھی نہ چاہتا تھا۔ جہاں وہ ہر وقت توتش کی نظروں کا مرکز بنا رہے گا۔ یا ممکن ہے نظام الملک اسے پھر بلا بھیجے۔

عمر کی طرف گردن جھکاتے ہوئے اقرونوس نے آہستہ سے کہا۔ ''حسن آپ کی آمد کا متوقع ہے اور اس کے ساتھ ایک ایسا وجود بھی ہے جس کا حسن کبھی آپ کے لیے جنت نگاہ رہ چکا ہے۔''

ایسے بہت سے حسین ہیں۔ عمر نے سوچا۔ جن کی کشش نے چندرے مجھے اپنی طرف متوجہ رکھا .... لیکن اک دم عائشہ کی یاد اس کے دل میں نشتر بن کر اتر گئی۔

''اچھا۔ یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بتایئے کہ آیا آپ مجھے حسن کے پاس لے چلیں گے؟''

اقرونوس نے پروفیسر کی طرف دیکھا جو خاموشی سے یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ''ہمارا اسی طرف جانے کا ارادہ ہے۔'' اس شخص نے عمر کے سوال کا جواب دیتے

ہوئے کہا اور اس کے لہجے کی ساری شگفتگی کافور ہو گئی۔ ''لیکن یہ مسافت آسان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ شاہی منجم خواجہ عمر نیشاپوری کے لیے بھی۔ آپ غور فرما لیجیے۔ ہم ''رفیق'' ہیں۔ ایک نئے مذہب کے پیرو۔ یہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ یہ جانتے ہوئے اور ہمیں یہاں موجود پاتے ہوئے۔ آپ ابھی یہاں سے سڑک پر پہنچ کر ناظم الملک کے کسی جاسوس یا پھر کسی ملا کو یہ اطلاع پہنچا دیں کہ ابن خوشاق کے گودام میں سبعیہ کے چند لیڈر چھپے بیٹھے ہیں تو یقیناً ہمارے شانے ہمارے سروں کے بارے سے بہت جلد ہلکے ہو جائیں گے۔''

''بیشک'' عمر نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے شبہ کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں یہ معلوم ہے کہ آپ متعصب اور شر پسند نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ آپ جب کوئی وعدہ کر لیتے ہیں تو وہ اٹل ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے ایک حتمی وعدہ لینا چاہتے ہیں کہ نہ تو آپ کسی کو یہ بتائیں گے کہ آپ نے یہاں کیا دیکھا ہے اور نہ کسی پر یہ ظاہر کریں گے حسن تک پہنچنے کے دوران میں آپ کیا دیکھیں گے۔''

عمر نے ایک لمحہ سوچا۔ ''اچھا'' اس نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''بہت خوب'' درویش نے گردن ہلائی۔ ''اب آپ بھی سن لیجیے۔ ہم لوگ قرآن کی قسم نہیں کھاتے۔ ہم سب رفیق بے حد حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے دنیا کے اس کارخانے میں خدا کی تلاش کم کر دی ہے۔ ہم سارے رفیق بھی وعدہ

کرتے ہیں کہ آپ کو کسی قسم کا دھوکا نہیں دیں گے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنے وعدے سے پھرا ہو۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''یہاں تک کہ بعض کو زندہ جلا دیا گیا مگر اصل راز ان کی زبان تک کبھی نہ آسکا۔''

عمر کو بڑا تعجب ہوا جب اس نے کم ازمنی کو بلوری ساغروں میں مقطر شراب بھر کر ساتوں حاضرین کو پیش کرتے ہوئے دیکھا۔

''آیئے! تھوڑی دیر کے لیے ذرا پولیس سے مذاق رہے۔'' پروفیسر نے ذرا وضاحت سے کہا۔ ''ہم لوگ بااتوشوں کا ایک حلقہ بنا لیتے ہیں۔ اور چھپ کر ممنوعہ شراب اس قدر پیتے ہیں کہ بدمست ہو جائیں۔ پولیس تو صرف چھوٹے چھوٹے جرائم اور روز اوراسی رشوتوں پر اپنا سارا زور صرف کرتی ہے۔ اچھا۔ اب اپنا اپنا ساغر لبوں سے لگایئے۔ کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم یہاں سے کہا جا رہے ہیں۔'' یا ......'' اس نے عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں جا رہے ہیں۔''

اس کے بعد ایک ایک کر کے سب گودام سے رخصت ہو گئے اور یہ طے ہوا کہ دو دن کی مسافت کے بعد پہاڑیوں میں فلاں مقام پر سب لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ اقرونوس اور عمر کو ساتھ ساتھ جانا تھا۔ اقرونوس اس بات پر مصر تھا کہ عمر کو اپنی ہیئت ضرور تبدیل کر لینی چاہیے کیونکہ سلطان کا منجم بغیر کسی کی نظر پڑے رہے سے باہر نہیں جا سکتا۔

کسی شراب خانے کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں عمر کو تقریباً دو گھنٹے تک

ایک مسکراتی ہوئی عورت کی مشاطگی کا تختۂ مشق بننا پڑا۔ جس نے پہلے اس کی داڑھی کو ایک خاص انداز سے آراستہ کر کے مہندی کے ذریعے اس کا رنگ تبدیل کیا۔ پھر چہرے اور گردن پر اخروٹ کے عرق کی مالش کر کے جلد کو اتنا سیاہ کر دیا کہ داڑھی کی سیاہی اس کے سامنے ہلکی نظر آنے لگی۔

''سلمیٰ'' ارمنی تاجر نے سنجیدگی سے عمر کو بتایا۔ ''ان تمام لوگوں کے چہروں کی وضع قطع سے واقف ہے جو ان راستوں پر سفر کرتے ہیں۔ وہ ایک ہندو فقیر کا حلیہ تبدیل کر کے اسے ایک افریقی مرابط بنا سکتی ہے۔''

سلمیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور بڑی شوخی سے اس نے بتایا کہ اسے پہلے اتنے خوبصورت قسم کے آقا سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اس کا شوہر بھی اخلاقاً مسکرایا۔

جب شراب فروش کی بیوی اپنا فرض انجام دے چکی تو عمر نے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ وہ ملائم ریشم کا دبیز خلعت پہنے تھا۔ ٹانگوں میں دانے دار چمڑے کی برجس تھے۔ پیروں میں سواری کے جوتے جن کی نوکیں انگوٹھوں پر سے اوپر کو مڑی ہوئی تھیں۔ اس کے پٹکے میں چاندی کی چمکیلی تختیاں آویزاں تھیں۔ اور اس کے نئے عمامے میں آرائش کے لیے چوڑیاں لپٹی تھیں۔ اقرونوس نے عمر کو ہر طرف گھما کر تنقیدی نظر سے دیکھا اور ایک یا دو بازو بندوں کے اضافے کا مشورہ بھی دیا۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ روپ بہروپ ہو گیا ہے تو اقرونوس نے عمر کو بتایا کہ وہ بخارا کا اسپ فروش ہے اور کوہستانی علاقوں سے ٹٹو خریدنے جا رہا ہے۔ ''تو پھر اسے ترکی زبان میں قسم کھانی ہو گی'' سلمیٰ نے مشورہ دیا۔ ''اور اکثر اوقات تھوکنا بھی

ہوتا۔ دونوں ہاتھوں سے کھانا ہوگا۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ناک صاف کرنا ہوگی۔ .... میں آقا سے اپنی ان گزارشات کے لیے معذرت خواہ ہوں .... گھٹنوں میں خم ڈال کر چلنا چاہیے۔ ذرا گھٹنے کے انداز میں۔ جس سے یہ اندازہ ہو کر عمر کا بیشتر حصہ گھوڑے کی زین پر گزرا ہے۔ عام لوگوں کے سامنے گھوڑی کا دودھ بھی کبھی کبھی پیا ہوگا .... اور اس کے بعد آقا کی اپنی حرم بھی اگر پہچان لے تو میرا ذمہ............"

پہاڑوں اور دریاؤں کے اس پار عقاب کا آشیانہ

عمر کے اس احساس کو کہ وہ جانی پہچانی دنیا سے دور کسی انجانے مقام کی سمت سفر کر رہا ہے، اقرونوس نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور زیادہ شدید کر دیا اور اس نے سفر کے تیسرے دن غروب آفتاب کے وقت ایسا کیا۔

"میں معافی کا خواستگار ہوں۔" تاجر نے پٹی باندھتے ہوئے زیر لب کہا۔ "کسی غیر شخص کے لیے اس راستے کی صحیح سمت کا علم، ممنوع ہے۔"

وہ اس وقت خچروں پر سوار قزوین کی بالائی سمت سلسلہ کوہ سے گزر رہے تھے۔ گھاٹی میں بے شمار پتھر بکھرے ہوئے تھے اور گھاٹی کی بلندیوں پر گھنا جنگل اگا ہوا تھا۔ یہ تھا آخری نظارہ جو عمر خیال کی نظروں کے سامنے تھا۔

"تو کیا بھی سعی ہے؟"

"میں شیخ الجبال کا ادنی غلام ہوں۔" اقرونوس نے جھک کر رازداری کے طور پر

خیام کے کان میں ہی کہا۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی موجود نہ تھا اور وہ تنہا سفر کر رہے تھے۔

اس کوہستانی علاقے میں کوئی شخص حسن بن صباح کا نام زبان پر نہیں لا سکتا۔ وہ حسن جسے تم جانتے ہو.......... جس تم بابل کے کھنڈروں میں ملے تھے.......... وہ جس سے قاہرہ اور بیت المقدس میں تمہاری ملاقات ہوئی تھی.......... اب وہ نہیں رہا۔ ''وہ بات ختم ہوئی وہ فسانہ بیت گیا۔'' اب وہ شیخ الجبال ہے۔ خراسان میں دس ہزار افراد اس کی آنکھ کے اشارے پر جان قربان کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ اس کی طاقت واقتدار دنیاوی سلاطین سے کہیں زیادہ ہے۔''

اس عقاب کو یاد کر کے جو اسے بابل کے کھنڈروں میں ایک لاش کے گرد گھومتا ہوا نظر آیا تھا۔ اور اس نامہ بر کبوتر کا خیال کر کے جسے اس نے پرواز کے دوران میں مار گرایا تھا۔ عمر خاموش رہا۔

''گزشتہ ہفتے رے میں..........'' افرونوس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا.......... ''توتوش نے اس سرائے کا محاصرہ کر لیا تھا۔ جس میں شیخ الجبال نظام الملک سے ملاقات کے بعد داخل ہوا تھا۔ توتوش نے پولیس کے دو دستے اسے تلاش کرنے کے لیے مامور کیے تھے۔ انہوں نے چپا چپا چھان مارا مگر وہ در مقصود ان کے ہاتھ نہ آ سکا کسی انسانی آنکھ نے شیخ الجبال کو اپنے آشیانے کی طرف سفر کرتے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ وہاں موجود ہے اور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔''

''کہاں؟''

''الموت میں ....عقاب کے آشیانے میں ۔اسی نام سے وہ جگہ مشہور ہے۔لیکن اس کا راستہ کسی کو معلوم نہیں؟''

''ظاہر ہے تمہیں تو معلوم ہی ہوگا۔''

''صرف ایک دفعہ'' اقرونوس نے بڑی سادگی سے اقرار کیا۔''میں نے الموت کا دروازہ دیکھا تھا۔''

''کیا ایک ہفتے پہلے اس شیخ الجبال نے تمہیں حکم دیا تھا کہ تم مجھے اپنے ہمراہ اس کے پاس لے جاؤ؟''

''نہیں ۔ایک سال .... بلکہ دو سال پہلے۔'' اقرونوس نے جواب دیا۔''وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ نظام الملک اور عمر خیال کے درمیان اختلافات کی خلیج گہری ہو جائے گی۔ جب یہ صورت حال پیش آ جائے تو اسے تلاش کر کے میرے پاس جبال پر لانا جہاں اسے با آرام پناہ مل سکے گی۔''

''واہ وہ..........پھر تو تمہارا شیخ الجبال جادوگر ہے۔''

''اس سے زیادہ ذہین کوئی اور شخص آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔اس کے پاس کوئی پوشیدہ طاقت ہے۔'' اقرونوس نے سوچتے ہوئے کہا۔''بہتر یہی ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے۔سنا ہے نظام الملک نے اپنی کتاب میں ایک باب لکھا ہے جس میں اس سے خبردار رہنے کی تنبیہ کی ہے۔اور وہ باب سر بمہر کر کے ہدایت کی ہے کہ اس کی موت کے بعد اسے نکال کر پڑھا جائے۔خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ نظام الملک کو حسن بن صباح

کی طرف سے خوف لاحق ہے۔‘‘

’’اور تو............؟‘‘

افرونوس ایک لمحے خاموش رہا۔ ’’ہم‘‘ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’نیچے میدانوں میں تلواروں کی خوں آشامی۔ محصولات کی گراں باری۔ ملاؤں کا تشدد اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں ان باتوں کو خواجہ عمر کے لیے کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ سلطان کا مقبول بارگاہ ہے لیکن ہم غیر مسلم تاجروں کے لیے ان کی حیثیت کڑی زنجیروں سے بھی زیادہ ہے............ ہم ارمنی کیا ہیں۔ غلاموں سے بھی بدتر...... یہاں جبال کی بلندیوں پر امن ہے۔ آزادی ہے۔‘‘ اس کی آواز میں ایک نامعلوم سا اشتیاق شامل ہو گیا۔ اور جیسے جیسے تجربہ کار اور جہاں دیدہ، تاجر پہاڑیوں اور پرپیچ گھاٹیوں سے گزرتا ہوا منزل مقصود سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اس کے دل میں ایک امنگ، ایک خوشگوار احساس، ایک ولولہ جنم لے رہا تھا۔ وہ کبھی ترنگ میں آکر اپنے خچر کے کوڑا مارتا اور کبھی آگے بڑھ کر خواجہ عمر کے مرکب کے قریب ہو جاتا۔ دوسرے جانور اور افراد بھی خاموشی سے راستہ طے کرنے میں مصروف تھے۔ عمر نے خیر مقدم کی دھیمی دھیمی آوازیں سنیں۔ ملائم قہقہوں کی آواز اس کے کان میں آئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ کسی کے پاس کوئی روشنی نہیں تھی۔

نظروں سے پوشیدہ پہرے داروں نے جب انہیں کچھ وقفے کے لیے روکا تو کہیں قریب ہی بہتے ہوئے دریا کی دھیمی دھیمی گنگناہٹ خیام کے کانوں میں آئی اور ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا سر کے اوپر سے گزرتا ہوا محسوس ہوا جس میں شاہ بلوط

کے درختوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ خچر مستعدی سے پتھریلے راستے پر اوپر کی طرف چڑھنے میں مصروف تھے۔ یکا یک کرخت آواز میں کسی نے للکارا:

''رک جاؤ! اے رات کی تاریکی میں آوارہ گردی کرنے والو!''

اور کسی شخص نے عمر کے قریب سے جواب دیا۔ ''نہیں! اے شخص۔ ہم سات رفیق ہیں۔''

''تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟''

''اس دن کی جو ابھی نمودار نہیں ہوا۔''

خچر پھر آگے بڑھنے لگے۔ سنگلاخ زمین پر ان کے سموں کی آواز تیز ہوگئی۔ عمر نے محسوس کیا کہ وہ تیزی سے کسی ایسے راستے پر مڑ گئے ہیں جو ڈھلان سے ہوتا ہوا اس کی چوٹی کی طرف جاتا ہے نیچے اچھی خاصی گہرائی میں دریا پتھروں سے ٹکراتا ہشور مچاتا بہہ رہا ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے عمر کی ڈھیلی ڈھالی عبا کو اڑا رہے تھے۔ اس نے خچر کو اپنے گھٹنوں میں مضبوطی سے دبا لیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک لامحدود خلا میں ڈولتا ہوا جا رہا ہے۔

پھر اس کے چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ چلتے ہوئے خچر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئے۔ ایک بڑے دروازے کے قلابے چیخنے، ایک موٹی سی زنجیر کھڑکنے کی آوازیں اس کے کان میں آئیں۔ اور کسی نے اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی دفعتاً کھول دی۔

ایک لالٹین کی تیز لو نے تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر

دی۔ جب اس نے آنکھیں مل کر اپنے چاروں طرف نظر ڈالی تو خود کو ایک وسیع صحن میں کھڑے پایا۔ آسمان پر ان گنت ستارے جگمگ جگمگ کر کے فضا میں دودھیا روشنی بکھیر رہے تھے۔ اقرونوس اور اس کے دوسرے ہم سفر غائب تھے۔ ایک سیاہ فام لڑکا اس کے خچر کی لگام تھام کھسیانے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ایک پستہ قدم آدمی سرخ ریشم میں ملبوس سلام کے لیے جھکا ہوا تھا۔

''آپ کی تشریف آوری مبارک ہو۔ آقا! مجھے رکن الدین کہتے ہیں اور میرا تعلق قاہرہ کی عظیم رصد گاہ سے ہے۔ آپ کی گراں قدر تصانیف کے مطالعے سے میں نے اپنی جہالت کے اندھیروں کو علم کی روشنی سے منور کیا ہے۔ قدم رنجہ فرمایئے اور اپنی آرام گاہ کو تشریف لے چلیے۔

عمر کا سارا جسم تکان سے چور ہو رہا تھا۔ رکن الدین کے پیچھے پیچھے وہ عمارت کے بغلی دروازے میں داخل ہو کر ایک سنگین صحنچی میں سے گزرا جو غالباً عرصے سے ویران پڑی تھی کہ کچھ دور چل کر ایک کمرے میں پہنچ گیا جہاں بخارا کا بنا ہوا ایک بڑا قالین بچھا تھا قریب ہی ایک انگیٹھی روشن تھی۔ جس کے پاس ایک تشت میں شکر آمیز پھل اور روٹیاں رکھی تھیں۔ اور ساتھ ہی شراب سے بھرا ہوا ایک شیشہ بھی۔

سیاہ فام لڑکے کی طرف اشارے کرتے ہوئے رکن الدین نے عرض کیا۔ ''یہ آپ کا غلام ہے۔ آپ نے بہت صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اب آپ سکون کی نیند سو جائیں! خدا کرے آپ دل پذیر خواب دیکھیں۔''

جب ہم عصر مصری فاضل کورنش بجا لا کر رخصت ہو گیا تو عمر نے کچھ پھل وغیرہ

کھائے اور تشت لڑکے کے حوالے کر دیا۔ آرام سے بیٹھ کر اس نے شراب پی جو قدرے تیز چاشنی دار تھی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اس کمرے میں صرف وہی ایک کھڑکی تھی۔

نیچے خلا میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ستاروں بھرے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ادھر ادھر تیرتے پھر رہے تھے۔ کوئلے کا ایک وزنی ٹکڑا جو انگیٹھی سے نیچے گر گیا تھا عمر نے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینکا۔ غور سے سننے کے باوجود اس کے گرنے کی آواز کان میں نہ آسکی۔

وہ کچھ سوچتا ہوا بستر میں لیٹ گیا اور اپنے جسم کو اچھی طرح لپیٹ لیا کیونکہ پہاڑ کی ہوا خاصی سرد تھی۔ وہ کچھ دیر انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگاروں کو دیکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور آگ کی سرخی نیلگوں ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے لڑکے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی جو دروازے سے ٹیک لگائے سکڑا ہوا بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا سیاہ وجود عمر نے دیکھا، جیسے نکھرے ہوئے سفید رنگ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کمرے کا طول و عرض بھی اسے یقیناً کچھ بڑھا ہوا دکھائی دیا۔ اور چھت جیسے بلند ہو کر رات کی سیاہیوں سے ہم آغوش ہو گئی تھی۔

لیکن اس کے باوجود عمر اپنے آپ کو توانا اور تندرست بھی محسوس کر رہا تھا۔

''عجیب قسم کی نیند آتی ہے۔ اس کوہستانی علاقے میں۔'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔

دوسرے دن اسے معلوم ہوا کہ قلعہ الموت ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے جس

کے دونوں طرف گہری گھاٹیاں ہیں۔ جس راستے سے وہ یہاں پہنچا تھا وہ اس جگہ سے نظر نہ آتا تھا کیونکہ گھاٹی کی ڈھلان سیدھی اس دریا پر جا کر ختم ہوتی تھی جس کا پانی اوپر سے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے پگھلی ہوئی چاندی سبک رفتاری سے بہہ رہی ہو۔ دریا کے اس پار پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ ایسا نظر آتا تھا جیسے فوج کے دستے یکے بعد دیگرے پڑاؤ ڈالے پڑے ہوں یا پھر جیسے بلند قامت مینار قطار اندر قطار کھڑے ہوں۔

چونکہ ''الموت'' کی دیواریں قدرتی چٹانوں میں تراشی گئی تھیں۔ عمر کو خیال آیا کہ یہ قلعہ گھاٹی کے دوسرے رخ سے پہاڑ کی چوٹی کی طرح نظر آنا چاہیے۔ واقعی سوائے ان عقابوں کے جو اس کے چاروں طرف منڈلاتے رہتے ہیں اور کوئی اس قلعے کو اوپر سے نہیں دیکھ سکتا ہے۔ غور سے دیکھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ قلعے کی عمارت اور اس کے وسیع صحن پہاڑ کی چوٹی کے محض ایک حصہ کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔

قلعے کے وسط میں ایک سنگین دیوار تھی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درخت اگے ہوئے نظر آتے تھے۔

''جی ہاں۔ وہ پائیں باغ ہے۔'' رکن الدین نے بتایا۔ ''جسے آپ کسی وقت ملاحظہ کریں گے۔''

کبھی کبھی عمر کو دیوار پر پہرے دار چلتے پھرتے نظر آ جاتے تھے۔ جو حسب دستور سفید عبائیں، سرخ پٹکے اور جوتے پہنے ہوئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ سعید جنہیں

اس نے رے میں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ نوکروں کی کثیر تعداد بھی وہاں موجود تھی۔ جن میں سے بیشتر سیاہ فام حبشی اور مصری معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہاں اسے کسی عورت کا چہرہ نظر نہ آ سکا۔ نہ اعلیٰ منصب وار قسم کے لوگ دکھائی دیئے۔ بجز ان چند اشخاص کے جو رکن الدین کی طرح چینی ساخت کے چغے پہنے ہوئے تھے۔ وہ ہر زبان میں ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے تھے۔

''ہم محض ''داعی'' ہیں .... آپ مبلغ کہہ سکتے ہیں۔'' رکن الدین نے بڑی شگفتگی سے اس کا امر کا اقرار کیا۔ ''چونکہ ہم مختلف مقامات سے آئے ہیں اور مسلسل سفر کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے بہت سی زبانیں جانتے ہیں۔ میری ہی مثال لے لیجئے۔ میں قاہرہ کا باشندہ ہوں۔ لیکن سلیس فارسی میں بات چیت کر سکتا ہوں .... چلئے میں آپ کو کتب خانے کی سیر کراؤں۔ مجھے یقین ہے آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔''

وہ وسطی زینے سے پہلی منزل پر اتر آیا۔ اور ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جس میں بے شمار محرابیں اور طاق بنے ہوئے تھے۔ ہر جگہ تیل کے چراغ روشن تھا۔ اونچی اونچی میزوں پر بہت سے آدمی لکھنے پڑھنے میں مصروف۔ یونانی مخطوطات کی الماری کے سامنے پہنچ کر عمر ٹھہر گیا اور انہیں الٹ پلٹ کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہ ارسطرقس (Ariotarcus) کی اس کتاب کا نسخہ تھا جس میں چاند کے محور کی پیائش کی گئی تھی اور اس کے گھٹنے سے متعلق مسائل پر بحث تھی۔ برابر میں رکھی ہوئی کتاب پلوٹینس (Plotimus) کی ایک جلد تھی۔

''بخدا اس سے قبل یہ کتابیں میری نظر سے نہیں گزریں۔ عمر نے با آواز بلند کہا۔
''

''جی ہاں۔ انہیں مصر سے حاصل کیا گیا ہے جہاں یہ اس آگ کی نذر ہونے سے بچ گئی تھیں جس نے اسکندریہ کے کتب خانے کو خاکستر کر دیا تھا۔ سنا ہے مسلمانوں نے ان کتابوں کو ایندھن کے طور پر جلایا تھا............ بہر حال بہت سی نادر الوجود کتابیں جلنے سے بچ گئی تھیں۔ ''سیدنا'' ہمارے آقا نے انہیں تلاش کر کے حاصل کر لیا ہے۔ ہمارے پاس نقشے بھی ہیں۔ میں نے آپ سے کیا عرض کروں کہ ہمارے پاس کیسے کیسے بے بہا خزانے ہیں۔ ہمارے دو داعی بازنطینی ہیں اگر آپ ارشاد فرمائیں تو اصل یونانی متن کا ترجمہ آپ کے گوش گزار کریں۔''

باوجودیکہ پلوٹینس (Plotinus) کی جلد حاصل کر کے خیام پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی تھی لیکن اسی دوران میں اس سے محسوس کیا کہ رکن الدین مسلمانوں کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے وہ اور اس کے ساتھی کسی عجیب و غریب مذہب کے پیرو ہوں۔

''یہ قلعہ ہے یا کوئی دانش گاہ؟'' عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دونوں۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ جی ہاں............ ہم علم حاصل کرتے ہیں مگر توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے اثرات سے ماورا ہو کر............ یہ ملاحظہ کیجئے۔''

پستہ قد داعی نے چند کثیر الاستعمال کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ الجبرا ہے۔

یہ معلولت القرینہ ہے۔ اور یہ عمر خیال کا رسالہ نجوم و ہیئت ہے۔" رکن الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان سب کتابوں کی بڑی ضرورت رہتی ہے۔ میں نے علم ریاضی پر آپ کے تمام تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن آپ کے دوسرے علمی شاہکار میری ناچیز عقل اور سمجھ سے بالاتر ہیں۔ لیکن "سیدنا" نے انہیں بغور پڑھا ہے۔"

"یعنی شیخ الجبال" "تمہارے آقا نے؟"

"جی ہاں۔ بے شک۔ مجھے تو بنیادی سات علوم میں بھی تھوڑی سی ہی شدبد ہے۔ میری مراد منطق، علم الحساب، موسیقی، مساحت، نجوم، طبعیات اور مابعد الطبعیات سے ہے۔ لیکن سیدنا کو تو تمام مذاہب کی جزئیات تک کا علم ہے۔ حتیٰ کہ "سحر" کے متعلق بھی ان کی معلومات مکمل ہیں۔ ہم اس لیے بھی خوشی خوشی ان کی فرماں برداری کرتے ہیں کہ ان کا علم ہر جہت سے کامل ہے۔"

عمر پلوٹینس (Plotinus) کے صفحے الٹنے میں مصروف تھا۔ اس نے رکن الدین کا آخری جملہ نہیں سنا۔ اس کا دماغ جذر المکعب کے مسائل میں الجھ کر کہیں دور نکل گیا تھا۔

قلعہ الموت میں وقت کا کوئی شمار نہیں ہوتا تھا۔ جب عمر کتب خانہ اسکندریہ کے مخطوطات کے مطالعے میں مصروف نہ ہوتا تو وہ داعیوں کے پاس بیٹھ کر جو دنیا کے ہر آباد خطے کی سیاحت کر چکے تھے۔ چینیوں کے سائنسی نظریات پر تبادلہ خیال یا بازنطینی موسیقی پر بحث کرتا۔

عمر کو رکن الدین کے طلسمی مربع بنانے کے شوق پر بڑی ہنسی آتی تھی۔ اس

چھوٹے سے قد کے ریاضی داں نے اعداد کے کچھ ایسے ''اجتماعات'' ترتیب دے رکھے تھے۔ جنہیں ہر پھیر کے جوڑنے یا ضرب دینے سے حاصل جمع اور حاصل ضرب ہمیشہ ایک ہی نکلتا تھا۔ عمر جس نے ہمیشہ عملی مسائل حل کرنے کی کوشش کی تھی ان مربعوں کو دیکھ کر رکن الدین سے یہی کہتا کہ ''یہ مربعے ہیں تو بڑے دلچسپ لیکن ان سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن عام آدمیوں کے لیے یہ بے معنی نہیں ہیں۔'' رکن الدین نے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک قسم کا معجزہ معلوم ہوتے ہیں یہ مربعے۔''

ہر شب عمر خیام پر پہلی رات کی طرح نیم خوابی کی کیفیت طاری ہوتی رہی۔ اس کے کمرے کی دیواریں طرح طرح کے رنگ بدلتی رہیں۔ خود اسے بھی پہلے دن کی سی توانائی اور صحت کا احساس ہوتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ آیا یہ تیز شراب اور کوہستانی ہوا کے اثرات ہیں یا کیا؟

لیکن اس کے باوجود وہ شمالی افق پر نیچے کی جانب جھکے ہوئے ایسے ستاروں کو برابر مطالعہ کرتا رہا جو نیشا پور سے نظر نہ آسکتے تھے وہ حسب معمول رات ڈھلے ایک مینار پر چڑھا ہوا، ستاروں کے مطالعے میں مصروف تھا کہ رکن الدین ہانپتا اس کے پاس پہنچا۔

''ہمارا آقا تم سے ملنا چاہتا ہے۔ چلو! جلدی چلو!!''

عمر نے مجبوراً وہ جدول نامکمل چھوڑ دی جسے بنانے میں وہ مصروف تھا۔ رکن الدین نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا۔ ''تم آج ایسی چیزیں دیکھو گے جنہیں اس

پہلے باہر سے آنے والے کسی دوسرے شخص نے نہیں دیکھا۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ! میرے سوا کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔“

رکن عمر کو اپنے ساتھ لیے مینار سے تقریباً دوڑتا ہوا اتر کر کتب خانے کے بڑے ہال میں داخل ہوا اور اس دفعہ اس نے ایک نئے دروازے کا رخ کیا جو ایک نئے زینے میں کھلتا تھا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ یہ زینہ ایک سخت چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

”ذرا نیچے دیکھ کر چلو!“ اس نے ایک گول قندیل اوپر اٹھاتے ہوئے پیچھے مڑ کر بلند آواز سے کہا۔

عمر نے سنی ان سنی کر دی۔ سوائے پتھریلی دیواروں کے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نیچے کی جانب سے ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا۔ زینہ کچھ اس طرح گھومتا ہوا نیچے اتر رہا تھا جیسے دو بلند پہاڑیوں کے درمیان تنگ گھاٹی۔ عمر نے محسوس کیا کہ اس کے قدموں کے نیچے سیڑھیاں ایسے پتھر کی بنی ہوئی ہیں جس کے پرت اکھڑے ہوئے ہیں اور بے شمار انسانوں کے مسلسل استعمال سے گھسنے کی وجہ سے ان میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔

بعض جگہ تو یہ گڑھے اتنے گہرے تھے کہ اسے سنبھلنے کے لیے چٹان کی دیواروں کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آئی رکن الدین بڑے اعتماد اور تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جیسے اسے ان کے چپے چپے کا علم ہو۔ وہ ایک چونچال بکری کی طرح قلانچیں لگا رہا تھا۔ قندیل کی روشنی ہچکولوں کی وجہ سے کبھی تیز ہو جاتی کبھی مدھم۔

جب وہ اس سرنگ سے باہر نکل آئے تو عمر نے ایک لمبا سانس لیا۔ ''یہ سیڑھیاں بہت قدیم معلوم ہوتی ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''کیا یہ کوئی مکان ہے؟''

پستہ قد فلسفی نے عمر کے چہرے پر ایک تجسس کی نظر ڈالی۔ تم پہلے شخص ہو جس نے یہ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اس قسم کا سوال کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سیڑھیاں اس دور میں تعمیر کی گئی تھیں جب انسان سورج کی پرستش کرتا تھا.......... اور آگ کی۔ وہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی شے کی تلاش میں اس نخیبی مقام تک پہنچا تھا۔ اچھا اب صرف آنکھوں سے کام لو۔ زبان بند رکھو۔''

ایک چھتے میں داخل ہوتے ہوئے عمر نے سوچا یہ سرنگ قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے تقریباً دوڑتے ہوئے اسے طے کیا۔ جب وہ اس چھتے کے آخری سرے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک سیاہ فام سپاہی ایک نیزے کی ٹیک لگائے، چوبی دروازے کے قریب اندھیرے میں اکیلا کھڑا ہے۔

اس پہرے دار نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور رکن الدین نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ اس قدر نیچا تھا کہ اس نے گزرنے کے لیے عمر کو جھکنا پڑا۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اس نے خود کو ایک وسیع صحن میں پایا، جہاں خاصی تعداد میں آدمی پہلے سے جمع تھے۔

رکن الدین نے عمر کا ہاتھ پکڑا اور بیٹھے ہوا آدمیوں کی طرف لے گیا جنہوں نے انہیں قریب آتا دیکھ کر بڑی بے چینی کا اظہار کیا۔ ایک خالی جگہ دیکھ کر رکن الدین نے عمر کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

عمر نے بیٹھ کر اپنے سامنے نظر دوڑائی۔ دور تک کالے کالے سر اور چوڑے چوڑے شانے دکھائی دیتے تھے۔ اور آخری سرے پر آگ روشنی تھی جس کے شعلے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد فرش کی سطح سے بلند ہو رہے تھے۔ ان شعلوں کی روشنی میں نیلاہٹ تھی اور ان کا رنگ آگ کے عام شعلوں سے قدرے مختلف تھا۔ سب لوگوں آواز ملا کر گا رہے تھے۔ اور کسی نامعلوم جگہ سے اٹھتی ہوئی موسیقی کی لہریں ان کی آوازوں کی زیر و بم کا ساتھ دے کر ماحول میں ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔

یہ موسیقی۔ عمر نے سوچا۔ غالباً بانسریوں سے پیدا ہو رہی ہے لیکن کبھی کبھی سرگم کی آواز اور روپہلی گھنٹیوں کی سریلی کھنکھناہٹ کا بھی احساس ہوتا تھا جو اس گپھا کی بلندیوں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

حالانکہ یہ مجمع موسیقی کی تال پر بے خود ہو کر جھوم رہا تھا لیکن وقتاً فوقتاً ہر شخص گردن اٹھا کر اس خلا کی طرف بھی دیکھنے لگتا تھا جو آگ کے شعلوں کے اس پار تھا۔ عمر چند لمحے خاموشی سے حاضرین کو دیکھتا رہا۔

وہ سب نوجوان تھے حسب معمول قلعہ الموت کے پہرے داروں کا سا سرخ و سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو دبلے پتلے، سیاہ سروں والے عرب معلوم ہوتے تھے باقی ہندو یا چینی تھے۔

یہ ''فدائی'' ہیں۔ رکن الدین نے عمر کے کان میں کہا۔ یہ ان کی آزادی اور جشن کی رات ہے۔ انہیں بہت جلد آقائے موت و حیات کی زیارت نصیب ہوگی۔

ان کی آنکھیں ابل کر اوپر آ گئی تھیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے عماموں کے لٹکتے ہوئے سروں سے پسینہ پونچھتے جاتے تھے جو ان کی پیشانیوں سے برابر بہہ رہا تھا۔ شعلوں کے اس پار کوئی چیز دیکھنے کے لیے بار بار نظریں جما رہے تھے۔ جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا تھا۔

پھر رقص شروع ہو گیا۔ تلواروں کا رقص۔ ایک نیم برہنہ شخص اپنے بازو بلند کیے بیچ میں کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف تلواریں ہی تلواریں چمک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس نے بھی ناچنا شروع کر دیا اور زور زور سے گانے کے اندر میں نعرے لگانے لگا۔ ''اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو۔''

تمام مجمع نے ایک آواز ہو کر یہ نعرہ دوہرایا۔ ہر شخص جھوم رہا تھا اور دور کہیں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

گانے والے کے چاروں طرف ناچنے والے گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں دو تلواریں تھیں جن کو وہ اتنی چابکدستی سے گھما رہے تھے کہ کیا مجال تلوار سے تلوار ٹکرا جائے۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ایک رقاص دوسرے رقاص کا سر قلم کر رہا ہے۔ اور جیسے جیسے رقص کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی ان کے ننگے بازوؤں سے پسینہ بہہ بہہ کر فرش پر ٹپکتا جاتا تھا۔ تلواروں کی مسلسل حرکت سے چمکتے ہوئے لوہے کی محرابیں سی بنتی بگڑتی نظر آ رہی تھیں۔

''اللہ ہو، اللہ ہو'' جھومتے ہوئے مجمع کی دل دوز آواز فضا میں گونجتی رہی۔ یہ رقص کتنی دیر جاری رہا عمر کو اندازہ نہ ہو سکا۔ لیکن اب ختم ہونے ہی والا تھا۔ رکن

الدین نے عمر کا بازو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔
دوسری جانب ایک نوعمر لڑکا سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

''اس کا وقت آ پہنچا ہے۔'' اس شور وغل میں کسی کی آواز تیر کی طرح آتی ہوئی سنائی دی۔ ''جنت کو..... جنت کو۔''

وہ شخص جس نے اپنے بازو بلند کر رکھے تھے اور سر پیچھے کو نیوڑھا رکھا تھا تیزی سے حرکت کرتی ہوئی تلواروں کے سائے میں بدستور آہستہ آہستہ ناچ رہا تھا۔ اس رقاص کی پشت پر عمر کو کسی اور چیز کا احساس ہوا۔ بلند ہوتے ہوئے شعلوں کے درمیان ایک ہیولے نمودار ہونا شروع ہوا۔ ایک درندے کا ہیولے۔ جس کے پاؤں خوں خوار جانور کی طرح ناخن وڈار تھے۔ ٹانگیں شیر کی سی، جسم بیل کی مانند، اس کا چہرہ انسانوں کا سا تھا جس پر ایک لمبی داڑھی تھی۔ لیکن بے حد بھیانک۔

چہرے کے دونوں جانب پرندوں جیسی مگر لمبے چوڑے بازو اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا۔ کہ گویہ ہیولے ایک پتھر کا مجسمہ تھا لیکن جلتی بجھتی روشنی نے اسے ایک زندہ وجود بنا کر پیش کر دیا تھا۔

''اب'' رکن الدین نے بلند آواز میں کہا۔ ''اب وہ جنت کو روانہ ہو رہا ہے۔''

رقص کرتا ہوا آدمی اب بالکل ساکت کھڑا تھا۔ تلواریں اس کے جسم سے مس ہو رہی تھیں۔ جگہ جگہ سے اس کا گوشت کٹ گیا۔ اور خون بہہ کر اس کے سفید لباس میں جذب ہونے لگا۔ کپڑوں پر خون کے دھبے دھبے بڑھنے شروع ہو گئے اور ایک اندرونی جوش کے زیر اثر اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ بلند بازو دفعتاً نیچے گر

گئے۔ تلواریں اس کی گردن میں پیوست ہوگئیں اور اس کا سر تن سے جدا ہو کر الگ جا پڑا۔

لمحہ بھر کے لیے اس کا جسم اینٹھا۔ بازوؤں کو ایک جھٹکا سا لگا اور آخر وہ فرش پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

اور جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ موسیقی بند ہو چکی تھی۔ گانے والے خاموش ہو گئے تھے۔ ہر طرف موت کا سناٹا طاری تھا۔ علاوہ عمر اور رکن الدین نے ہر فرد کی پیشانی سجدے کی حالت میں فرش زمین پر لگی ہوئی تھی۔

''حیات اور موت کا آقا'' خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز بلند ہوئی۔ باریش بیل کے بنچوں کے بیچ میں سے ایک قدآور شخص سفید براق کپڑوں میں ملبوس نمودار ہوا۔ وہ ٹھوڑی سے پیروں تک کپڑوں میں مصری، ''ممی'' کی طرح لپٹا ہوا تھا لیکن اس کا سیاہ سر غمازی کر رہا تھا کہ وہ حسن بن صباح ہے۔

اس نے جھک کر اپنے قدموں میں پڑی ہوئی لاش کو اٹھایا۔

''فدائیو! تم دیکھتے ہو'' اس نے با آواز بلند کہا۔ ''یہ شخص جنت کو سدھار گیا۔''

عمر کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے سب لوگ اپنے گھٹنوں پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سنگین درندے کے پنجوں کے درمیان حسن کو کھڑے پایا۔ اس کے بازوؤں میں سر بریدہ لاش تھی۔ لیکن .... مجمع کا سانس نیچے کا نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا جب انہوں نے دیکھا کہ حسن کے بازوؤں پر لیٹے ہوئے شخص کے جسم پر خراش تک نہ تھی۔ اس کا سر اس کی گردن کے ساتھ پیچھے کو لٹک رہا تھا۔ اور اس کے

سفید کپڑوں پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہ تھی۔ وہ ڈھیلا ڈھالا جسم ہو بہو اس رقاص کا تھا جسے تلواریں مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

''بے شک'' سارے مجمع نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ''یہ معجزہ ہے۔''

مذکورہ شخص کو اپنے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے حسن الٹے پاؤں پر دار درندے کے پیروں کی طرف پیچھے ہٹتا گیا حتیٰ کہ غار کے عقبی اندھیروں میں نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔ تلواروں کے ساتھ رقص کرنے والوں کا سانس ہنوز پھولا ہوا تھا۔ وہ شعلوں کے گرد چکر لگا کر ایک ایک کر کے بقیہ مجمع میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ اب عمر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ نوعمر لڑکے اپنے کندھوں پر صراحیاں اٹھائے ان سفید پوش افراد میں شراب کے چھلکتے جام تقسیم کرتے پھرنے لگے جام لینے کے لیے ہر طرف بے اختیارانہ ہاتھ اٹھ گئے۔

''سارے معبودوں کی قسم'' رکن الدین نے دبی زبان سے کہا۔ ''اس طرح کا منظر دیکھنے کے بعد جو ہیبت طاری ہوتی ہے اس پر قابو پانے کے لیے شراب سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہے.......... بلند آواز سے کوئی بات نہ کرنا۔ ان تیغ زنوں پر اس وقت ایسا جنون سوار ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ سامنے والے سنگین درندے کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیں انہیں معلوم نہیں کہ تم ایک معزز مہمان کی حیثیت سے یہاں موجود ہو۔ سمجھے!''

جب اس نے جام ہاتھ میں لیا تو رکن الدین کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں جام خالی کر دیا۔ عمر نے دیکھا کہ ایک تیغ زن کپڑے سے اپنی تلوار پر

جما ہوا خون صاف کر رہا ہے۔

اسے یقین ہو گیا کہ وہ خون یقیناً اصلی خون تھا۔

تیغ زن نے گھور کر عمر کو دیکھا اور غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے عمر کے عین سامنے آ کر اپنی ننگی تلوار اس کی آنکھوں کے قریب کر دی۔ ''لے چھوڑ کر دیکھ! سونگھ اسے! اور اگر پھر بھی تجھے شک ہے کہ یہ اصلی خون نہیں ہے'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''تو میں تجھے اچھی طرح یقین دلا دوں گا کہ آیا تیرا اپنا خون بھی اصلی ہے یا نہیں۔''

سارے مجمع نے دفعتاً مڑ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمر کو دیکھا۔ مسلسل رقص نے ان سب میں ایک ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی اور وہ اس حد تک مدہوش ہو چکے تھے کہ ہر قسم کا مجرمانہ تشدد ان کے لیے مزید سرخوشی کا باعث ہو سکتا تھا۔

''یا اللہ! یہ آخر یہاں آیا کس طرح؟ اسے یہاں کون لایا؟'' رکن الدین نے ایک لڑکے سے شراب کا پیالہ چھین کر جلدی سے عمر کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''پی لے'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''خبردار جو ایک لفظ زبان سے نکالا۔ جنگلی چیتے ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ شریف ہیں۔'' اور مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''یہ شخص داعیوں کا مہمان ہے۔ اسے حکم ملا تھا کہ یہاں آ کر ہمارے آقا کی زیارت سے مشرف ہو۔''

''کون اس کی ضمانت دیتا ہے؟''

ایک نوعمر شخص لڑکھڑاتا ہوا اس حلقے سے باہر آیا جو عمر کے گرد لوگوں نے بنالیا تھا۔ معمر آدمیوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے اپنی کمر میں لٹکے ہوئے پیش قبض کے دستے پر مضبوطی سے ہاتھ جمالیا۔ اس کا منہ کچھ عجب طرح کھلا ہوا تھا وہ خالی خالی نظروں سے عمر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر نشے کی شدت سے بار بار ادھر ادھر ہلتا تھا۔ ''کون اس کی ضمانت دیتا ہے۔''

''میں دیتا ہوں ضمانت'' رکن الدین نے اس نوجوان کو دھکیل کر پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''یہ ان پہاڑیوں کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا۔ ذرا اس کی داڑھی پر لگے ہوئے خضاب کو دیکھو............ اور اس کے ہاتھوں کی سفید کھال پر نظر ڈالو............ ہمارے آقا کے غلامو! یہ شخص ضرور بھیس بدل کر یہاں آیا ہے۔ جاسوس معلوم ہوتا ہے۔''

مغلوب الغضب چہرے ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ شدت جذبات سے ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ان کے نتھنے خوں خوارانہ انداز میں پھڑکنے لگے............ عمر کو اچانک اپنا دماغ جلتا ہوا محسوس ہوا۔ غار کی دیواریں خود پر تنگ ہوتی معلوم ہوئیں۔ اس نے دیکھا جیسے راہبوں کی ایک بڑی تعداد اس کے سامنے موجود ہے۔ وہ جنہوں نے زمین کی اس مرکزی قربان گاہ کے بے لوث خدمت کی ہے۔ زمین کے اس شگاف میں بیٹھ کر روز ازل سے اب تک۔

درندے کا بت پھیل کر دیو قامت سا ہو گیا تھا۔ اس کے سنگین بازو حرکت

کرتے دکھائی دے رہے تھے۔اس کے پنجوں کے درمیان وہ قربان گاہ تھی جہاں ایک نہ ایک دن ہر شخص کو ضرور آنا تھا.......... کی قربان گاہ اور ہمیشہ جلتی رہنے والی آگ۔عمر نے کھڑے ہو کر ایک قہقہہ لگایا کیونکہ اس کے خیال میں ان درندوں کے غضب سے محفوظ رہنے کی کوشش مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔

''راستہ دو۔راستہ دو۔''

بھاری بھاری قدموں کی آواز قریب آتی سنائی دی۔اور لمبے لمبے عصا مجمع کے سروں سے ٹکرانے لگے۔سیاہ فام غلاموں کا ایک دستہ کندھے سے کندھا ملائے جمع کو چیرتا ہوا عمر کی طرف بڑھا۔

سارے تیغ زن یا تو دیوانوں کی طرح غل غپاڑا مچا رہے تھے،یا ان حبشیوں کے عصاؤں سے مضروب ہو کر حیرت انگیز طریقہ سے ایک دم دو رویہ پیچھے ہٹ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔حبشی غلاموں نے بڑھ کر عمر کو اپنے حلقے میں لے لیا۔چند غلام اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر وہاں سے لے جانے لگے۔زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئیں۔جب وہ ایک تاریک غلام گردش سے گزرے تو عمر نے محسوس کیا کہ حبشی غلاموں کے قدموں کی آوازیں بہت بلند ہو گئی ہیں۔

ایک شدید قسم کی غنودگی عمر پر غالب آگئی۔کسی طرح کی ڈولی میں اندھیرے راستوں سے اسے کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ایک مقام پر پہنچ کر جب اسے رک جانے کا احساس ہوا تو تیز خوشبو کی مہک اس کی ناک میں پہنچی۔اس نے کوشش کر

کے اپنی آنکھیں کھولیں۔

اس نے گردن موڑ کر اس انگیٹھی کے دہکتے ہوئے کوئلوں کو دیکھا جہاں سے دھواں اٹھ کر لہراتا ہوا اس کے چہرے کی طرف آرہا تھا۔ اس دھوئیں میں نفیس خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر کسی نے ہاتھ پھیرا۔ حسن بن صباح اس پر جھکا ہوا تھا بار بار یہ دو لفظ دہرا رہا تھا۔

''بہشت کو............بہشت کو۔''

سات ستاروں کا گچھا دور، آسمان پر، جوزا کے منطقے میں چمک رہا تھا۔ قریب میں مثمن اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھے۔ سرطان کی آنکھ سے تیز روشنی کی شعاعیں نکل کر اس کے پنجوں کی شکل واضح کر رہی تھیں۔

عمر نے سر اٹھا کر دوسرے ستاروں کے مقامات کا جائزہ لیا۔ تمام ستارے اپنے اپنے صحیح مقام پر موجود تھے لیکن اس کے باوجود عمر کو آسمان کچھ عجیب سا نظر آیا۔ اس نے متفکرانہ انداز میں سنہرے چاند کے گول چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس ہیئت کے آسمان پر اس وقت چاند کی موجودگی عمر کے لیے تعجب خیز تھی اور چاند بھی موسم خزاں کا پورا چاند! علاوہ ازیں اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اپنا ہاتھ ذرا بلند کرلے تو وہ چاند کے چہرے کو چھو سکتا ہے۔

اس نے اطمینان کا ایک خوش گوار سانس لیا۔ اور محسوس کیا کہ وہ آرام سے لیٹا ہوا ہے۔ اسے بدن بھی ہلکا پھلکا محسوس ہوا اور اس کا دماغ ماؤف سا تھا جیسے اس کے اردگرد ایک باریک پردہ پڑا ہو۔ بہر حال وہ بڑے چونچال انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ایک ثمر دار درخت نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ درخت کچی کلیوں اور نیم شگفتہ پھولوں سے لدا ہوا تھا جن کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ ان پھولوں کے تمام رنگ چاندنی میں منعکس تھے۔ لیکن وہ چاند کہاں گیا؟ عمر کو اس امر کا یقین تھا کہ اس نے ابھی چاند دیکھا تھا۔

اس کے پیروں کے نیچے ہری اور ملائم دوب (گھاس) اس کے تلووں کو گدگدا رہی تھی۔ پھر اس نے متجسس نگاہوں سے اپنے بازوؤں پر نظر ڈالی جو ہلکے پھلکے ریشمی کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اسے اپنا جسم غیر متوقع طور پر خوبصورت نظر آیا۔ اس احساس سے وہ بہت خوش ہوا۔

پھر بہتے ہوئے پانی کی خوش آہند موسیقی اس کے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ اگرچہ اس کے پاؤں اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ بہر حال کشاں کشاں وہ اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے پانی نکل کر بہہ رہا تھا۔ اس نے خود کو ایک آبشار کے دہانے پر کھڑا پایا۔

اس نے دیکھا کہ وہ آبشار ایک چٹان سے نمودار ہوتی تھی۔ وہ پانی کے پینے کے لیے گھٹنوں کے بل نیچے جھکا۔ پہلے اس نے چکھنے کے انداز میں ایک گھونٹ لیا پھر دیر تک پیتا رہا۔ اس کے حلق میں خشکی کی وجہ سے کانٹے پڑ گئے تھے۔ اور وہ بہتا ہوا خوش ذائقہ پانی دراصل شیراز کی سرخ شراب تھا۔

''شیراز کی نفیس شراب'' عمر نے زور سے کہا اور خود اپنی آواز غور سے سننے لگا جو رات کی گھمبیرتا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

اس کی بے قرار نگاہیں ایک شیر پر جا کر رکیں جو دانت نکوسے کھڑا تھا۔ وہ بغیر کسی دشواری کے شیر کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے سخت سر کو چھوڑ کر دیکھا جو چینی کے برتن کی طرح چکنا تھا۔ شیر نے کوئی حرکت نہ کی۔ عمر اچھل کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا لیکن اس پر بھی وہ ساکت کھڑا رہا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ اس کے پیٹھ سے اتر آیا۔ اس وقت تک عمر کو اس ''مہتاب باغ'' کے متعلق تین باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔

''پہلی بات تو یہ کہ چاند مصنوعی تھا۔ دوسری بات یہ کہ آبشار سے پانی کے بجائے شراب ابل رہی تھی۔ اور اس کی تیسری دریافت یہ تھی کہ شیر چینی مٹی کا بنا ہوا تھا۔''

یہاں تک معلومات حاصل کرنے کے بعد عمر کو کسی نادر دریافت کی امید بندھنے لگی تھی۔ یکا یک اس کا دماغ منطقی استدلال سے تھک گیا۔ اس کے قدم بلا ارادہ ایک چشمے کی طرف اٹھ گئے جو بہت ہی پرسکون اور دلکش تھا۔ سفید آبی پھول پانی کی سطح پر ہر طرف کھلے ہوئے تھے۔ اور دور ایک راج ہنس اپنے سفید پروں میں اپنا سر چھپائے نیند کے عالم میں تیر رہا تھا۔ عمر کو سونے کا یہ انداز بے حد نفیس معلوم ہوا۔

پھر اسے باغ کے کسی کونے میں ایک گنگناتی ہوئی آواز کا احساس ہوا۔ چوکنا ہو کر اس نے آواز پر کان لگائے۔ اس کا خیال صحیح تھا۔ ''یہ بلبل تو ہے نہیں جو اس ''مہتاب باغ'' میں ادھر ادھر چہچہاتی پھر رہی ہو۔ یقیناً یہ کسی عورت کے گانے کی آواز ہے۔'' تھوڑی دیر سننے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ وہ بانسری کے لے پر گا رہی ہے۔ آواز بڑی سریلی تھی لیکن کچھ زیادہ جاذب توجہ بھی نہ تھی۔

واقعی جس چیز نے اسے اپنی طرف کھینچا وہ سطح آب پر ایک مکان سا تھا۔ جو غالباً تیر بھی رہا تھا۔ یا پھر جب وہ چشمہ نمودار ہوگا تو وہ عمارت وہاں پہلے سے موجود ہوگی ۔بہر حال ایک عمارت وہاں موجود تھی ۔اگر اسے وہاں پہنچنے کا راستہ معلوم ہو جائے تو ....!

چلتے چلتے زمین پر بچھی ہوئی گھنی بیلوں میں اس کا پیر الجھ گیا اور وہ اچانک گر پڑا ۔دراصل وہاں اندھیرا تھا اور اس جگہ چاند کی روشنی درختوں کی اوٹ سے نیچے نہ جھانک سکتی تھی ۔اس کی دونوں ٹانگیں انگور کی بیلوں میں بری طرح پھنس گئیں اور وہ چشمے کے کنارے پانی میں گر پڑا کچھ دیر وہ بڑی بے چارگی کے عالم میں پڑا رہا۔ وہیں پڑے پڑے اس نے رات کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اے شب تار! تو کہ اپنے اندھیروں میں گڑھے چھپائے ہوئے ہے، جن میں لاعلمی کی وجہ سے لوگ گر پڑتے ہیں تو کیا تیرا یہ بھی منشا ہے کہ وہ گرنے والے موت کی نیند سو جائیں؟''

اس کی اس شکایت کا کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اور پھر اس نے خود ہی سوچا کہ انگور کی یہ بیلیں بھی تو جانی پہچانی ہیں ۔اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک شاخ پکڑی اور زور لگا کر خشکی پر چڑھتے ہوئے پاس ہی اسے ایک پتلا سا پل دکھائی دیا جس کے اختتام پر وہ عمارت واقع تھی ۔یا پھر اس نے سوچا شاید کشتی ہو۔ تجسس یا تحقیق کے ماتحت نہیں بلکہ محض اپنا شبہ مٹانے کی غرض سے وہ پانی پر چمکتے ہوئے اس مقام تک پہنچنا چاہتا تھا۔

پل کے وسط میں پہنچ کر اس کی نظر خود اپنے سائے پر پڑی جو اس کے ساتھ

ساتھ پانی کی سطح پر چل رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے وہ رکا۔ جب اس کا سایہ بھی چلتے چلتے رک گیا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اسے یہ بات بڑی دلچسپ معلوم ہوئی۔

جب عمر نے اپنی میں کھڑے ہوئے اس مکان پر قدم رکھا تو مکان کو ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اس نے پردہ سرکا کر اندر جھانکا۔ قالین پر لیٹا ہوا ایک اور چاند اپنی روپہلی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر اسے چھوا۔ روشنی کی ایک چمکتی ہوئی بڑی سی گیند جس میں حرارت تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے اندر کوئی چیز کلبلائی۔ اور دبی آواز میں کسی نے کہا۔ ''ابراہیم کے بیٹے۔!''

عمر وہیں ملائم گدیلوں پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔

''نہیں! ابراہیم کا بیٹا نہ کہو'' اس نے نامعلوم آواز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔'' بلکہ عالی جناب خواجہ امام عمر ماہر فلکیات، منجم سلطان کہو! اے آوروہ شب! اٹھ! اور آداب بجا لا۔''

''اپنی کنیز پر رحم فرمائیے! ملاحظہ کیجئے! میں آداب بجا لاتی ہوں۔''

جنت کی اس حور کی آواز میں لجاجت اور اجنبیت تھی۔ لیکن خواب میں نظر آنے والی مخلوق فارسی یا عربی میں اس طرح گفتگو نہیں کیا کرتی کہ وہ آپ سے باتیں کرے اور آپ ان باتوں کو سمجھ بھی جائیں۔

لمبے سنہرے بال اس کے گھٹنے پر رکھی ہوئی پیشانی کے دونوں طرف لہرا رہے

تھے۔ ریشم سے بھی زیادہ ملائم انگلیاں ان میں پیوست تھیں۔

''کیا یہ کشتی'' عمر نے سوال کیا۔ ''کبھی نہ ختم ہونے والی رات میں مسلسل تیرتی رہتی ہے؟''

''ہر رات دوسری رات سے مشابہ ہوتی ہے۔''

''اور یہ چاند'' عمر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''کبھی نہیں بدلتا، کبھی نہیں نکلتا، کبھی نہیں ڈوبتا، نہ یہ کبھی بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔ اور فوق الفطرت مخلوق اس کی پرستش کرتی رہتی ہے۔''

ایک لمحے کے بعد عمر نے اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا۔ جس کا رنگ زرد تھا۔ اس نے خالی خالی عمر کو دیکھا۔ نازک ہونٹوں پر پژمردہ ہنسی نمودار ہوئی۔ عمر کے ذہن کو دھکا سا لگا۔

''زوئی!'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ اسے خراسان کی بڑی سڑک یاد آ گئی جب وہ اپنے خیمے میں لیٹا رحیم کے غم میں آنسو بہا رہا تھا............''وہ تجھے مجھ سے چھین کر لے گئے تھے۔ اور اس وقت میں صرف ابراہیم کا بیٹا تھا۔''

زوئی کا جسم بالکل ٹھنڈا تھا۔ وہ روپہلی روشنی میں خاموش اور ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ عمر نے اس کو لبوں کا بوسہ لیا۔ ان میں بھی گرمی مفقود تھی۔ اس نے زوئی کے بلوریں بازو پر اپنا سر رکھتے ہوئے سوچا کہ آخر وہ اس قدر خوف زدہ کیوں ہے۔ اور اس کا جسم لباس سے کیوں عاری ہے؟ لیکن بہر کیف زوئی حسین تھی۔ باوجودیکہ وہ اس کشتی میں رات کے وقت ایک مردے کی طرح تیر رہی تھی۔ رات جو کبھی ختم ہو

گی۔

''میں تجھے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔ لیکن فوراً ہی وہ مسکرایا۔ ''نہیں نہیں۔ آج بھی میری حیثیت ابراہیم کے بیٹے سے زیادہ نہیں ہے۔''

زوئی کے آنکھوں سے خوف زائل ہو گیا۔ اور اس کے ہونٹوں کی افسردگی شگفتگی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے اپنی صراحی دار گردن عمر کے سر سے پیوست کر دی۔ اور گہرا سانس لیا۔ راج ہنس بدستور نیند کے عالم میں پانی کی ساکن سطح پر تیر تا ہوا۔ چینی مٹی کے شیر کے قریب سے گزرا۔ عمر نے دیکھا کہ زوئی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز روشنی کی طرف پھینکی اور روشنی رفتہ رفتہ اتنی مدھم ہو گئی جیسے خیمے کی سوتی دیوار سے چھن کر آ رہی ہو۔

زوئی نے پھر عمر کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور اس مرتبہ اس کا جسم مردے کی طرح سرد نہ تھا............ اس میں حرارت تھی۔ زندگی تھی۔

حسن نے عمر کو جگانے اور اس سے ملاقات کرنے کا وقت دوسرے دن صبح کو طے کر رکھا تھا۔ جب وہ عمر کے کمرے میں بغیر اطلاع کے داخل ہوا تو نوعمر سیاہ فام غلام کا چہرہ مارے خوف کے فق ہو گیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ احتیاط کے ساتھ دروازہ بند کر کے حسن نیند میں مدہوش عمر کے قریب قالین پر بیٹھ گیا اور آہستہ آواز میں عمر سے مخاطب ہو کر بولتا رہا حتیٰ کہ عمر نے کروٹ لی۔

تھوڑی دیر عمر چھت پر نظریں جما کر دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے گہرے سائے ناچ رہے تھے۔ ''میں سوتا رہا۔'' اس نے جواب دیا ''اور خواب دیکھتا رہا۔''

’’کیا واقعی وہ سب کچھ خواب تھا جو تم نے دیکھا؟‘‘

’’نہیں۔سب کچھ خواب نہیں تھا۔مگر ہاں تھوڑا سا۔‘‘

’’تو پھر تم کہاں تھے؟‘‘حسن نے سینکڑوں بار یہ سوال اس سے قبل ان تمام افراد سے کیا تھا جو اس قسم کی نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔اور بڑے اعتماد کے ساتھ ایک ہی جواب اسے ملا تھا۔’’جنت میں‘‘ سینکڑوں افراد ایک زبان ہو کر یہ جواب دے چکے تھے۔

’’ایک بہت ہی نادر قسم کی‘‘عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔’’مصنوعی بہشت‘‘

یہ کوشش کرتے ہوئے کہ اس کے چہرے یا لہجے سے کسی قسم کا تعجب ظاہر نہ ہونے پائے حسن نے زور دیتے ہوئے کہا۔’’مصنوعی؟‘‘

’ہاں۔چاند آسمان سے بہت نیچے تھا۔‘‘

’’اور کیا؟‘‘

عمر ذہن پر زور ڈالتے ہوئے مسکرایا۔وہ اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔’’تمہاری جنت کی حور ایک لڑکی تھی جسے میں پہلے سے جانتا تھا۔‘‘

’’ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔وہ کون لڑکی تھی؟‘‘

’’بازنطینی زوئی۔جو جھیل میں تیرتی ہوئی کشتی پر سوار تھی۔‘‘

حسن کو اس بات میں کمال حاصل تھا کہ وہ جب چاہے اپنے ارادے کا کسی طرح اظہار کیے بغیر اپنا لائحہ عمل بدل دے۔اس کے جاسوسوں نے اسے یقین دلایا تھا......جن کا انتخاب وہ بہت دیکھ بھال کر کرتا تھا......کہ عمر کو محض جذباتی بنا کر

رام کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً شاہد و شراب کے ذریعے۔ حسن نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیا۔

''مجھے یقین ہے۔'' اس نے اپنے لہجے میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ تم نے میری جنت کی شراب کو خوش ذائقہ پایا ہوگا؟''

''جی ہاں! بہت اچھی تھی۔''

مجھے افسوس ہے کہ چاند سے ایک منجم مطمئن نہیں ہوسکا۔ بدقسمتی سے دن کی روشنی اس نظر بندی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن میرے فدائیوں نے کبھی اس سلسلے میں شبہ ظاہر نہیں کیا۔ ایک دفعہ جنت کی سیر کرنے کے بعد ان کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ ایک بار پھر وہ وہاں واپس جاسکیں۔ ظاہر ہے وہ سب کے سب نوجوان ہیں۔ لاحقوں کی بھی دلی تمنا یہی ہوتی ہے۔ جہاں تک رفیقوں کا تعلق ہے۔ جن میں سے چند تمہیں رے میں مل چکے ہیں۔ میں اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ اس جنت کے آسمانی ہونے کے تو قائل نہیں ہیں لیکن بہرکیف لطف اندوز وہ بھی ہوتے ہیں۔''

''رکن الدین اور اس کے ساتھی دوسرے داعیوں کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیا وہ بھی کبھی کبھی جنت کی سیر کرتے ہیں؟''

''کبھی نہیں وہ سب میرے علمی مشیر ہیں۔ ان کا دائرہ عمل کتب خانے اور معمل تک محدود ہے۔ ان کی اپنی دلچسپیاں ہیں تمہیں اب اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میرے ملازم مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔''

''تم نے صرف چار طبقوں کے نام لیے ہیں۔''

''پانچواں طبقہ عام آدمیوں کا ہے...... مثلاً اقرونوس کی طرح کے تاجر جو باہر کی دنیا میں تجارتی معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ تاجر ہونے کی حیثیت سے وہ میرے بدولت خاصا نفع کماتے ہیں۔ لیکن وہ آج تک باب العلم میں داخل نہیں ہو سکے۔

عمر کو اقرونوس کا خیال آیا جو صرف ایک مرتبہ قلعہ الموت کے دروازے تک ہی آیا تھا۔

''تم بہت سے ناموں سے مشہور ہو۔ حسن بن صباح۔''

''یہ صحیح ہے۔ عوام اور فدائیوں کے لیے میں حقیقتاً زندگی اور موت کا آقا ہوں۔ اگر تمہیں شک ہے تو میں ابھی اس کا ثبوت پیش کر دوں گا۔ وہ مجھے شیخ الجبال کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے قلعے پہاڑوں پر واقع ہیں۔ مثلاً الموت جو ایک قلہ کوہ پر بنا ہوا ہے۔ کثیر التعداد افراد کے حملے کی صورت میں مٹھی بھر آدمی اس قسم کے مقامات کے حفاظت بخوبی کر سکتے ہیں۔''

''اور رفیق۔ ان کیا رائے ہے؟''

''یہ لوگ نئے مذہب کے کٹر پیرو ہیں۔ وہ مجھے مہدی کا قاصد اور نمائندہ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ تم نے بیت المقدس میں دیکھا تھا۔''

''لیکن اب میری اور تمہاری کسی قسم کی شناسائی نہیں ہے'' عمر اٹھ کر کھلی ہوی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ''متہارے پیروؤں کے باقی دو طبقوں کا کیا عقیدہ

ہے؟“

”باقی دوسرے دو کون سے“ ”میں پانچوں کے پانچوں طبقوں کا حال تمہیں بتا چکا ہوں۔

”پانچ۔ لیکن سب کے سب کے حال نہیں بتایا۔ عمر نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سب ملا کر سات ہوتے ہیں۔“

حسن کی سیاہ آنکھوں میں خوش طبعی کی لہر دوڑ گئی۔ معاف کرنا۔ میں اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ تم ریاضی داں ہو۔ ذرا مجھے بھی سمجھا دو کہ تم نے سات کا تعین کیوں کیا ہے؟“

”کیا تم سعیتہ نہیں کہلاتے۔ تمہارے مبلغ ناواقف عوام سے دریافت کرتے ہیں کہ ہفتے میں سات دن کیوں ہیں۔ یا پھر آسمان پر چاند، سورج سمیت سات سیارے کیوں ہیں؟ میں ایک درہم کی شرط لگتا ہوں کہ تمہارے معتقدوں کے بھر ضرور سات حصے ہیں۔“

عمر کی اس تنقید پر حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بہت خوب“ ”تمہاری مثال اس تپے ہوئے لوہے کی ہے جو لوہے کو کاٹتا ہے۔ اقرونوس اکثر قسم کھا کر کہا کرتا ہے۔“ عمر دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ میں کہتا ہوں: دنیا میں نام پیدا کرنا کیا بڑی بات ہے۔ تم اس سے بھی اعلیٰ چیز کے اہل ہو...... الموت کے اور کون سے پوشیدہ راز تم نے دریافت کیے ہیں؟“

عمر نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ حسن سے مصالحانہ انداز میں گفتگو کرنا بہتر

ہو گا یا معاندانہ طرز عمل پر۔ الموت ایسا مقام نہ تھا جہاں کسی قسم کی کمزوری کا اظہار کیا جاتا۔

''مکتوب الیہ تک خط پہنچنے سے پہلے اس کا مضمون اڑا لینے کا راز'' عمر نے طنزاً کہا۔

''کون خبیث کہتا ہے کہ میں اس طرح کی دھوکے بازی کرتا ہوں۔ یہ کیا افترا پردازی ہے۔'' حسن کی آنکھوں سے بدگمانی اور شبہ جھلک رہا تھا۔

''کہتا تو کوئی بھی نہیں۔ رے کے راستے میں ایک باز کے ذریعے مجھے یہ راز معلوم ہوا تھا۔'' عمر نے اپنی پیٹی سے چاندی کی ایک نلکی ٹٹول کر نکالی جس میں کاغذ کا ایک پرزا بند تھا۔ اس پر تحریر تھا: عمر رے جانے والی سڑک پر سفر کر رہا ہے۔''

حسن نے جلدی سے وہ عبارت پڑھی اور چھوٹی سی نلکی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بہت حیران تھا۔ غصے کے آثار اس کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے۔ ''خدا کی قسم! بڑی عجیب سی بات ہے کہ نامہ بر کبوتر کو ایک باز ہوا میں دبوچ لے۔ حسن اتفاق ہے..........اور پھر تم خود بھی تقدیر کے سکندر ہو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ صحیح ہے کہ میں کبھی کبھی نامہ بر کبوتروں سے بھی کام لیتا ہوں۔ وہ یہاں قلعہ الموت میں میرے پاس دنیا کے ہر کونے سے خبریں لاتے ہیں۔ لیکن اس بات کا عمل داعیوں کو بھی نہیں ہے۔ کبوتر قریب کے ایک گاؤں سے آتے جاتے ہیں۔ اس قلعے سے براہ راست ان کا کوئی تعلق نہیں ہے..........

میرے خیال میں تمہاری تشفی کے لیے یہ تفصیل کافی ہے: کیا ہی اچھا ہو اگر ہم

مخالفت کی شمشیر کے قبضے سے ہاتھ اٹھالیں اور اختلاف کے اس پردے کو چاک کر دیں جو ہمارے مابین حائل ہے۔"

عمر کی جانب کھسکتے ہوئے حسن نے اپنا بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔ "تم یہ سوچ رہے ہو........ حسن کیا ہے؟ اچھا سنو! حسن ایک بدنصیب شخص ہے۔ کبھی اس کارگاہ حیات کا طالب علم تھا۔ ایسی دنیا میں علم وفراست کا حصول محض بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جہاں سلاطین اور ان کے وزراء انسان کی روح اور جسم دونوں پر حکمراں ہوں۔ قاہرہ کے مسلح محافظوں کے کوڑوں کے خوف سے میں مدتوں ایک آوارہ کتے کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ میں شرم اور بدنامی کا مزا چکھ چکا ہوں۔ میں نے طنز کے تیز نشتروں کی تڑپا دینے والی خلش بھی برداشت کی ہے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں سن بلوغ کو پہنچ رہا تھا لیکن قاہرہ میں رہ کر میں نے اسماعیلی علما سے علم حاصل کیا........ اسماعیلی جنہیں تم شیعہ کہہ سکتے ہو میں نے سمندر پار گلیلی کے زیریں ساحل پر طبریہ میں مقیم بوڑھے علماء کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ میں نے بہت کچھ بتا دیا........ میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں حسن۔ اور جب تھکی ہوئی زمین پر ستاروں کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اس وقت تم نے بھی اسرار قدرت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔"

حسن نے اپنی گردن جھکالی۔ "علم وفراست کے خوشنما پھل کا تلخ ذائقہ میرے کام ودہن نے اچھی طرح چکھ لیا ہے۔ خدا کا کہیں وجود نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب ایک بوڑھی ہوتی ہوئی عورت کے مانند ہیں۔ ان کا حسن اور افادیت زائل ہو چکے

ہیں۔ ان کا وجود سکڑ کر تو ہم پرستی کی خشک ہڈیوں کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے، جب تمام مذاہب کا وجود ختم ہو جائے گا اور صرف چند سوکھی ہوئی کھالیں ہڈیاں باقی رہ جائیں گی جنہیں پرانے قیمتی پتھروں کی طرح آثار قدیمہ کے شیدائی خانقاہوں میں حفاظت سے رکھ لیں گے۔ آخر مکہ کا حجر اسود کیا ہے؟ ایک عجیب قسم کا پتھر جوف والا وہ سے ماتا جاتا ہے۔ اگر میری آواز ساری دنیا کے سننے والوں کا کانوں تک پہنچ سکے تو میں پکار پکار کر یہ پیغام پہنچاؤں گا کہ تمام مذہبی قربان گاہوں اور شاہی مسندوں کو اکھاڑ کر پھینک دو۔ وہ تمام افراد جو شاہی مسندوں پر براجمان اور مذہبی قربان گاہوں پر قابض ہیں ان کی حیثیت عام انسانوں سے مختلف نہیں ہے۔ وہ جھوٹ اور فریب کی آڑ لے کر اپنے مفاد کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج کے مسلمان جو خدا کی عبادت کرتے ہیں ان کافروں سے زیادہ عقلمند نہیں ہیں جو عہد عتیق میں سورج کی پرستش کیا کرتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''میں جانتا ہوں'' عمر نے حسن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک شاہ بھی ایک عام انسان ہے۔ لیکن بفرض محال اگر تم اسے تخت سے اتار دو تو اس کی جگہ کسے بٹھاؤ گے؟''

''پہلا کام تو یہ ہوگا کہ موجودہ طرز حکومت اور غلامی کا استیصال کیا جائے۔ چار ملک شاہ مل کر بھی تمہاری عقل کو نہیں پہنچتے۔ ہم آخر کیوں بادشاہ پرستی کو جاری رہنے دیں؟ انسان جہالت کے اندھیرے سے نکل کر عقلیت کی روشنی کی طرف بڑھ رہا

ہے۔ ایک وقت آئے گا جب وہ عقلیت کی تکمیل کرے گا...... لہذا میں غیر مطمئن روحوں کو نئی راہیں دکھاتا ہوں۔ انہیں ایک دوسرے کا رفیق بناتا ہوں۔ ہم چوری چھپے نئے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں۔"

چند لمحے تک حسن خاموش رہا۔ تم نے کتب خانے کی سیر کی ہے۔ تم نے داعیوں سے بھی گفتگو کی ہے۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم ہر شئے کی کہنہ کا مکمل علم حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور تم یہ بھی اچھی طرح سمجھتے ہو......... جھٹلانے کی کوشش نہ کرنا...... کہ بیشتر ایرانی سوائے قرآن کے اور کسی چیز پر ایمان لانے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمیں عوام کے طبقے سے نئے عقیدے کو ماننے والے چاہئیں۔ کیونکہ چند مفکروں کے بنائے کچھ نہیں بن سکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ قید خانوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں یا زندہ جلا دیئے جائیں۔ چنانچہ عوام میں ہم مہدی کے ظہور کے تبلیغ کرتے ہیں جو ایرانیوں کا قدیم عقیدہ ہے۔ سمجھدار اور ذہین افراد کو علمی فتوحات کے نام پر اپنا ہمنوا بناتے ہیں۔"

حسن نے اپنے شانوں کو اس انداز سے جنبش دی جیسے کوئی فیصلہ کن بات کہنے والا ہے۔ "کیا زندگی اسی ایک نہج پر گزرتی رہے گی؟ نظام الملک اپنے کمرے میں بیٹھ کر تم سے جو باتیں کرتا ہے کیا وہ ساری باتیں ملاؤں کو بھی بتا دیتا ہے؟"

"نہیں" عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ اس سلسلے میں بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے۔"

"افلاطون نے اس نظریئے کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ دنیا کا ہر کام اسی

طریقے پر چلتا ہے۔ روشنی کے ساتھ اندھیرے کا وجود نا گزیر ہے۔ صنف قوی کے پہلو میں صنف نازک کی موجودگی ضروری ہے۔ دونوں مل کر ہی ایک مقصد کو پورا کرتے ہیں......... ہر طبقے میں ہمارے عقیدے کو ماننے والے موجود ہیں۔''

''پھر بھی تم نے جادو سے کام لیا ہے۔''

''کیوں نہیں۔ جادو، سحر فراست کی آخر حد ہے۔''

''شاید عوام کی نظر میں۔ تمہارے نامہ بر کبوتر اور تربیت یافتہ باز عام لوگوں کو معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔''

''اور سمجھدار طبقے کے لیے جنہیں ہم ''عارف'' کہتے ہیں اور اس سے بلند تر ایک اور جادو ہے۔ بعض فنون میں نے مصر میں حاصل کیے تھے.........''حسین باتیں کرتے کرتے یکا یک خاموش ہو گیا.........کون سے فن کی مدد سے پندرہ سال پہیل تم نے شہزادے سے۔ جواب ملک شاہ ہے.........اس کے باپ اور رومی شہنشاہ کی موت کی پیشین گوئی کی تھی؟''

عمر جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کے ضمیر نے اسے روک دیا۔ ''وہ معجزہ'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''میرا ایک راز ہے۔''

''مجھے بھی اس راز میں شریک کرو۔ آخر میں نے بھی تو اپنے تمام راز تم پر ظاہر کر دیئے ہیں۔''

''سوائے ایک کے۔''

حسن نے عمر خیال کو بڑے غور سے دیکھا ''اور وہ کون سا راز ہے۔''

''یعنی تمہارے مذہب کے دو سب سے بلند طبقوں کا عقید کیا ہے؟ میرا مطلب ان لوگوں سے ہے جو داعیوں سے اونچے درجے کے ہیں اور مصر میں مقیم ہیں۔''

''واللہ۔ مصر میں ان کی موجودگی کے متعلق میں نے تو کسی وقت بھی تذکرہ نہیں کیا۔''

''بیشک تم نے نہیں بتایا'' عمر نے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ میرا اپنا قیاس تھا کہ انہیں وہاں ہونا چاہیے۔''

''یہ تمہارا اپنا قیاس تھا۔'' حسن کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''اگر یہ تمہارا محض قیاس ہے تو اس بات کو تم کیونکر ثابت کرو گے؟ خواجہ عمر! جب ہم بابل کے کنڈروں میں ملے تھے تو تم مجھے بے حد پسند آئے تھے۔ بیت المقدس میں ملاقات کے بعد میرے دل میں تمہیں دوست بنانے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس بات کو برسوں گزر گئے۔ میں نے اس کے بعد بہت کچھ حاصل کر لیا لیکن تم! سلطان کے دربار میں تمہاری حیثیت ویسی کی ویسی ہی ہے۔ نہیں بلکہ آج تم نظام الملک کی سرپرستی سے بھی محروم ہو چکے ہو۔ اس بڈھے نظام الملک کے ساتھ جو ایک کنتھے دار لڑاکا مرغی کی طرح بدمزاج ہے اب تمہارا نبھا اتنا آسان نہیں جتنا پہلے تھا۔''

'غور کرو'' اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگوں نے تمہارے لیے کیا کچھ کائی ہے۔ میں نے اقرونوس کو حکم دیا تھا کہ وہ تماری دولت و امارت میں اضافہ کرے۔ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔ دریائے فرات کے کنارے ریگستان میں اس نے تمہیں موت کے منہ سے بچایا۔ اس نے

تمہارے محلات کو سامان عیش و نشاط سے بھر دیا ہے۔ وہ اور میں دونوں عرصہ دروازے سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ تم مجھ سے آملو۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میں تمہاری نئی زیچ۔ تمہاری تصانیف۔ نیشاپور میں تمہاری رصد گاہ۔ میں ہر کامیابی کو تعریف کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ کیا اسلام کے سربرآوردہ زعما تمہیں اسی زاویے سے دیکھتے ہیں؟ کیا ملک شاہ میں تمہاری ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت ہے؟ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ سلطان کسی وقت بھی تم سے ناراض ہو کر تمہیں دربار سے نکلوا سکتا ہے۔ لیکن میرے لیے تمہارا وجود ناگزیر ہوگا جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔ میری اس گزارش پر غور کرو۔ آؤ! میں تمہیں قلعہ الموت کے استحکام اور مضبوطی کا مشاہدہ کراتا ہوں۔ کیوں کیا خیال ہے؟...........'' حسن مسکرایا........... ''اب تک تم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ میرے پیروؤں کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب تم خود میری آنکھوں سے دیکھو۔''

عمر کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت آرام کی تھی۔ اس کے سر میں عجیب قسم کا درد محسوس ہو رہا تھا۔ اور سورج کی روشنی اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی نیچے کبھی اوپر ناچتی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے حسن کی ذہانت کا ساتھ دینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ لیکن حسن اسے زیادہ سوچنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر پہاڑ کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا۔

سنگ سفید کی بنی ہوئی غلام گردش سے گزر کر حسن نے عمر کو ایسے غار میں لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں کچھ لوگ تو بھٹیوں میں دھاتوں کو گلا کر صاف کر رہے تھے۔ اور

کچھ ایسی گلخنوں پر کام کر رہے تھے جن میں پگھلا ہوا شیشہ ابل رہا تھا۔

یہ لوگ اس راز کو مصر سے لائے ہیں۔ حسن نے عمر کو بتایا۔ ''آخر شیشے کی مصنوعات اس قدر نایاب کیوں ہوں کہ صرف سلاطین کے محلوں ہی میں نظر آئیں۔ میرے گماشتے شیشے کی بنی ہوئی چیزیں اب ان بازاروں میں کھلے عام فروخت کرتے ہیں جہاں پہلے صرف مٹی کے ظروف اور چینی کے برتن بکا کرتے تھے۔

کارخانے سے نیچے اتر کر وہ توشہ خانے میں پہنچ گئے جو شراب کی صراحیوں، گیہوں کی بوریوں اور شہد کے مٹکوں سے بھرا ہوا تھا۔ روشنی دکھانے کے لیے اس نے ایک مشعل بردار غلام کو بلایا اور ایک ایسے کمرے میں پہنچا، جس میں چاول کی بوریاں چھت سے لگی تھیں۔

''محاصرے کی صورت میں'' اس نے عمر کو بتایا۔ ''قلعے کے باشندے دو سال تک انہیں آرام سے کھا سکتے ہیں۔''

پھر وہ سب سے نیچے کمروں میں پہنچے وہاں لکڑی کے بنے ہوئے بے شمار پیپے ایک غار کے تاریک دہانے کے قریب چنے ہوئے تھے۔

''کان لگا کر سنو!'' حسن نے عمر سے کہا۔

پہاڑ کے اس شگاف سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے پانی کسی تالاب میں گر رہا ہو۔

''جب کرۂ ارض کو وجود میں آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا۔'' حسن نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ آبریز ذرا بلند سطح پر ایک چھوٹا سا دریا ہوگا۔ غالباً چونی چونے کے پتھر کو آہستہ آہستہ کاٹتا رہا اور نتیجے میں وہ تمام سرنگیں اور غار پیدا ہو

گئے جو تم نے ابھی دیکھے ہیں۔ صدیاں گزریں کہ انسان نے بالائی غاروں کو دریافت کرلیا اور انہیں با قاعدہ تراش کر وہ ہموار راستے سیڑھیاں بنالیں جن سے گزر کر ہم ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ان پہاڑوں کے قلب میں ایک عبادت گاہ تعمیر کرلی..........ہم نے ان کی قربان گاہ کا بھی پتا چلا گیا ہے۔ اور وہ میں تمہیں دکھاتا ہوں!"

عمر نے اندازہ لگایا کہ قلعہ الموت کی عمارت جو قلعہ کوہ پر واقع ہے زیادہ سے زیادہ ایک بڑے قلعے کی برابر ہوگی۔ لیکن پہاڑ کی گہرائیوں میں مضبوط اور پیچ بھول بھلیاں بنی ہوئی ہیں۔ اگر لوگ نسلاً بعد نسلاً باہر کی جانب قلعے کے پاس سے گزرتے رہیں تو بھی وہ قلعے کے ان رازوں سے کبھی واقف نہ ہوسکیں گے جو اس کے سنگین غاروں کے سینے میں چھپے ہوئے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات جو اس سلسلے میں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ان زیر زمین بھول بھلیوں میں ہزاروں انسان دنیا والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ابدالاباد تک زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

ایک حبشی پہرے دار کے قریب سے گزرتے ہوئے جو اسے دیکھ کر سجدے میں گر پڑا تھا۔ حسن نے ایک تنگ سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر ایک دروازہ کھولا عمر نے خود کو اس پر دار درندے والے غار میں پایا جہاں وہ ایک دفعہ پہلے آ چکا تھا۔

اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ موسیقی کی دھیمی آواز آ رہی تھی اور نہ فدائیوں کے مجمع کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ البتہ زرد رنگ کے شعلے اس قدرتی شہ نشین کے سامنے جہاں درندے کے پنجوں کے درمیان عمر نے فدائیوں کو رقص کرتے

دیکھا تھا پتھر کے جوف سے نکل نکل کر بدستور بلند ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی درندے کے بت کا باریش چہرہ صاف نظر آ جاتا تھا۔ جب شعلے ذرا دھیمے پڑ جاتے تو سارا غار اندھیرے کی تہوں میں لپٹ کر معدوم سا ہو جاتا تھا۔ اس دفعہ عمر کو احساس ہوا کہ ہوا میں گرمی اور تیل کی بو فضا میں بسی ہوئی ہے۔ دو راتیں قبل جب وہ وہاں گیا تھا تو اسے یہ بات محسوس نہ ہوئی تھی۔

حسن بھی اس وقت خاموش تھا اور غالباً اس کبھی نہ بجھنے والی آگ کے متعلق سوچ رہا تھا۔

''اس راز کا کسی کو علم نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''نشیب میں کسی جگہ اس قسم کے تیل کا ذخیرہ ہے جسے یونانی اپنے چراغوں میں جلاتے تھے۔ لیکن یہ ایک معما ہے کہ آگ یہاں پہلی مرتبہ کس طرح پہنچی اور کب سے مسلسل روشن ہے؟ مجھے یقین ہے: یہ اس زمانے سے بھی پرانی ہے، جب مصر میں ''را'' دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ عہد زرتشت سے بھی قدیم ہے۔ غالباً آفتاب پرستوں نے سب سے پہلے اس آگ کو الوہیت کا مظہر سمجھ کر پوجنا شروع کیا ہوگا کیونکہ انہیں یہ فوق الفطرت محسوس ہوئی ہوگی۔ انہوں نے اس آگ کو ایک قسم کا سحر تصور کیا ہوگا .... وہ لوگ خود بھی تو بڑے جادوگر تھے۔''

''لیکن یہ پروالا سانڈ ان کا بنایا ہوا نہیں ہو سکتا۔''

''نہیں یہ قدیم ایرانیوں کی تخلیق ہے جو آگ کی پرستش کرتے تھے میں نے اس قسم کے بت زرزلیس کے محل کے کھنڈروں میں بھی دیکھے ہیں جو اصفہان کے جنوب

میں واقع ہیں۔ ایرانی اسے محض ایک متبرک مقام خیال کرتے تھے کیونکہ یہ ایک قدیم عبادت گاہ تھی۔ اور انہوں نے اس متبرک آگ کی خوشنودی اور اعزاز میں درندے کا یہ بت تعمیر کیا ہوگا۔ اب میں یہاں اپنے فدائیوں کی روحانی اصلاح کے لیے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسلامی رسوم ادا کرتا ہوں۔''

حسن پر جو ایک متفکرانہ کیفیت طاری تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہوگئی اور کلبیت نے پھر اس پر غلبہ پالیا۔ اس کے الفاظ میں نشتریت ابھر آئی۔

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔'' اس نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔ ''آخر مسلمانوں نے بھی تو بیت المقدس میں ایک چٹان تراش کر ایک محراب بنائی تھی جس کی رومی پادری اس لیے تعظیم کرتے تھے کہ وہاں ایک یہودی بادشاہ داؤد نے خواب دیکھا تھا۔ اور وہ چٹان داؤد سے پہلے کیا تھی۔ شاید کوئی باؤلی ہو۔ یا پھر کافروں کا کوئی بت ہوگی۔''

دو منٹ کے بعد حسن پھر ایک مختلف شخص نظر آنے لگا۔ غار سے نکل کر وہ ایک تاریک راستے کی طرف مڑا۔ گرم ہوا کے ایک جھونکے نے انہیں آگے دھکیل دیا ....اب عمر کی سمجھ میں آگیا کہ آگ مسلسل کیوں روشن رہتی تھی اور غار میں سانس لینے کے لیے تازہ ہوا کس طرف سے آتی تھی ....وہ یکے بعد دیگرے پر پیچ راستوں سے گزرتے رہے حتیٰ کہ اندھیرا دھندلی روشنی میں تبدیل ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سر کے اوپر نیلے آسمان کا ایک ٹکڑا نظر آنے لگا۔ اور ایک تنگ شگاف کی پتھریلی دیواریں ان کے دونوں جانب نمودار ہوگئیں۔ ٹوٹی پھوٹی چٹانوں

پر چڑھتے اترتے جب وہ شگاف کے آخری سرے پر پہنچے تو غروب ہوتے ہوئے سورج کی تیز روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ حسن وہاں پہنچ کر رک گیا اور اپنے دونوں بازو اوپر اٹھا دیے۔

''اے میرے جاں نثارو! بہشت کی نعمتیں تمہیں نصیب ہوں اور اللہ تمہارے بازوؤں کو اور قوت عطا کرے۔!''

وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا تھا جہاں دست قدرت نے ایک گول سی تماشا گاہ بنا رکھی تھی۔ اس کی پشت پر کوہستانی درے کی دیواریں تھیں جنہوں نے بلندی پر ایک اونچی ڈھلوان چٹان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ قلعہ الموت کی بنیاد تھی۔ اس بلند چٹان کو تراش کر قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ سیڑھیوں والی بیضوی شکل کی پہاڑی دراصل ایک مسطح فراز تھا، جو پہاڑ کی ڈھلان کے وسط میں واقع تھا۔ چاروں طرف سے سفید پوش افراد مٹی کے بنے ہوئے حجروں سے نکل کر وہاں جمع ہو گئے اور حسن کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ عمر نے ان میں سے سینکڑوں فدائیوں کو پہچان لیا جنہوں نے اس کے ساتھ غار میں تلواروں کا رقص دیکھا تھا۔ پہاڑ کا یہ قطعہ ان کی سکونت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ عمر سوچنے لگا کہ یہاں سے وادی میں اترنے کے لیے کوئی راستہ ضرور ہونا چاہیے۔

''ہمارے آقا پر سلامتی ہو..........!'' وہ ایک زبان ہو کر چلائے۔

حسن کی آواز ہنوز پہاڑیوں میں گونج رہی تھی اور وہ اس شان سے وہاں کھڑا تھا جیسے ایک پیغمبر ہو اور اپنے منتخب جاں نثاروں کو ایک موعودہ سر زمین کی طرف لے

جانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہرا اور عمر کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا اسی درۂ کوہ میں واپس آ گیا جہاں سے وہ اس مقام پر پہنچا تھا۔

اپنے قلعے کے زیریں حصے کو پیچھے چھوڑتا ہوا، وہ تیزی سے بلندی کی جانب بڑھتا رہا اور اس کی چوٹی پر جا پہنچا۔ سورج پھر نظر آنے لگا۔ جب وہ ایک وسیع دمدمے پر پہنچے تو ہوا کے تیز جھونکوں سے ان کے قدم ڈگمگائے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ تین نوجوان فدائی جو وہاں پہرا دے رہے تھے اپنے ہتھیار الگ رکھ کر تمام پڑھنے میں مشغول تھے۔

تم نے آج سے پہلے کبھی کوئی معجزہ رونما ہوتے دیکھا ہے؟" حسن نے عمر کے کان میں کہا۔ "لو دیکھو..........."

ان نوجوانوں پر جھک کر اس نے اپنا ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اپنے آقا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہیں حسن کی آنکھوں پر جم گئیں۔

پھر اس کی آواز گونجی۔

"دیکھو۔ تمہارا وقت آ گیا ہے۔ جنت تمہارے انتظار میں ہے۔ میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ کود جاؤ۔"

آخری الفاظ سن کر جیسے ان پر بجلی گر پڑی۔ تین چھریرے جسم کپکپائے۔ اور تیزی سے جست لگا کر دمدمے کی دیوار پر چڑھ گئے۔ عمر نے دیکھا کہ ایک شخص کا چہرہ اشتیاق سے چمک اٹھا۔ اور دوسرا خوف کی شدت سے بھیانک ہو گیا۔

دو فدائی۔ دمدمے کی دیوار سے اک دم غائب ہو گئے۔ تیسرا آنکھیں بند کر کے آگے پیچھے جھولنے لگا۔

''تو بھی کود جا'' حسن نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے تنبیہہ کی۔

تیسرے پہرے دار نے بھی بالآخر خلا میں اس طرح چھلانگ لگائی۔ جیسے مجبوراً گر پڑا ہو۔ دمدمے کی دیوار پکڑ کر عمر نے نیچے جھانکا۔ وہ پہلے دو کے پیچھے تیزی سے لڑھکتا ہوا جا رہا تھا............ سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی تین گیندیں جیسے ڈھلوان چٹان پر گد اکھا کر اچھلیں سینکڑوں فٹ نیچے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئیں۔

''تم نے دیکھا'' حسن نے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی تھی۔ ''میرے حکم کی تعمیل کس طرح کی جاتی ہے۔ کیا ملک شاہ کے احکام پر بھی اسی طرح عمل درآمد ہوتا ہے۔''

''میری نگاہوں کے سامنے تین جانیں مفت ضائع ہو گئیں۔''

''مفت نہیں۔ ثبوت کے طور پر............ تین جانوں کی حقیقت ہی کیا ہے؟ یہ سورج جو اس وقت غروب ہو رہا ہے۔ اس کے طلوع ہونے سے قبل ہزاروں انسان حشرات الارض کی طرح رینگتے ہوئے گوشہ گمنامی میں روپوش ہو جائیں گے اور ایسے ہی دوسرے ہزاروں کیڑے غلاظت کے اس ڈھیر سے جسم تم دنیا کہتے ہو۔ ابل کر اوپر آجائیں گے۔''

حسن نے ٹھوکر مار کر قریب پڑے ہوئے بے کار نیزوں کو دمدمے کی دیوار سے ملا دیا۔ ''تم نے ابھی میری طاقت اور اقتدار کی ایک جھلک، صرف ایک ہلکی سی

جھلک دیکھی ہے۔ کیا تم میرے یار وفادار بن کر داعیوں کے زمرے میں شامل ہونا پسند کرو گے؟ تمہارا کام فلکیات اور ریاضی کی تحقیقات ہو گا۔ جیسا کہ اب ہے۔"

"یہاں۔ قلعہ الموت میں؟"

"نہیں۔ دنیا کے کسی حصے میں بھی۔ جہاں تم رہنا پسند کرو۔ تمہارے لیے ہر وہ چیز مہیا کی جائے گی جس کی تمہیں خواہش ہو گی ...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں .... اور وعدہ کر کے میں کبھی نہیں مکرتا .... وہ دولت و اعزاز جو تمہیں آج میسر ہے اس کے مقابلے میں بے حد حقیر ہے جو میری جانب سے پیش کیا جائے گا۔"

عمر نے جھک کر تاریک ہوتی ہوئی وادی پر نظر ڈالی۔ "اور اگر میں تمہاری تجویز قبول نہ کروں؟"

"تو میں تمہیں فی الحال نیشاپور واپس نہ جانے دوں گا۔ جب تک چند واقعات رونما نہ ہو جائیں تم یہاں اسی طرح آرام سے مقیم رہو گے۔ اس کے بعد اگر تمہارا جی چاہے گا تو تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت ہو گی۔"

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد عمر نے جواب دیا۔ "میں نے ایک ہفتے کے بعد سوچ کر جواب دوں گا۔"

"بہتر" حسن نے اطمینان محسوس کیا۔ "ایک ہفتے بعد میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ اس دوران میں اس چار دیواری کے اندر میرے جتنے غلام موجود ہیں وہ ہمہ وقت تمہاری خدمت کے لیے حاضر رہیں گے۔"

اپنی آرام گاہ میں پہنچ کر عمر نے اطمینان کا سانس لیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تنہائی کی لذت کا احساس ہوا۔ حیرت میں ڈالنے والی بہت سی باتیں اسے معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ حسن کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا اور بڑے تعجب سے یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سے ذرائع ہیں جنھیں کام میں لا کر اس نئے روحانی سلسلے کے رہنما نے دولت جمع کی ہے۔ حسن نے کچھ تجارتی کاروبار کا ذکر کیا تھا۔ اور یہ واقعہ تھا کہ افروئوس ایک خارش زدہ دم توڑتے ہوئے اونٹ کو بھی کثیر منافع پر فروخت کر سکتا تھا۔ لیکن حسن کی دولت مندی کا کوئی اور راز ہونا چاہیے جو اس نے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

امام غزالیؒ کا ایک مقولہ اس کے ذہن میں آیا۔ ''خود پرستی کے مقابلے میں ہر چیز کی پرستش بہتر ہے۔''

اگر انسان کی حیثیت درحقیقت ذہین جانوروں سے زیادہ کچھ نہیں ہے تو ان حالات میں حسن کا نیا روحانی سلسلہ منطقی طور پر سب سے بہتر ہے............ لامحدود صلاحیتوں کا حامل ایک رہنما یک و تنہا لاتعداد متوازن دماغوں کے تفکر کی سمت متعین کرتا ہے۔

''بہر حال'' عمر نے سوچا ''افلاطون کی ریاست بھی احمقوں کی بستی ہی ہوتی جہاں مدرسوں کے بے شمار استاد انبساط کے فلسفے پر بحث مباحثہ کیا کرتے۔''

الموت میں قیام کرنا کچھ ایسا برا بھی نہ ہوگا جہاں زوئی جیسی زینت پہلو موجود ...... دوسرے خود یہ جگہ بڑی حد تک ایک ایسی رصدگاہ کے مانند ہے جہاں سے

ساری دنیا نظر آتی ہے۔ یہاں اسے نظام الملک یا غزالی یا خود اپنے ضمیر سے الجھنا بھی نہ پڑے گا۔ بڑے سکون سے زندگی گزرے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے بہ شدت محسوس کیا کہ اس کا ضمیر حسن جیسے شخص کے دامن دولت سے وابستہ ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

اگر وہ حسن کی ملازمت اختیار کر لے تو اپنے ذاتی تحقیقی کاموں کی تکمیل نہ کر سکے گا۔ اس نے چند ہی روز ہوئے کہ اپنے اس نظریے کی عملی تحقیق کا آغاز کیا تھا کہ کرۂ ارض خلا میں گردش کرتا رہتا ہے اور فضائے بسیط میں ساکن نہیں ہے۔

''میں سمجھتا ہوں حسن کسی قیمت پر مجھے یہاں سے نہ جانے دے گا۔ عمر کو یہ خیال کر کے بڑا لطف آیا۔ نہیں! نہیں!۔

قلعہ الموت کا چپہ چپہ دکھانے کے بعد وہ میرا یہاں سے جانا کسی طرح بھی گوارا نہ کرے گا۔ مجھے اب یہاں ایک قیدی کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔ یہ تقریباً طے ہے ......لہذا ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی مجھے کسی نہ کسی ترکیب سے فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا............لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے حسین زونی یاد آ گئی اور اس کی جدائی کے خیال سے وہ کچھ افسردہ سا ہو گیا۔

عمر کو اس نامعلوم عرق کا خیال برابر پریشان کر رہا تھا جس کے پینے سے اس کے حواس کچھ عجب طرح منتشر ہو جاتے تھے۔ اور ایک نیم خوابی کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی تھی۔ شراب سے یہ اثر پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ وہ شراب کے اثرات سے

خوب واقف تھا۔ وہ شے جس کے پینے سے اس کا دماغ تپنے لگتا تھا شراب سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ انگیٹھی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں اور شراب کے پیالے سے ایک ہی طرح کی بو آتی تھی۔ وہ اس پریشان کن عرق سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ کیونکہ حاضر دماغی کی اسے شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ (2)

عمر کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ نوعمر حبشی غلام پر خفگی کا اظہار کر کے اپنی آرام گاہ میں انگیٹھی روشن کرنے کی ممانعت کر دے۔ لیکن اس نے یہ خدشہ محسوس کیا کہ اگر وہ اس تیز شراب کے پینے سے انکار کر دے جو اسے پیش کی جاتی تھی یا انگیٹھی سلگانا بند کرا دے تو وہ نامعلوم شے کسی اور طرح اسے کھلائی یا پلائی جائے گی۔ چھپ کر اس کی نگرانی کرنے والوں کی اس بات کا یقین رہنا چاہیے کہ وہ بدستور مذکورہ عرق استعمال کر رہا ہے۔

لہٰذا اس نے اس بات پر احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ شراب سے بھرے ہوئے پیالے جو صبح شام اس کے لیے لائے جاتے تھے ناکافی تھے۔ اس نے حکم دیا کہ اس قیمتی شراب سے بھری ہوئی ایک بڑی صراحی ہر وقت اس کے قریب رکھی رہنی چاہیے۔ چنانچہ ایک بڑی صراحی فوراً حاضر کر دی گئی............ حسن بھی غالباً یہی چاہتا ہوگا کہ عمر اس عرق کو شراب سمجھ کر زیادہ سے زیادہ استعمال کرے............ عمر نے تجربے کے طور پر ایک پیالہ بھر کر پیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کے پیتے ہی اس پر ویسی ہی مجہولیت طاری ہونے لگی جیسے پہلی دفعہ استعمال کرنے سے ہوئی تھی۔

''اور اب آئندہ'' اس نے صراحی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہر شب وادی تجھ

سے سیراب ہوا کرے گی۔"

ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ حبشی غلام کمرے کے باہر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ عمر نے صراحی انڈیل کر ایک پیالہ بھرا اور بغیر چکھے ہوئے کھڑکی کے باہر ہاتھ بڑھا کر پھینک دیا۔ لیکن جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اسے مذکورہ مشروب کی طلب پیدا ہوئی جس کا وہ عادی ہو گیا تھا۔

قریب رکھی ہوئی صراحی سے نکل کر پھیلتی ہوئی خوشبو سے وہ بے قابو ہو گیا۔ وہ ایک دفعہ اٹھ کر صراحی تک گیا لیکن فوراً ہی اپنے بستر کی طرف پلٹ آیا۔ اس کی تشنگی بڑھنے لگی تھی اور اس کے بازوؤں میں ایک قسم کا تشنج محسوس ہو رہا تھا۔

دوسری رات کو بھی اسے حسب معمول خواہش پیدا ہوئی لیکن اس نے صراحی تک جانے کی کوشش سے احتراز کیا۔ چوتھی رات کو وہ بغیر کسی الجھن کے آرام سے سو گیا۔ البتہ کچھ دیر یہ ضرور سوچتا رہا کہ انسانی اعصاب پر اس عجیب و غریب عرق کا اثر کتنا شدید پڑتا ہے۔

اس دوران میں ستاروں کا مطالعہ کرنے کے بہانے، اس نے الموت کی فصیل کا اس مقصد سے تفصیلی جائزہ لے لیا کہ آیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے وہ اسے عبور کر کے نیچے اتر سکے۔ اس نے قصے کہانیوں میں پڑھا تھا کہ وہ بالوں کی رسیاں بنا کر یا کمبلوں میں لپٹ کر اس قسم کی دیواروں سے نیچے پھسل جاتے تھے۔ لیکن اسے اندازہ ہوا کہ عملی طور پر ایسا کرنے کے مقابلے میں اس طرح کی کہانیاں تصنیف کرنا بہت آسان تھا۔

کئی دفعہ عمر ہمت کر کے خفیہ راستوں تک پہنچنے کامیابی بھی ہوگیا لیکن نتیجتاً آگ کے دروازے پر متعین مسلح پہرے داروں نے اسے ہر دفعہ آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پہرے دار بات بالکل نہ کرتے تھے کیونکہ وہ گونگے تھے۔ اس نے اس بات کی بھی تحقیق کر لی تھی کہ قلعے میں اسلحہ کا ذخیرہ بھی کہیں موجود نہ تھا۔ جو بلند قامت حبشی اور فدائی قلعے کی فصیل کی نگرانی کرتے تھے صرف ان کے پاس ہتھیار ہوتے تھے۔ اور جب ان کی چھٹی مل جاتی تھی تو وہ اپنے ہتھیار ساتھ لے جاتے تھے۔

فدائیوں کے اقامتی علاقے تک پہنچنا بھی ممکن نہ تھا۔ رہا ان سے بات چیت کر کے تعلقات پیدا کرنے کا سوال۔ سو وہ دیکھنے ہی میں چیتوں کی طرح خونخوار تھے ان سے گفتگو کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے علاوہ تین یا ساتھ ساتھ کی ٹولیوں میں وہ مختلف مقامات پر متعین تھے۔

''اس کا مطلب یہ ہے'' اس نے سوچا۔ ''کہ خواہ میں چار دیواری کے اندر چلوں پھروں یا باہر جانا چاہوں بہر حال مجھے ان پہرے داروں کے بیچ میں سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ اور باہر جانے کے لیے کسی نہ کسی دروازے کو طے کرنا لازمی ہے۔''

صدر دروازہ رات کے وقت بند ہو جاتا تھا۔ ایک قندیل اس کے اوپر روشن کر دی جاتی تھی اور سات فدائی وہاں پہرا دیتے تھے۔ عمر نے صرف ایک مرتبہ رات کے وقت ایک شخص کے قلعے سے باہر جاتے دیکھا تھا اور وہ بھی چھوٹے بغلی دروازے سے وہ وسیع صحن کے دوسرے کنارے پر تھا۔ وہ شخص ایک دراز قد داعی

معلوم ہوتا تھا اس نے تین پہرے داروں کو جو وہاں متعین تھے، ایک تحریر دکھائی تھی تب انہوں نے اس دروازے کا قفل کھولا تھا۔

دن چھپنے کے بعد جب عمر اپنی قیام گاہ سے باہر جاتا تو غلام گردش کے نگراں اس پر نظر رکھتے تھے۔ یہ بات اس کے علم میں تھی۔ لہٰذا رات کے وقت چھپ کر بھاگنا بھی محال تھا۔

''تو پھر دن کے وقت صدر دروازے کے رستے ہی فرار ہونا چاہیے۔'' عمر نے اپنے دل میں یہ قطعی فیصلہ کرلیا۔ (بغلی دروازے میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک قفل پڑا رہتا تھا)

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد عمر نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ دن بھر ایک کھلی چھت پر بیٹھا بظاہر اونگھتا رہتا لیکن بیشتر وقت وہ دروازے کی طرف غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ اور فرار ہونے کی کوئی امید افزا صورت اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کسی غیر آدمی یا گھوڑے کو دروازے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جب دیہاتی اجناس یا دوسری اشیاء لاتے تو دروازے پر پہرا دینے والے فدائیوں کے سپرد کر دیتے، وہ سامان قلعے کے اندر پہنچانا فدائیوں کا کام تھا۔ اکثر اوقات فدائیوں کے مسلح دستے قلعے کے نشیبی تہ خانوں سے نکل کر اوپر کے صحن میں آتے دکھائی دیتے اور خاموشی سے دروازے کے باہر چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایک یا دو ایسے داعی آتے جاتے نظر آجاتے جو کسی خاص کام سے قلعہ الموت سے باہر جاتے یا باہر سے اطاعیں لے کر قلعے میں آتے تھے۔ لیکن حسن کو کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے باوجود شیخ الجبال ہر روز صدر دروازے سے گزرتا تھا لیکن کوئی شخص اسے پہچان نہ سکتا تھا۔ اگر عمر نے ہر آنے جانے والے کا غور سے جائزہ نہ لیا ہوتا تو اسے بھی اس بات کا پتا نہ چل سکتا۔

عمر نے دیکھا کہ وہی طویل القامت داعی جسے اس نے رات کے وقت بغلی دروازے سے جاتے دیکھا تھا متواتر تین روز سے دوپہر ڈھلے، سخت گرمی اور تیز دھوپ میں، صدر دروازے سے تنہا باہر جاتا تھا اور تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد واپس آ کر صحن عبور کر کے قلعے کی عمارت میں غائب ہو جاتا تھا۔ اس کی اس متواتر آمدورفت اور ایک شخص سے اس کی چال ملتی جلتی دیکھ کر عمر کی توجہ اس کی جانب کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ ایک دفعہ جب اس شخص نے دروازہ کھولنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو عمر نے فوراً پہچان لیا کہ داعی کے بھیس میں خود حسن باہر آتا جاتا ہے۔ اس دوران میں حسن ہمیشہ اپنی نگاہیں نیچی رکھتا اپنے ہاتھ عموماً آستینوں میں چھپائے رہتا۔ اور اپنے چہرے کے خدوخال چینیوں کے سے بنالیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چینی نژاد ظاہر کرنے کے لیے کندھے جھکا کر چلتا تھا۔ مزید برآں اس نے اپنے سر کے چمکتے ہوئے بال پیچھے کی طرف سمیٹ کر ان میں چینیوں کی طرح گرہ بھی لگا رکھی تھی باوجودیکہ وہ بظاہر اپنی ہیئت تبدیل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگیا تھا لیکن عمر کی نگاہوں سے وہ اپنے ہاتھ نہ چھپا سکا۔

عمر کو اس بات پر بڑا تعجب تھا کہ آخر حسن اپنے ہی قلعے کے دروازے سے بھیس بدل کر کیوں آتا ہے۔ اور وہ بھی ایک مقررہ وقت پر؟

ان سوالوں کا جواب بھی عمر کی سمجھ میں فوراً ہی آ گیا۔ رفیقوں نے اسے بتایا تھا کہ شیخ الجبال کو کسی نے کبھی قلعے سے باہر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ دراصل حسن اپنے معتقدین پر اپنی فوق الفطرت قوت کا سکہ بٹھانا چاہتا تھا۔ خود حسن نے بھی اتفاقاً اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ پیامبر کبوتر ایک قریبی گاؤں میں رکھے جاتے تھے اور وہ الموت کے باشندوں پر یہ راز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ خبریں کس طرح بھیجتا اور منگواتا تھا۔ لہذا وہ روزانہ دوپہر کے وقت چھپ کر گاؤں میں کبوتروں کے اڈے پر جاتا تھا۔

اس طرح وہ فدائیوں اور عام آدمیوں کو ایک داعی نظر آتا تھا۔ اور داعیوں کو .... عمر یہ سوچ کر مسکرایا .... داعی اس وقت یا تو سوتے ہوتے تھے یا قلعے کے تہ خانوں میں کام کر رہے ہوتے تھے۔ لیکن اگر اتفاق سے وہ حسن کو اس وقت دیکھ بھی لیں تو زیادہ سے زیادہ یہی سمجھیں گے کہ باہر سے کوئی نیا داعی وارد ہوا ہے۔

عمر نے ان زائچوں کی مدد سے، جو اس نے الموت کے قیام میں صاف نظر نہ آنے والے ستاروں کو دیکھ کر ترتیب دیئے تھے حسن کے اس رویے سے چند نتائج بھی اخذ کیے تھے۔ بہر حال اس نے سوچا کہ سارے داعی نہ تو آپس میں صورت شناس ہو سکتے ہیں اور نہ آواز سے ہی ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں۔

''لہذا فرار ہونے کا موقع صرف اس طرح مل سکتا ہے۔'' اس نے ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکالا۔'' کہ حسن کے نقش قدم پر چل کر ایک داعی کے بھیس میں

دروازہ عبور کیا جائے۔"

دوسرے دن دوپہر کو عمر نے داعیوں کا لباس حاصل کرنے کی ایک ترکیب سوچی۔ رکن الدین کئی دفعہ جنت کی شراب کا تذکرہ کر چکا تھا۔ عمر کو یاد تھا کہ رکن الدین تلواروں کے رقص والے دن کس قدر اشتیاق سے ملاوٹی شراب کا بھرا ہوا پیالہ غٹ غٹ پی گیا تھا۔ اور پھر حسن کا یہ قول بھی اس کے ذہن سے محو نہ ہوا تھا کہ "میں نے اپنے عالموں اور سائنس دانوں پر جنت کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونا ممنوع قرار دے رکھا ہے!" یہ سوچ کر عمر نے رکن الدین کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور اندر سے دروازہ اچھی طرح بند کر لیا۔

اس نے لاابالیانہ انداز سے شراب کی صراحی اٹھا کر پیالہ بھرا اور اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پستہ قد فلسفی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"جنت کی شراب۔"

رکن الدین بیتاب ہو کر صراحی کے قریب کھسک آیا اور اسے بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کیا یہ............واقعی وہی ہے؟"

عمر نے پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر شک ہو تو پی کر دیکھ لو۔"

دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے رکن الدین نے ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیا۔ مسرور ہو کر ایک گہرا سانس لیا اور اس کے موٹے موٹے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ بڑی حسرت سے اس نے پیالہ نیچے رکھا۔

''صراحی میں ابھی خاصی شراب ہے۔'' عمر نے بڑی لاپروائی سے کہا۔ ''جی چاہے تو اور پی لو۔''

تیسرا پیالہ ابھی آدھا ہی پیا تھا کہ ٹھگنے آدمی پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ وہ چاروں شانے چت گدے پر لیٹ گیا۔ پپوٹے نشے سے بوجھل ہو گئے۔ گفتگو میں بے ربطی پیدا ہو گئی۔ عمر قریب بیٹھا، کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے بڑے پرسکون لہجے میں رکن الدین سے اس طرح سوال کیا، جیسے وہ اس مسئلے پر دیر سے گفتگو کر رہے ہوں۔

''حسن کے پاس جو بے اندازہ دولت ہے، جو غیر معمولی قوت و اقتدار اسے حاصل ہے۔ یہ سب کچھ کہاں سے اور کیسے آیا ہے؟''

''خوف کے ذریعے۔ اس خنجر کے ڈر سے جو قتل کرتا بھی ہے اور نہیں بھی کرتا۔ اس نے ہمیں سمجھایا ہے کہ انسان معلوم کے مقابلے نامعلوم وجوہ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس کے قبضے میں ایک پوشیدہ.............''

رکن الدین ایک دفعہ پھر اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھا اور پیالے کی باقی شراب بھی جلدی جلدی اپنے حلق میں انڈیل لی .... منہ ہی منہ میں وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر لیٹ کر بے سدھ ہو گیا۔

چند منٹ میں عمر نے اپنے کپڑے تار ڈالے اور ان کے بجائے بے ہوش رکن الدین کا سرخ ساٹن کا خلعت پہن کر اس کی مخمل کی چوگوشیا ٹوپی اوڑھ لی۔ حالانکہ خلعت قدرے چھوٹا تھا لیکن ڈھیلی آستینوں اور پھیلے ہوئے دامن سے کام چل گیا۔

اس نے اپنے سفری جوتے اتار کر رکن الدین کے نیچی ایڑی کے بوٹ بھی پہن لیے اور جو اس کے پاؤں میں ٹھیک آ گئے۔

کھڑکی کے باہر نظر دوڑا کر عمر نے اندازہ لگایا کہ ابھی شام ہونے میں دیر ہے۔ غالباً حسن گاؤں سے واپس آ گیا تھا۔

بخارا کے گھوڑوں کے تاجر کا سا لمبا چوڑا لباس جو اس نے اتار ڈالا تھا رکن الدین کے جسم پر ڈال دیا تا کہ اگر کوئی اندر جھانکے تو سمجھے، عمر خود لیٹا ہوا ہے۔ اپنے ہاتھ آستینوں میں چھپا کر وہ غلام گردش میں نکل آیا۔ اسے کہیں دور سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن اس وقت غلام گردش میں کوئی نہ تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا عمر صحن میں کھلنے والے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی رفتار سست کر دی اور گردن جھکا کر چلنے لگا۔ دستار کے بغیر اسے اپنا سر کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ سنگ سفید کے صحن کی چمک سے اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

صراحیاں اٹھائے دو غلام اس کے قریب سے گزر گئے۔ اب دروازہ اس کے سامنے تھا جہاں سوائے پہرے داروں کے اور کوئی نہ تھا۔ جیسے جیسے وہ دروازے کے قریب آتا جا رہا تھا اس کے دل کی حرکت تیز ہوتی جا رہی تھی۔

فدائیوں کا سالار جس کی کمر میں تلوار لٹکی ہوئی تھی کبھی کبھی نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتا تھا۔ کسی نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ دیواروں سے گرمی نکل کر ہوا میں گھل رہی تھی۔ صرف چار قدم اور چل کر وہ دروازے تک پہنچ جائے گا۔ عمر نے سوچا ۔ایک ......دو......تین ......چار......

''آج کا لفظ راہداری کیا ہے؟'' پہرے داروں کے سالار نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ''آقا؟''

عمر بیس دم بخود رہ گیا۔ اس نے نہ تو پہلے سنا تھا نہ یہ سوچا تھا کہ شناختی لفظ (پرول) کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس نے بلاتوقف جواب دیا۔ ''مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا۔ ہمارے عالی مرتبت آقا نے مجھے خود بھیجا ہے............'' معقول وجہ بتانے کے لیے اس نے دماغ پر زور دیا۔ ''گاؤں جانے کے لیے...... کبوتر کے ذریعے پیغام روانہ کرنے۔''

سائن کی عبا کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے اپنی پیٹی سے چاندی کی وہ نلکی نکالی جو حسن کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ''یہ دیکھو یہ ثبوت ہے۔ مجھے بہت جلد جانا ہے۔''

سائے میں کھڑے ہوئے پہرے داروں نے تجسس آمیز نگاروں سے عمر کو دیکھا ان کا کپتان کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ اسے تو محض ہتھیار استعمال کرنے کی تربیت ملی تھی۔ عقل سے کام لینا اس کی بساط سے باہر تھا۔ عمر نے جلدی سے وہ نلکی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''تو ذرا اسے اپنے رکھ! میں ابھی گاؤں سے کبوتر پکڑ کے لایا۔ لیکن سمجھ لے اس میں جو پیغام بند ہے وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ورنہ یاد رکھ! آقا کا غضب تجھ پر نازل ہونا یقینی ہے۔''

پہرے داروں کے سردار نے نلکی کو مضبوطی سے مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔ ''یا اللہ! جلدی کر!''

پہرے داروں کو اپنی واپسی کا یقین دلانے کے بعد، عمر نے دروازے سے نکل کر سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ قلعے کی فصیل سے اس نے گاؤں کو ایک جھلک دیکھی تھی۔ البتہ اسے یہ معلوم تھا کہ وہاں گھوڑے بھی رکھے جاتے تھے۔ اور مختلف سمتوں سے آنے والے کارواں وہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں اقرونوس سے ملاقات نہ ہو جائے۔ یا کسی ایسے شخص کی اس پر نظر نہ پڑ جائے جو اسے پہچانتا ہو۔

گھاس کے انباروں کو کھاد کے ڈھیروں سے گزرتا ہوا وہ کبوتر خانے کی طرف بڑھتا رہا جس کے اوپر کبوتر تاوے کاٹ رہے تھے۔ اس نے سڑک کے کنارے درختوں کے سائے میں کچھ مزارعوں اور اجنبی قبائلیوں کو بیٹھے دیکھا، کہ کبوتر خانے کے صحن میں داخل ہو کر اسے جو شخص سب سے پہلے ملا عمر نے اس سے چلا کر کہا۔

''ایک پنجرے میں وہ کبوتر طلب کر رہا ہے جنہیں آقا استعمال کرتا ہے یا ....''

''خوب! کیا تو، وہ کبوتر طلب کر رہا ہے جنہیں آقا استعمال کرتا ہے یا ....''

''ہاں ہاں! وہی کبوتر۔ شیخ الجبال کا حکم ہے۔''

وہ عمر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ شاید اس سے قبل حسن نے کبھی کسی کے ذریعے کبوتر نہ منگوائے ہوں گے یا پھر اس کا نام سن کر وہ کچھ بدحواس سا ہو گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا، بید کی لکڑی سے بنے ہوئے پنجروں کے ڈھیر کی طرف چلا۔

''اور اصطبل سے ایک گھوڑا زین کسوا کر فوراً منگواؤ۔ گھوڑا بہت عمدہ ہونا

چاہیے۔'' عمر نے عجلت آمیز لہجے میں اس جاتے ہوئے آدمی کو ہدایت دی۔ ''گھوڑا لانے کے لیے کسی اور آدمی کو بھیجو۔''

عمر نے وقت گزاری کے لیے بے دلی سے ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ کبوتروں کے نگراں نے سڑک کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے اعلان کیا کہ ایک سرخ پوش آقا قلعے سے وارد ہوا ہے اور اسے فوراً ایک تیز رفتار گھوڑا چاہیے۔ خدا کے لیے جلدی کرو ورنہ ضرور ہم پر کوئی شدید مصیبت نازل ہو جائے گی۔ سڑک کے کنارے اونگھتے ہوئے لوگ احاطے کے دروازے پر جمع ہو کر اندر جھانکنے لگے۔ کبوتروں کا نگراں ایک ہاتھ میں کبوتروں کا پنجرا لٹکائے اور دوسرے ہاتھ میں زین سے پنجرا باندھنے کے لیے رسی لیے بھاگم بھاگ عمر کے پاس آیا۔

عالیجاہ! لیجیے یہ حاضر ہے۔ دیکھیے بازو کے اندر کی طرف یہ پر چوکور اکترا ہوا ہے اور دم پر سرخ روشنائی سے یہ دائرہ بنا ہوا ہے۔ ان نشانات کی وجہ سے یہ کبوتر دوسرے کبوتروں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اور اگر آقا......

اتنے میں گھوڑا پہنچ گیا۔ اور عمر بات ادھوری چھوڑ کر جلدی سے اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے جھک کر کبوتروں کا پنجرا زمین سے اٹھایا اور کسی قسم کے رخصتی کلمات کہے بغیر لگام کھینچ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا احاطے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

گاؤں کی بڑی سڑک پر پہنچ کر وہ دائیں ہاتھ مڑ گیا تاکہ دریا اس کے راستے میں حائل نہ ہو۔ وہ افرونوس کے ہمراہ دریا عبور کر کے آیا تھا جہاں اس نے محسوس کیا تھا

کہ پھیرا لگا ہے۔ اسے اس کا قطعی علم نہ تھا کہ دوسری سڑکیں کس طرح جاتی ہیں البتہ یہ یقین تھا کہ ہر سڑک خواہ وہ کہیں جاتی ہو اسے الموت سے دور لے جانے میں ضرور مدد کرے گی۔ اور وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ دن چھپنے سے پہلے اپنے اور حسن کے درمیان زیادہ سے زیادہ طویل فاصلہ حائل کر لے۔

جب وہ ایک ایسی سڑک پر مڑا جس پر کارواں کے نشانات دور تک صاف نظر آ رہے تھے وہ ایک تنگ وادی سے ہوتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اچانک چند آدمی ہاتھوں میں نیزے لیے ایک غار سے نمودار ہوئے۔ عمر کے لباس اور گھوڑے کو غور سے دیکھنے کے بعد وہ سب ''خدا حافظ'' کا نعرہ لگا کر پھر غار میں روپوش ہو گئے۔

عمر نے بھی جواب میں نعرہ لگایا۔ ''خدا تمہارا بھی حافظ و ناصر ہو۔''

جیسے ہی وہ سرحدی چوکی نظروں سے اوجھل ہوئی عمر نے چابک مار کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا جو اونچی نیچی پہاڑیوں کو پھلانگتا اور تناور چیڑ کے گھنے جنگل میں طرارے بھرتا ہوا دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ عمر نے یکایک ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

الموت کے دروازے پر عمر نے جو چاندی کی نلکی پہرے داروں کے سالار کو دی تھی۔ اس کے اندر یہ پیغام تھا ''عمر خیام رے کی جانب سفر کر رہا ہے۔''

شام ہوتے ہوتے، پسینے میں شرابور، لنگڑاتے ہوئے گھوڑے پر سوار اس نے آخری پہاڑی عبور کر لی اور وسیع میدانی علاقے میں داخل ہو گیا۔ دھندلاتے ہوئے اجالے میں اس نے سامنے نظر ڈالی تو اسے سڑک ایک سفید فیتے کی طرح دکھائی دی

جو ایک شکستہ مقبرے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس مقبرے کے قریب ہی کھیتوں میں بنی ہوئی جھونپڑیوں کے دروازوں سے جھانکتی ہوئی چراغوں کی روشنیاں بڑھتے ہوئے اندھیرے پر چشم نمائی کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں الاؤ بھی روشن تھے۔

پہلے الاؤ کے قریب گھوڑے سے اتر کر اس نے گاؤں کے نمبردار کو طلب کیا اور ایک تازہ دم گھوڑا لانے کا حکم دیا۔ ''میں شیخ الجبال کے کام سے سفر کر رہا ہوں۔'' عمر نے یہ بات اس خیال کے تحت کہی کہ وہ گاؤں کوہستانی سڑک کے اختتام پر واقع تھا اور وہاں کے باشندے اس سے قبل بھی حسن کے آدمیوں کی خدمت ضرور بجا لائے ہوں گے۔

''کون شیخ الجبال'' بوڑھے کسان نے عمر سے سوال کیا۔ ''وہی جو پہاڑ کی بلندیوں پر رہتا ہے؟''

''ہاں قلعہ الموت میں۔''

ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے کے بعد چند کسان عمر کے گھوڑے کو ساتھ لیے۔ الاؤ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی بچی کسی طرح سے وہاں آ نکلی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ عمر نے اس کی موجودگی کا کوئی خیال نہیں کیا تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کبوتروں کے پنجرے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے پنجرے میں اپنی انگلی ڈال کر کبوتروں کے پروں کو چھوڑا۔

عمر سے پکڑے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس قدر تھک گیا تھا کہ بھوک پیاس کا احساس بھی نہ کر سکتا تھا۔ ہر چند وہ الموت سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا

لیکن اسے شک تھا کہ آیا وہ حسن کے خدام کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے گا یا نہیں؟

''ان کبوتروں کو تم نے اس پنجرے میں کس طرح بند کر لیا؟'' بچی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

جب عمر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ کبوتروں کو چھوڑ کر چلی جائے۔ ''میں انہیں اکثر ہوا میں اڑتے دیکھتی ہوں۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کبھی کبھی یہ اتر کر پیڑوں پر بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جب میں قریب پہنچتی ہوں تو پھر سے اڑ جاتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''وہ کھیتوں میں اتر کر دانہ بھی چگتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے وہ کچھ دیر میرے ساتھ کھیلیں لیکن ذرا کی ذرا ٹھہر کر اڑ جاتے ہیں اور میں انہیں تکتی رہ جاتی ہوں۔''

عمر نے بچی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم چاہتی ہو کہ کبوتر اتر کر تمہارے پاس آ جائیں اور بے کھٹکے تمہارے چاروں طرف زمین پر پھدکتے پھریں؟''

''ہاں! یہی تو میں چاہتی ہوں۔'' اس نے خوش ہو کر ہلکے سے تالی بجاتے ہوئے جواب دیا۔

عمر نے جھک کر اپنے قدموں کے نیچے سے تھوڑی سی گیلی مٹی اٹھالی۔ قریب ہی ایک تالاب تھا اور ان چوپایوں کی آمد و رفت سے جو تالاب کے کنارے پانی پینے آتے تھے آس پاس کی مٹی گیلی ہی رہتی تھی۔ تھوڑی سی مٹی اور لے کر عمر نے لکڑی

کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر جمائی اور مٹی کو دبا کر ایک کبوتر کا پتلا بنایا بچی پاس آ کر بیٹھ گئی اور بڑی دلچسپی سے مٹی کا کبوتر بنتے دیکھتی رہی۔ عمر نے لکڑی کی دو تیلیاں اس مٹی کے پتلے میں لگا کر گویا کبوتر کے پاؤں بنا دیئے اور اسے زمین پر کھڑا کر دیا۔ ''اب تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے بچی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ کل دھوپ میں سوکھ جائے تو اس کہیں پانی کے قریب رکھ دینا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے کبوتر جب تمہارے اس کبوتر کو دیکھیں گے تو ضرور اتر کر اس کے پاس آ جائیں گے۔ مگر دیکھو۔ تم چپ چاپ انہیں دیکھتی رہنا۔ ان کے پیچھے دوڑنا مت۔''

ارے واہ! یہ تو سچ مچ کا کبوتر معلوم ہوتا ہے۔'' بچی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

جب کسان نیا گھوڑا لے کر اس کے پاس پہنچے تو عمر نے اندازہ لگایا کہ وہ دیہاتی قسم کا گھوڑا نہ تھا۔ اس نے انگڑائی لی اور کبوتروں کا پنجرا اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا وہ جلد آئے گا۔'' نمبر دار نے رازدارانہ لہجے میں عمر سے پوچھا ''یعنی وہ دن جس کے ہم منتظر ہیں؟''

''نمی دانم۔ خدا می داند۔'' (میں نہیں جانتا۔ خدا ہی جانتا ہے)

''عمر تمام راستہ سفر کرتا رہا۔ جب وہ ایک شہر کی فصیل کے پاس پہنچا تو پہچان گیا کہ وہ قزوین کی شہر پناہ ہے اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ شہر پناہ کے اس پار خراسان جانے والی عظیم شاہراہ حد نظر تک سیدھی چلی گئی تھی۔ وہ پھر اس سڑک پر ہو لیا کیونکہ اسے خیال تھا کہ شاید الموت کے مخبر اس کی تلاش میں اس وقت تک

قزوین پہنچ چکے ہوں گے۔

جب سورج کی کرنوں نے بلند قامت پہاڑوں کی چوٹیوں کو بوسہ دیا اور تاریکی کا پردہ چاک کر کے بھوری پہاڑیوں نے سر اٹھایا تو ایک نا قابل برداشت غنودگی عمر پر غالب آنے لگی۔ وہ زین کا ہتا پکڑ کر اونگھنے لگا۔ تھکے ہوئے گھوڑے کی رفتار بے حد سست پڑ گئی۔ عمر کو یقین تھا کہ وہ رے کی سمت سفر کر رہا ہے۔ خراسان کی طویل شاہراہ پر۔ جس پر اس نے رحیم کے ہمراہ سفر کیا تھا۔ جس پر چل کر انسان کسی منزل پر نہیں پہنچتا۔ وہ مٹی کے کبوتر ہی تو ہیں جو ریتلے میدانوں میں چلتے پھرتے ہیں .... اس غنودگی کے عالم میں عمر کے دماغ میں بے ربط خیالات آ رہے تھے .... آخر یہ معصوم بچے معجزوں، فوق الفطرت باتوں کو اتنی آسانی سے کیوں قبول کر لیتے ہیں۔ شاید ان کے بڑے بوڑھے جن کی دماغی صلاحیتیں کمزور پڑ چکی ہیں انہیں شکی بناتے ہیں۔ ان میں سوءظن پیدا کر دیتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا جیسے مٹی کے بنے ہوئے کبوتر تنبیہی پیغامات لیے ہوا میں ادھر سے ادھر اڑ رہے ہیں۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور جب ایک آواز نے اسے عربی میں مخاطب کیا تو وہ ایک دم چوکنا ہو گیا۔

''کون ہو تم؟''

سورج کی بھرپور روشنی میں گرد و غبار کیا طوفان اٹھا۔ ڈھیلی ڈھالی عبائیں پہنے اور سروں پر کساوے باندھے، سواروں کی ٹولیاں عمر کے قریب سے گزرنے لگیں۔ کبھی کبھی کچھ لوگ رک کر اسے غور سے دیکھنے لگتے تھے۔ عمر نے بھی اپنے گرد آلود

ساٹن کے لباس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔

''میں ایک مسافر ہوں'' اس نے جواب دیا۔ ''میں ان فلک بوس پہاڑوں سے آ رہا ہوں'' عمر نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا......... اور عظیم المرتیت سلطان ملک شاہ کی بارگاہ تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔''

''حضور! آپ؟'' ایک جانی پہچانی آواز فضا میں گونجی۔ ایک کوزہ پشت اپنے گھوڑے کی پشت سے کود کر عمر کی طرف دوڑا اور اس یک رکاب تھام لی۔ جوش مسرت سے کوزہ پشت کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''کیا آپ اپنے غلام جعفرک کو بھول گئے؟''

''لیکن'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جعفرک تو قصر کوچک میں ہوگا۔''

''نہیں'' مسخرے نے قہقہہ لگایا۔ ''فوج واپس آ گئی۔ ملک شاہ کی سوار فوج سمرقند سے واپس آ گئی۔ میں بھی ان کے ہمراہ چل پڑا تا کہ رے پہنچ کر آپ کو تلاش کروں۔''

چلتے چلتے ایک اونٹ رکا اور لڑکھڑاتا ہوا بیٹھ گیا۔ محمل کا پردہ ہٹا کر ایک عورت زمین پر کود پڑی۔ اور سواروں کے درمیان دوڑتی ہوئی عمر کی طرف بڑھی۔

''میرے آقا'' عائشہ چلائی۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو تمام آفتوں سے محفوظ رکھا۔ شہر رے کے بازاروں میں انہوں نے بتایا......... آپ کے محافظ دستے کے بیوقوف شمشیر برداروں نے۔ کہ آپ کو جنات اڑا کر لے گئے تھے۔'' اس نے عمر کی رکاب مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے آپ کی شکل بھی بدل

ڈالی ہے۔ یہ آپکی داڑھی کو کیا ہوا؟‘‘

’’آقا!‘‘ اسحاق دربان نے احتراماً زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔’’میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ مگر یہ لڑکی بھلا قصر میں کب ٹکنے والی تھی۔ جعفرک سے ساز باز کر کے آپ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر سڑکوں پر بے نقاب ماری ماری پھر رہی ہے۔

میرے ضمیر نے مجھے پکارا:’’اے اسحاق! اپنے آقا کی ناموس کی حفاظت تیرا فرض ہے۔‘‘ وہ رے پہنچ کر سکون سے نہ بیٹھی۔ اس عرب دستے کے کماندار کے پاس گئی۔ آپ کی گم شدگی کا حال بتایا۔ پھر وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا ....خدا ہمارے سلطان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے ....سلطان نے حکم دیا۔ عمر خیام کو تلاش کیا جائے۔ وہ کہیں بھی ملے۔ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر یا سمندروں کی طوفانی سطح پر ....‘‘

’’بکواس بند کر۔ خوشامدی کتے‘‘ عائشہ نے جھلا کر اسحاق کو ڈانٹا۔ عمر کی بازیافت پر عائشہ اس قدر جذباتی ہوگئی تھی کہ عرب سواروں کے درمیان اسے اپنے بے پردہ ہونے کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ عرب سوار خود ہی اس کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گئے تھے ....’’کمبخت اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے کہ میرا آقا صحیح سلامت مجھے مل گیا ہے۔ اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتی تو قصر کو چک کے دروازے پر بیٹھا تو آج تک ناک صاف کرتا ہوتا اور اس جاسوس خواجہ سرا سے رشوت میں سونا وصول کر کے اپنی جیبیں بھرتا رہتا............‘‘

''خاموش!'' عمر نے درشت لہجے میں کہا۔ سوار دستے کا افسر اس کی طرف آ رہا تھا۔

عائشہ نے بھی فوراً اپنے چہرے پر نقاب درست کر لیا۔ نوجوان افسر نے عمر کے سامنے پہنچ کر اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے جھک کر اسے سلام کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ عمر کے لباس کی انوکھی وضع کی متجسس نگاہوں سے بھی دیکھتا رہا۔

''مجھے صحیح بتاؤ۔'' اس نے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی تم سلطان کے منجم ہو؟''

''بے شک'' عمر نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔ مگر یہ بھی سوچنے لگا کہ وہ اپنی موجودہ بیئت کذائی کا کیا جواز پیش کر سکتا ہے............ ''میں وہاں۔ اوپر کوہساروں میں جادوگروں سے جنگ کر رہا تھا اور انہی کے لباس میں وہاں سے بھاگ کر آ رہا ہوں۔''

''واللہ! آج کل کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔'' عرب افسر کی حیرت ایک پوشیدہ خطرے میں تبدیل ہوتی نظر آئی۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''اب میں سلطان کے حکم سے آپ کو آگاہ کرتا ہوں۔ آپ کو میرے ہمراہ براہ راست بارگاہ سلطان میں حاضر ہونا ہے۔''

''سلطان کا حکم سر آنکھوں پر۔'' عمر چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ نیشاپور اپنی رصدگاہ میں پہنچ جائے۔ ''آج کل سلطان کا پڑاؤ کہاں ہے؟ سردار!''

ظل اللہ اصفہان کی سمت سفر فرما رہے ہیں ہمیں بھی اسی طرف جانا ہے۔''

جب عائشہ کے اصرار اور اپنی نیند کی شدت سے مجبور ہو کر محمل میں سوار ہو گیا تو عرب دوشیزہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''دیکھا! سفر ایسے ہوتا ہے۔ ایک ہزار تیغ زن آپ کے جلو میں چل رہے ہیں اور سلطان کی لامحدود عنایات آپ کا انتظار کر رہی ہیں............ ان کوہستانی جادوگروں کے یہاں کچھ عورتیں بھی ضرور ہوں گی؟''

عمر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ''ہاں۔ پرستان کی ایک دوشیزہ وہاں تھی۔ جو جنت کی نہر میں تیرتی ہوئی کشتی پر بیٹھی رو رہی تھی۔''

''جنت! کیا آپ اس دنیا کو چھوڑ کر اس جنت میں چلے گئے جہاں حوریں ہوتی ہیں؟''

وہ ایک خواب تھا۔ عائشہ! درحقیقت اصلی جنت تو زندگی کے راستے میں ایک لمحہ آرام کر لینے کے مترادف ہوگی۔''

عائشہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر اس نے اپنے بازو عمر کی گردن میں حمائل کر دیئے اور اپنے ہونٹ اس کے کان سے ملا کر اسے بتایا: نظام الملک کو سلطان نے برخاست کر دیا ہے اور اسی وجہ سے آپ کو طلب کیا گیا ہے۔''

عمر کو شبہ ہوا کہ شاید وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔ نظام الملک جو دو نسلوں سے مسلسل سلجوقی سلطانت کے سیاہ و سفید کا مالک رہا ہے برخاست کر دیا گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟''

''ایک خط کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔'' عائشہ نے عمر کے تذبذب کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ نظام الملک کس قدر طاقتور ہو گیا تھا۔ اس کے پوتے تک صوبوں کے گورنر بنے بیٹھے تھے۔ بہر حال! کسی شخص نے سلطان کو ایک خط میں لکھا کہ نظام الملک وزیر سلطنت ہے یا تخت سلطنت کا حصے دار اور ملک شاہ نیا یک روز مغلوب الغضب ہو کر نظام الملک سے کہا کہ میں صاحب تاج وسریر ہوں اور آج سے بغیر تیری مدد کے براہ راست اور بذات خود حکومت کا انتظام کروں گا۔

عمر بڑی محویت سے عائشہ کی باتیں سن رہا تھا اسے نظام الملک سے اپنی آخری ملاقات کا خیال آ گیا۔ کاش! اس نے نظام الملک کے حکم کی تعمیل میں ملک شاہ کو مطلع کر دیا ہوتا کہ سلطان کے خراسان کی طرف واپس آنے سے از روئے نجوم ناخوشگوار واقعات رونما ہونے کا اندیشہ ہے۔ تو بوڑھے وزیر کو یہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

''اور وہ خط'' عائشہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک کبوتر لایا تھا۔ دوران فلک بوس پہاڑوں سے۔'' عمر یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ جب وہ خراسان جانے والی سڑک پر ایک فصیل والے شہر میں آرام کرنے کے لیے ٹھہرے تو عمر محمل سے باہر آیا اور اسحاق دربان کو حکم دیا اور وہ اس چوبی پنجرے میں سے جو اس کی تحویل میں تھا ایک کبوتر نکال لائے۔ جب کاغذ، قلم دات اور ایک چھوٹی تکلی جو کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے استعمال ہوتی تھی، مہیا ہو گئے تو عمر نے کاغذ کا ایک پرزے پر حسب ذیل عبارت لکھی:

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا راستہ الگ ہے اور تیرا راستہ الگ۔

لیکن جو کچھ میں نے تیرے یہاں رہ کر دیکھا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں

کہ جب تک مجھے یا میرے متعلقین کو تیری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

میں اس کا تذکرہ کسی سے نہ کروں گا۔"

بغیر القاب و آداب لکھے اور بغیر دستخط کیے اس نے کاغذ کا یہ پرزہ لپیٹ کر نلکی میں رکھ دیا اور نلکی کبوتر کے پنجے میں باندھ دی۔ اس امر کا یقین کرنے کے لیے کہ وہ پرندہ الموت ہی کا ہے کٹے ہوئے پر اور دم پر سرخ نشان کا بھی ایک مرتبہ جائزہ لیا۔ جب کبوتر کو ہوا میں اچھالا گیا اس نے پہلے شہر کا تاوا کاٹا اور پھر شمال کی طرف پہاڑوں کا رخ کر کے تیزی سے خلاف میں غائب ہو گیا۔

عائشہ اور اسحاق جو اس کام میں عمر کے شریک تھا حیرت زدہ ہو کر برابر عمر کی حرکتوں کو دیکھتے رہے۔

"اب یہ جادوگروں کے گڑھ کی طرف اڑ گیا۔" عائشہ نے خود کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"غالباً دربان کی بھاری آواز آئی۔" خدا جانے اس نے کوئی دعا لکھی تھی یا منتر۔ بہر حال جنات کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کرنا بہتر ہے۔ لیکن آخر میں نتیجہ خراب ہی ہوتا ہے۔" اس نے ڈرتے ہوئے کہا "ریچھ کے بھٹ سے کبھی کوئی زندہ نکل کر بھی آیا ہے۔"

حوالہ جات

1۔

زاں پیش کہ بر غمہات شلیخوں آرند
فرمای بتا تامی گلگوں آرند
تو زرنہ اے غافل ناداں کہ ترا
در خاک نہندو باز بیروں آرند

2۔

درحقیت حسن لوگوں کو مسحور کرنے کے لیے حشیش یا ہندوستانی بھنگ استعمال کرتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ایران میں افیون کا رواج نہ ہوا تھا اور حشیش کو بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ حسن پہلا شخص ہے جس نے وہاں حشیش کو روشناس کرایا۔ اسی لیے اس کے فدائیوں پر اس کا عجیب اثر ہوتا تھا جو رفتہ رفتہ حشیش کے عادی ہو گئے تھے اور وہ اس مسحور کن شے کو کسی اور ذریعے سے حاصل بھی نہ کر سکتے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ حسن کے پیرو ''حشیشین'' (حشیش استعمال کرنے والوں) کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ جو بگڑ کر انگریزی میں Assassin ہو گیا جس کے مروجہ معنی ''قاتل'' یا ''فریب یا دھوکے سے مار ڈالنے'' کے ہیں۔ لیکن ''حشیشین کے صحیح لغوی معنی ''باطنی فرقے کے فدائی'' ہیں۔ حسن بن صباح نے جس روحانی سلسلے کی بنیاد ڈالی تھی اسے ''باطنی'' کہتے ہیں۔ ج۔ن۔

☆..............☆..............☆

باب پنجم

جنوبی شاہراہ کے آخری سرے پر اصفہان کے بازار اور ابن العطاش کی حویلی کے تہہ خانے

عائشہ کے لیے اصفہان خوشیوں کا سرچشمہ تھا۔ رنگ برنگے کپڑے ہر عورت کی فطری کمزوری ہوتے ہیں۔ بازار کپڑوں سے پٹے پڑے تھے۔ اس نے نارنجی، شوخ قرمزی اور گہرے اودے رنگ کے کپڑوں کے انبار خرید ڈالے۔ اسحاق دکان دکان اس کے ساتھ پھرتا اور اس بات پر مسلسل بڑبڑاتا اور کھولتا رہا کہ ایک خوبصورت کنیز کا اس طرح بازار میں آزادی کے ساتھ خرید وفروخت کرنا اس کے نقطۂ نگاہ سے قطعی نازیبا اور مروجہ رسم و رواج کے خلاف تھا۔ اس کے کان آنے جانے والوں کی فقرے بازی پر لگے ہوئے تھے اور اصفہان میں تماش بینوں کی بھلا کیا کمی تھی۔ مگر اس کے سات ہی ساتھ اسے اس کام میں لطف بھی آ رہا تھا۔ ایک سنسان پائیں باغ میں تنہا بیٹھ کر مکھیاں مارنے کے مقابلے میں بازار میں سٹر گشت کرنا بہر حال دلچسپ مشغلہ تھا۔ اسحاق اپنی نئی ذمہ داری پر دل ہی دل میں نازاں بھی تھا ...... اس نے دو دیلمی شمشیر بردار محافظ بھی ملازم رکھ چھوڑے تھے جن کا کام یہ تھا کہ جب وہ عائشہ کے ہمراہ عمر کی نئی قیام گاہ سے کہیں باہر جائے تو وہ دونوں محافظ اس کے پیچھے پیچھے چلیں تاکہ دیکھنے والوں پر ذرا رعب پڑے۔

اسحاق کا آقا ملک شاہ کا واحد منظور نظر اور چہیتا مشیر تھا۔ اس کے دروازے پر ہر وقت بڑے بڑے امیروں اور عہدے داروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور دربار سلطانی میں سفارشیں پہنچانے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ مختلف قسم کی سواریوں کی قطاریں صبح سے شام تک وہاں لگی رہتیں۔ اسحاق کی کم ظرفی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ایک روز اس نے سپہ سالار کے حاجب کو جو عمر کی خدمت میں ایک ضروری کام سے حاضر ہوا تھا اس وقت تک اندر جانے کی اجازت نہ دی جب تک کہ عمر نے ایک زیر مطالعہ کتاب کا آخری صفحہ ختم نہ کر لیا۔

جب اسحاق دربان نے یہ واقعہ جعفرک سے بیان کیا تو جعفرک نے اسے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں ورنہ ایک نہ ایک دن کوئی بچھو کی طرح ایسا ڈنک مارے گا کہ تجھے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''ہاں ہاں! سن لیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا سر کہاں اور پیر کہاں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میرے پاؤں اکھڑ کر سر پر جا لگیں۔''

جعفرک زیادہ وقت سڑکوں کی مٹر گشت میں گزارتا تھا۔ اسحاق کے خیال میں اس طرح وقت ضائع کرنا محض حماقت تھی جبکہ عمر کے دروازے پر سکون سے بیٹھ کر خاصا پیسہ کمایا جا سکتا تھا کیونکہ ہر شخص جو وہاں آتا تھا دربان کے لیے خیر سگالی کے طور پر ایک نہ ایک تحفہ ضرور لاتا تھا۔ اسحاق کو اس بات کا البتہ افسوس تھا کہ عمر اپنے ملاقاتیوں کو بہت جلد رخصت کر دیتا تھا۔

بجائے اس کے کہ عمر طاقتور امراء کی خاطر مدارات کر کے ان سے تعلقات بڑھاتا یا دولتمند تاجروں سے مل کر کچھ مشترکہ نفع بخش معاملات طے کرتا یا غریبوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور شفقت سے پیش آتا۔ اس کا طرز عمل کچھ عجیب قسم کا تھا۔ وہ ہر ملاقاتی کی باتیں بڑی بے دلی سے سنتا اور ایک دو لفظوں میں روکھا پھیکا جواب دے کر اسے بہت جلد ٹال دیتا تھا۔ بعض لوگوں سے تو وہ یہاں تک کہہ دیتا کہ وہ سلطان کا کوئی وزیر تو ہے نہیں کہ ان کی درخواستوں کو خود منظور کرے یا سلطان سے منظور کرائے۔ حالانکہ ہر فرد اس بات کو سو فیصد جانتا تھا کہ ملک شاہ عمر کی مٹھی میں تھا۔

''کیونکہ وہ ستاروں کا طلوع و غروب نہیں دیکھ سکتا۔ اور ان کے بڑھنے، گھٹنے کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے۔'' اسحاق نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ انتہائی عقلمند ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں جانتا کہ ایک امیر جو سلطان کا قرب حاصل کرنے کا متمنی ہے۔ اس کی کس طرح ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ واللہ! یہ بڑے تعجب کی بات ہے!''

عائشہ سنی ان سنی کر دیتی لیکن وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ عمر کوئی معمولی عہدے دار نہیں ہے۔ ورنہ ملک شاہ آنکھ بند کر کے اس پر اس قدر اعتماد کبھی نہ کرتا۔ سب سے بڑا اعزاز اس کے خیال میں یہ تھا کہ عمر کو اس عظیم شخص کی سرپرستی و خوشنودی حاصل رہنی چاہیے جس کے ادنیٰ سے اشارے لاکھوں مسلح سوار اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے ہیں اور بس۔

جب سہ پہر کو ملک شاہ بڑے چوک میں چوگان کا کھیل دیکھنے آتا تو عائشہ بھی حرم سرا کے جھروکے میں بیٹھ کر بڑے ذوق و شوق سے یہ نظارہ دیکھتی اور اسے یہ کھیل دیکھنے میں مزا بھی بہت آتا تھا۔ اس وقت تمام عالی امرا طرے دار، جواہر نگار عمامے سر پر باندھے، ریشی اور زر رفت کی عبائیں پہنے وہاں حاضر ہوتے تھے۔ اور خود سلطان بھی گل انار رنگ کے شامیانے کے نیچے عمر کے ساتھ تشریف فرما ہوتا تھا۔ چابکدست سوار گیند کو لڑھکا کر سنگ مرمر سے تراشے ہوئے ستونوں کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ جب ملک شاہ کے حکم سے کھیل ختم ہو جاتا تو موسیقاروں کے سازوں کی کھنکتی ہوئی آوازیں عجیب سماں پیدا کر دیتیں۔ اس سارے پس منظر میں عائشہ عمر کے قوت و اقتدار کا اندازہ لگانے لگتی۔ اور زنجبیل کی میٹھی گولیاں چوستے ہوئے ان نقاب پوش عورتوں کی حسد بھری نظروں سے دیکھتی رہتی جو شاہی منجم کی ایک نگاہ التفات کی خواہشمند دکھائی دیتی تھیں۔

ایک دفعہ رات کے وقت عمر اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ایک کمل پوش صوفی سے باتیں کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں صوفی نے فیصلہ کن انداز میں اس بات پر زور دیا کہ روز ازل سے صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔

''تو پھر اسے یہ معلوم تھا کہ میں شراب پیوں گا۔'' عمر نے جواب میں کہا۔ ''اور اس حقیقت سے انکار کرنے والا میں ہوتا بھی کون ہوں؟''

عائشہ کو عمر کی یہ بات بہت ناگوار گزری تھی اور اس پر ایک خوف طاری ہو گیا تھا صوفی کے رخصت ہونے کے بعد عائشہ عمر کے پاس پہنچی تھی اور بڑی عاجزی سے

اسے سمجھایا تھا کہ مشیت خداوندی کا مذاق اڑانا بری بات ہے۔ اس نے عمر سے کہا تھا کہ وہ اس دولت واقتدار پر نظر کرے جو اللہ تعالیٰ نے اسے ارزانی فرمائے ہیں۔

اور عمر نے اپنی خوبصورت کنیز کو جس کا چہرہ اس وقت کسی نامعلوم خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عائشہ! جب تم اس دنیا سے رخصت ہونے لگو گی تو کیا یہ ساری دولت وحشمت اپنے ساتھ لے جاؤ گی؟''

''مجھے کیا معلوم'' اپنی روپہلی چوڑیوں کو انگلی سے کلائی پر گھماتے ہوئے اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''تو پھر جتنا عیش کرنا ہے کرلو۔ کیونکہ...... میں یقین دلاتا ہوں۔ تم اس دنیائے آب وگل میں واپس نہ آؤ گی۔''

اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے جیسے وہ ایک دلدوز آہ کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''نہیں عائشہ، میری جان۔'' عمر نے اسے اپنے آغوش میں کھینچتے ہوئے کہا۔'' جنت میں ملنے والی حور کی امید میں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آج تجھے اپنے سینے سے جدا کر دوں۔''

''اس حور کے لیے بھی نہیں جو کسی جھیل کے اندر تیرتی ہوئی کشتی میں لیٹی تھی؟''

''کون سی حور؟ اوہو! میں سمجھا'' عمر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' نہیں! اس کے لیے بھی نہیں۔''

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عائشہ عمر کے بالوں میں اپنی نازک انگلیوں

سے کنگھی کرنے لگی ...... عائشہ نماز بہت پابندی سے پڑھتی تھی۔ اور دن میں ایک مرتبہ ضرور جامع مسجد جا کر دعا مانگتی تھی۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ کاش مرنے کے بعد بھی اسے جنت میں عمر ہی کے ساتھ رہنا نصیب ہو۔

محض اس تصور ہی سے اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی کہ مبادا ایک سنہری بالوں والی کافر حسینہ وہاں بھی عمر کے آغوش کی تمنا دل میں لیے ہوئے انتظار کر رہی ہو۔

ملک شاہ کبھی عمر کو دربار سے رخصت کرنے کا اشارہ تک نہ کرتا تھا۔ جب سے اس نے نظام الملک کو برخواست کیا تھا وہ روز بروز اپنے منجم کے صلاح مشورے پر اعتماد کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حدود مملکت کی توسیع اور اس کی اپنی شاندار فتوحات عمر کی جچی تلی پیشین گوئیوں کی مرہون منت تھیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو اس میں سب سے بڑا دخل تھا لیکن ستاروں کے اثرات کے صحیح تجزیے نے بھی یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔

"انما الایات عند اللہ (نشانیاں تو بیشک اللہ تعالیٰ کے ہی قبضہ میں ہیں) ملک شاہ نے ایک روز کلام پاک کی یہ آیا با آواز بلند تلاوت کیں۔" ولو اننا نزلنا الیھم الملئکۃ و کلمھم الموتی و حشرنا علیھم کل شیء قبلا ما کانو الیومنوا الا ان یشاء اللہ " (اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات (غیبیہ) کو ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لا کر جمع کر دیتے تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے ہاں اگر خدا ہی چاہے تو اور

بات ہے)

"لیکن بفرض محال میں ستاروں کی چالیں صحیح نہ سمجھ سکوں، اے فرمانروائے شرق وغرب! تو پھر کیا ہو؟ میں بھی انسان ہوں۔ اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے کسی وقت بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔"

ملک شاہ نے عمر کی یہ بات غور سے سن کر سر ہلایا۔ "قسم ہے کعبے کی مجھے اس بات کا شہ بھر بھی اندیشہ نہیں ہے۔ ایک ٹٹپونجیا رمال یا ہاتھ دیکھ کر اٹکل پچو قسمت کا حال بتانے والا بے شک دروغ بیانی کر سکتا ہے۔ لیکن تیرا علم کامل ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ایک معمولی سا فلکیاتی مشاہدہ کرنے میں تجھ سے غلطی سرزد ہو جائے۔

عمر جواب دینے ہی والا تھا کہ سلجوقی فرماں روا نے اضطراری طور پر اپنے خیالات مجتمع کرتے ہوئے کہا کہ "قرآن میں یہ بھی آیا کہ پیغمبروں کے دشمن ہوتے ہیں۔ انسانوں میں شیطان بھی ہوتے ہیں اور سرکش جنات بھی۔ میں تو ایک معمولی بادشاہ ہوں اور یہ بادشاہی بھی محض خدا کی دین ہے۔ میرے بھی لاتعداد دشمن ہیں۔ اس لیے مجھے صحیح مشورے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

قرآن مجید بند کرتے ہوئے اس نے عمر کی خاموشی کو اتفاق رائے پر محمول کیا۔ کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ایک ادنیٰ درجے کے رمال کو غلط بیانی کرنے کے لیے رشوت دی جا سکتی ہے............ کبھی کبھی اس قسم کا خیال تیرے متعلق بھی میرے دماغ میں آیا ہے۔ لیکن تیرے علم و شخصیت کے پیش نظر میں ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ از روئے نجوم اگر کسی بات کا جواب نفی میں تو سونے کا پہاڑ بھی رشوت میں

پیش کر کے دنیا کی کوئی طاقت "نہیں" کے بدلے تجھے "ہاں" کہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔"

عمر خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ نجوم کے معاملے میں کوئی صحو لیل سلطان کے عقیدے میں تبدیلی نہیں کر سکتی۔ "نظام الملک نے تو سلطان المعظم کو کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔" اس نے بڑی جسارت سے عرض کیا۔

"نظام الملک نے شاہی اقتدار کا بہت بڑا حصہ اپنے قبضہ و تصرف میں لے لیا تھا۔" ملک شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے قرآن مجید کی ورق گردانی کر کے اس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ "یہ کچھ تیرے بارے میں ہے" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کاغذ پر خوشخط باریک الفاظ میں یہ پیغام لکھا ہوا تھا: "اگر خیالم پیغمبری کا جامہ پہن کر بھی سامنے آئے تو اس کی بات پر یقین کرنے سے پہلے یہ ضرور تحقیق کر لینا کہ شیر کی کھال کے اندر کہیں گیدڑ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"مجھے کسی بات کے دیکھنے یا تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس سے پہلے کہ عمر کچھ کہے ملک شاہ خود ہی بول پڑا۔ "مجھے تیری قدر و قیمت معلوم ہے۔ ملاذ گرد کی جنگ کے وقت سے ہماری قسمتیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

کاغذ کا پرزہ عمر سے واپس لے کر اس نے اپنی مضبوط انگلیوں سے چاک کر دیا۔ اور غصہ کے ساتھ اسے سامنے رکھی ہوئی روشن انگیٹھی میں پھینک دیا۔

"جاسوس" اس نے بلند آواز سے کہا۔ "میں اس قسم کے تمام افراد کو اپنی حدود مملکت سے نکال باہر کروں گا۔ نظام الملک کہا کرتا تھا کہ وہ میرے چشم و گوش ہیں۔

وہ میرے افسروں اور خادموں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ وہ لوگ جو مجھ سے خائف ہیں یا میرے خلاف سازشیں کرتے ہیں وہ ان جاسوسوں کو دل کھول کر رشوت دیتے ہیں تاکہ وہ میرے روبرو ان کی تعریفیں کریں۔ اور خدا کی قسم جو مجھ سے محبت کرتے ہیں انہیں جاسوسوں کو رشوت دینے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آجکل لوگ میرے سامنے دشمنوں کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں اور میرے دوستوں کی برائیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے میرے متعلق کوئی نازیبا کلمہ میرے سامنے نہیں کیا نہ کوئی الزام تجھ پر لگانے کی جسارت کی ہے۔"

"لیکن میں خود اپنے آپ کو قابل الزام گردانتا ہوں۔" عمر نے زور دے کر کہا۔

"میں یہاں رہ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی رصدگاہ واپس چلا جانا چاہیے!"

ملک شاہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ "واللہ! مجھے تیری رفاقت کی ضرورت ہے۔"

"نہیں حال ہی میں ایک نئی دریافت کی ہے۔ کرۂ ارض کے متعلق ایک بالکل نئی تحقیق۔"

"آہا۔ شاید کوئی سیارہ دریافت کر لیا! سلطان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے طشت میں سے انگوروں کا ایک خوشہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ انگور کے کچھ دانے عمر کی طرف بھی بڑھائے.......... سلطان شاذونادر ہی یہ عزت کسی کو عطا کرتا تھا۔" بے شک، بے شک۔ اور ہمارا دور حکومت تیری عقل و دانش کی روشنی سے ضرور جگمگائے گا......"

''وہ کوئی نیا سیارہ نہیں ہے۔ میں نے دریافت کیا ہے کہ...... یہ کرۂ ارض۔ یہ زمین حرکت کرتی ہے۔ گھومتی ہے۔''

ایک لمحے کے لیے **ملک** شاہ کے چہرے پر حیرت ابھری۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح کے بھیانک خواب بھی دیکھتے ہیں۔ میں نے بھی ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ میں گر رہا ہوں۔ نیچے اور نیچے۔ جیسے پیروں تلے زمین نہ ہو۔ اور آخر کار میں خلا میں گردش کرنے لگا تھا...... تیرے خیال میں یہ کوئی براشگون تو نہ تھا؟''

''وہ تو محض ایک خواب تھا۔ خداوند نعمت کا ستارہ عروج پر ہے۔ کسی طرح کا خوف دل میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عمر تفصیل سے **ملک** شاہ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کس طرح کئی برس سے اس نظریے کا تجربہ کر رہا ہے کہ ''زمین'' بجائے ساکن رہنے کے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں اپنے گرد گھوم جاتی ہے۔ اور جسامت میں سورج یا چاند سے بڑی ہونے کے باوجود زمین درحقیقت فضائے بسیط میں ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آتی ہے............ لیکن **ملک** شاہ کو اس بات کا یقین نہ آیا۔ وہ بات ٹالنے کے لیے آہستہ آہستہ انگور کھانے لگا اور ان کے ذائقے کی تعریف شروع کر دی۔

''کل ہی کی بات ہے'' سلطان نے بات چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ان جانوروں کے سر شمار کرائے جو میں نے شکار میں مارے تھے۔ وہ نو ہزار سے بھی زیادہ تھے۔ میں نے سوچا، محض اپنا دل خوش کرنے کے لیے اللہ کی اتنی مخلوق کو قتل کرنا

کہاں تک جائز ہو سکتا ہے؟ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے میں نو ہزار طلائی سکے خیرات کروں گا۔"

"الحمدللہ!"

"بے شک۔ اللہ ہی تعریف کی لائق ہے۔" ملک شاہ نے عاجزی سے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کچھ دن بعد تجھے گھومنے پھرنے کی اجازت دے دوں گا۔ لیکن اس وقت تجھے رخصت دینا خود اپنا اپنا بازو اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالنے کے مترادف ہوگا۔"

عمر دربار شاہی سے رخصت ہو کر عقبی کمرے سے ہوتا ہوا باہر آیا۔ وہ اس وقت بہت دل شکستہ اور اداس دکھائی دے رہا تھا۔ جب وہ چوک سے گزرا تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔ اور گرد و غبار کے دھند میں ٹمٹما رہے تھے۔ لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ مختلف قسم کی چہ میگوئیاں سنتا ہوا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

"وہ دیکھو! وہ خیام جا رہا ہے جس نے نئی زیج مرتب کی ہے...... یہ خواجہ امام عمر ہے جو یہ بتاتا ہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے...... کافروں کا رفیق...... یہ شاعر بھی ہے۔ مگر شعر کہہ کر تلف کر دیتا ہے کہ مبادا......"

اس کے مکان کے دروازے پر ملاقاتیوں کا ایک ہجوم تھا۔ عمر نے ان سب لوگوں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ وہ اس وقت کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اور سیدزنان خانے میں چلا گیا جو بالائی منزل میں تھا۔ عائشہ نے بڑھ کر مضحکہ خیز انداز میں فرشی سلام کرتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ نہ معلوم کب سے سولہ سنگار کیے بیٹھی

تھی۔ بازار سے کئی قسم کی مٹھائیاں منگوا کر سلیقے سے دستر خوان پر چن رکھی تھیں۔ ایک سنہری صندوقچہ جس میں گہرے رنگ کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اس نے رید کر وہاں رکھ چھوڑا تھا۔ عود دان میں صندل کا برادہ جلا کر اس نے عمر کے آنے سے پہلے ہی کمرے کو معطر کر رکھا تھا اور اس کا انتظار کرتے کرتے اکتا سی گئی تھی۔

کمرے میں پھیلی ہوئی شوق انگیز خوشبو کا اثر لیے بغیر عمر سامان نوشت و خواند کے قریب لیٹ گیا۔ اس کی طبیعت گپ شپ کے لیے آمادہ نہ تھی۔ جب اس نے قلم اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عائشہ نے بھی اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کچھ دیر تک تو وہ اپنے بال سنوارتی رہی۔ آخر ایک طرح کے جذبۂ رقابت سے مجبور ہو کر اس نے عمر سے پوچھا۔

''یہ کیا لکھا جا رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''یہ کوئی ایسی چیز ہے......'' اس نے کاغذ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''جو تمہیں افسردہ بنا دیتی ہے۔ شاید کوئی تعویذ ہے؟ کیا لکھا ہے اس میں؟''

ازروئے حقیقی نہ ازروئے مجاز

مالعبتگا نیم و فلک لعبت باز

بازیچہ ہمی کنیم برنطع وجود

رفتیم بصند وق عدم یک یک باز

''مرد گڑیاں نہیں کھیلتے'' عائشہ نے جل کر کہا۔ ''وہ شاہین کی طرح دشمنوں پر

جھپٹتے ہیں۔ بہر حال یہ بڑی بیکار سی بات ہے۔ اگر تم گڑیا ہوتے تو تمہارے اندر سوچنے کی صلاحیت نہ ہوتی اور انسان تو ایک ایک جیتی جاگتی چیز ہے اس کے ساتھ گڑیا کی طرح نہیں کھیلا جا سکتا۔'' عائشہ نے عمر کو لبھانے کے لیے اوائے خاص سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسی بے مزا باتیں لکھنا تو نیم خواندہ منشیوں اور خشک مزاج زاہدوں کو ہی زیب دیتا ہے۔''

عمر نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی جو عائشہ کی چھوٹی بڑی قیمتی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ طشت میں میوہ بھری کھجوریں جوں کی توں رکھی تھیں۔ باوجودیکہ اس طرح کی تازہ کھجوریں عائشہ کی بے حد مرغوب تھیں مگر عمر کے انتظار میں اس نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

وہ اس کے پہلو میں آرام سے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ جب عائشہ بناؤ سنگار کر کے اپنے بہترین ریشمی کپڑے پہنتی تو وہ جنت کا ایک خوش رنگ طاہر نظر آتی تھی۔ لیکن اس طرح لاپروائی اور بے تکلفی سے لیٹے ہوئے دیکھ کر عمر اس کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

گردن جھکا کر عمر نے بڑے پیار سے اس کے ہونٹوں کو چوما۔ اور نوجوان دوشیزہ نے بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں۔ دراصل وہ مصنوعی طور پر سوئی سوئی اور اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اس کاغذ پر فاتحانہ نظر ڈالی جس پر صرف چار سطریں تحریر تھیں اور جواب دور فرش پر جا گرا تھا۔

''آقا''، جعفر ک نے عمر کو بتایا۔ ''تیرے کوہستانی جادوگر اصفہان تک آپہنچے ہیں

ہے۔"

درباری مسخرے کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ شہر کے بازاروں میں عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اس نے رات کو وقت مسجد کے دروازے پر لوگوں کو سرگوشیاں کرتے سنا تھا۔ وہ لوگ ایک شخص کا ذکر رہے تھے۔ جس نے حیات بعد الممات کے راز فاش کر دیے تھے۔ جب وہ مر گیا تو اسے جنت کی سیر کرائی گئی اور وہاں کے حالات بیان کرنے کے لیے اسے پھر دنیا میں واپس بھیج دیا گیا۔

"اس نے جنت میں کیا دیکھا؟" عمر نے سوال کیا۔

چشموں سے ابلتی ہوئی شراب۔ سبزے پر بچھے ہوئے رنگ برنگے قالین اور سیاہ چشم حوریں۔ جن کے حسن نے اسے مدہوش کر دیا۔"

"کیا جنت میں کوئی دریا بھی بہتا ہے؟"

جعفرک نے بڑے والہانہ انداز سے سر ہلایا۔ اس نے اکثر اس بات پر غور کیا تھا کہ قبر سے ماورا کیا چیز اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

"جن لوگوں نے اس مردہ شخص کو باتیں کرتے سنا ہے وہ اس کے برعکس بتاتے ہیں کہ وہاں دریا وغیرہ نہیں بلکہ ایک جھیل ہے جس پر ہر وقت روپہلی چاندنی چھائی رہتی ہے۔"

اس نے اشتیاق بھری نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ عائشہ نے اکثر جعفرک سے اس بات کا تذکرہ کیا تھا کہ جب عمر پہاڑوں پر جادوگروں سے برسر پیکار تھا تو

اسی زمانے میں اس نے ایک خواب دیکھا تھا اور اسے خواب میں ایک ایسی ہی جھیل دکھائی دی تھی۔ لیکن اس شخص کے خلاف، جو مرنے کے بعد زندہ ہو کر گوشۂ قبر سے پھر دنیا میں واپس آیا ہے عمر نے اپنا خواب زیادہ تفصیل سے کبھی بیان نہ کیا تھا۔

''ہاں'' عمر نے جعفرک کی بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک جھیل ہے اور اس جھیل میں ایک تفریحی کشتی سوتے ہوئے راج ہنس کی طرح خاموشی سے تیرتی رہتی ہے۔''

''واللہ! کچھ اور حالات بتائیے۔ میرے آقا۔''

''پھر صبح کو آنکھ کھل گئی اور بس۔''

جعفرک نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ بدن کے جوڑوں میں ایک طرح کی سختی محسوس کرتے ہوئے اسے اپنے بڑھاپے کا خیال آیا۔ اس کے دل میں یہ تمنا کروٹیں لینے لگی کہ کاش مرنے کے بعد وہ جنت میں پہنچ کر ایک مرتبہ پھر نوجوان ہو جائے۔ ''تندمند، وجیہ اور رقد آور۔

''بھلا کون واپس آیا ہے اس طویل سفر سے (2) ''عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ایک شخص کو تو بہر حال واپس آتے ہوئے ہم سن رہے ہیں۔''

جعفرک کے دل کو یقین آ گیا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبر صلعم نے جنت میں ہمیشہ بہنے والی نہروں کو خوش خبری دی تھی۔ عمر نے بھی جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا بقول عائشہ کے...... خواب میں جنت کی سیر کی تھی جہاں شراب کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس شخص کی بات کا یقین نہ کیا جائے جو اسی

قسم کی نہروں کا ذکر کر رہا تھا۔ جعفرک اپنے اس یقین کو مزید تقویت دینے کے لیے اپنے کانوں سے مذکورہ شخص کو بولتے ہوئے سننا چاہتا تھا۔ دن چھپتے ہی وہ مسجد کے دروازے کا چکر لگانے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ لیکن اس کے کان بدستور سرگوشیوں پر لگے ہوئے تھے۔

ایک دبلے پتلے خستہ حال درویش سے اس سلسلے میں اس کی بات چیت ہوئی تھی۔ وہ بھی اس واقعے کو سچا سمجھتا تھا۔ اسی نے جعفرک کو پوری تفصیل بتائی تھی اور یقین دلایا تھا کہ اس وقت وہ خود وہاں موجود تھا جب مردہ شخص نے ایک خاص بڑے مجمع کے سامنے باتیں کی تھیں۔ اور آئندہ جمع کو وہ مسجد کے عقب میں ابن العطاش کے مکان پر وہ پھر گفتگو کرے گا۔ جعفرک کا خیال تھا کہ اگر کوئی درویش کسی معجزے کی تصدیق کر دے تو یقیناً وہ سچا ہی ہوگا۔

وہ عمر کے سامنے یہ سب باتیں بیان کرتا رہا۔ عمر نے یہ سب کچھ سن لینے کے بعد جعفرک کو غور سے دیکھا اور خاموش ہو رہا۔

جعفرک کے دل میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ ابن العطاش کے مکان پر جو جامع مسجد کے عقب میں واقع تھا ضرور جائے گا۔ دوسرے دن سرِ شام سے ہی وہ اس امید میں وہاں پہنچ گیا تھا کہ شاید اسے مذکورہ اجنبی شخص کو بچشم خود باتیں کرتے دیکھنے کا موقع مل جائے۔

جب وہ ابن العطاش کے دروازے پر پہنچا تو وہاں اس نے ایک شخص کو گھوڑے پر سوار کھڑے پایا جو اندھیرے کی آڑ میں سے آنے جانے والوں کو غور سے دیکھ رہا

تھا۔

"ارے جعفر ک! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

مخاطب ہونے والا تو توش تھا۔ اصفہان کے بازاروں میں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ عجیب واقعات رونما ہو رہے تھے جن کا جاسوسوں کے سربراہ تو توش نے تذکرہ کیا تھا۔

گزشتہ مہینے سے متعدد افراد یکے بعد دیگرے گم ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں پریشان کن بات یہ تھی کہ گم ہونے والے بھک منگے یا معمولی حیثیت کے انسان نہ تھے۔ ان میں سے بیشتر مالدار تاجر معزز نووارد اور مشہور قبیلوں کے سردار تھے...... پانچ افراد تو بالکل ہی مفقود الخبر تھے۔

یہ امر طے شدہ تھا کہ انہیں آوارہ گرد قبائلیوں نے اغوا نہیں کیا تھا کیونکہ شہر پناہ کے باہر جاتے ہوئے انہیں کسی نے نہ دیکھا تھا۔ وہ شہر کے اندر ہی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اور یہ تمام واقعات دن چھپنے کے تھوڑی دیر بعد ہی رونما ہوئے تھے۔ پانچویں اشخاص یا تو گھوڑوں پر سوار تھے یا اکیلے پیدا چل رہے تھے...... ان میں سے اکثر مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے اپنے اپنے گھر واپس جاتے ہوئے گم ہوئے تھے۔

علاوہ ازیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ پانچویں آدمیوں کو کسی نامعلوم شخص کی طرف سے غیر معمولی قسم کے تحفے بھیجے گئے تھے۔ تفتیش کے دوران میں ان کے گھر والوں نے تو توش کو بتایا تھا کہ تمام گم شدہ افراد کے سرہانے مختلف اوقات میں نہ

معلوم کون دو تازہ روٹیاں لپیٹ کر رکھ گیا تھا۔

''کھاتے پیتے لوگوں کی مسہریوں کے سرہانے بھلا روٹیوں کا کیا کام؟''

توتوش ہر دفعہ یہ سوال کرتا تھا۔ ''ارے روٹیاں! اور وہ بھی تازہ پکی ہوئی جیسے فوراً کوئی تنور سے نکال کر لایا ہو۔''

جعفرک نے اپنا سر ہلایا۔ یہ واقعات نوعیت کے اعتبار سے بڑے ہی غیر معمولی تھے۔ لیکن اللہ ہی سب کچھ کرتا ہے۔ اس طرح کے واقعات کو معجزہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نہ خرق عادت جیسا کہ ایک درویش نے دیکھ کر اس سے بیان کیا تھا۔

''غور کرنے کی بات ہے.........'' توتوش بڑبڑایا...... وہ مسجد سے پیدل جا رہے تھے...... پانچ میں سے تین کو آخری بار جامع مسجد میں دیکھا گیا تھا۔ لہٰذا میں نے تمام دروازوں اور قرب و جوار کی چھتوں پر اپنے آدمی متعین کر دیے ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اندھیرے میں کیا دکھائی دے سکتا ہے؟ گم شدہ اشخاص کے عزیز و اقارب نے عدالت میں بڑی واویلا مچا رکھی ہے اور گورنر...... لیکن تو راتوں کو یوں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہے؟''

''میں یہاں ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں جس سے مجھے قرض وصول کرنا ہے...... میرا خیال ہے کہ ان پانچوں آدمیوں کو کہیں چھپا دیا گیا ہے۔''

''تو پھر وہ کہاں چھپائے گئے ہیں؟ سڑکوں پر متعین پہرے داروں نے انہیں نہیں دیکھا؟ پھر وہ سب مشہور دولت مند آدمی تھے کوئی چور اچکے نہیں تھے۔ مالدار آدمی جب روپیہ پیسہ لے کر کہیں تنہا جاتے ہیں تو محض نہتے بھی نہیں ہوتے۔

جعفرک دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ جاسوسوں کا طاقتور سربراہ اس سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے رک گیا تھا۔ ''اچھا اگر وہ سب مالدار اسامیاں تھے تو ممکن ہے انہیں آوارہ و سرکش بدمعاش تاوان لے کر چھوڑنے کی لالچ میں پکڑ کر لے گئے ہوں۔''

توتوش تیزی سے تسبیح پھراتے ہوئے پھر بڑبڑایا۔ ''لوگ تجھے بے وقوف کہتے ہیں لیکن تو بعض اوقات عقلمندوں سے زیادہ سمجھداری کی باتیں کرتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ انہیں تاوان یا ڈنڈ کے لالچ میں کوئی پکڑ کر نہیں لے گیا۔ کیونکہ ان پانچوں میں سے کسی کے اعزا کو بھی اس قسم کا کوئی مطالبہ موصول نہیں ہوا...... تاہم ...... اللہ ہی عالم الغیب ہے...... ممکن ہے کسی وقت روپیہ طلب کرنے کے لیے کوئی ان کے پاس آجائے۔ بہر صورت الزام میرے ہی سر آتا ہے۔''

''خدا آپ کو تفتیش میں کامیاب کرے۔''

جعفرک نے جاسوسوں کے افسر اعلیٰ سے اجازت چاہی۔ لیکن ایک لمحے کے لیے اس نے توقف کیا۔ وہ توتوش کے ملازموں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا مگر گلی میں جا کر درویش سے باتیں کرنے کو بھی اس کا دل چاہ رہا تھا۔ شاید کسی نئے معجزے کا حال درویش سے معلوم ہو سکے۔ وہ گلی میں داخل ہونے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتا اس امید میں مسجد کی طرف چل پڑا کہ شاید مسجد کے دروازے پر درویش سے ملاقات ہو جائے۔

اس وقت تک تقریباً ایک تہائی رات گزر چکی تھی۔ اور عشاء کی نماز ختم ہو چکی

تھی۔ محرابی دروازے پر آویزاں قندیل کی روشنی میں اسے صرف دو ملا نظر آئے اور ایک اندھیرے میں چل رہا تھا۔ جعفرک جب اس کے سامنے پہنچا تو وہ گڑگڑا کر جعفرک سے مخاطب ہوا۔

''اے اللہ کے بندے! کیا تو اندھے پر ترس کھا کے گھر کے دروازے تک جعفرک سے مخاطب ہوا۔

''اے اللہ کے بندے! کیا تو اندھے پر ترس کھا کے گھر کے دروازے تک پہنچنے میں اس کی مدد کرے گا؟''

''بے شک'' جعفرک نے اظہار ہمدروی کرتے ہوئے کہا۔ ''کدھر ہے تیرا گھر ؟''

''مسجد کے پچھواڑے۔'' اندھے نے کبڑے کا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی جلدی راستہ طے کرنے لگا۔ ''بائیں ہاتھ کو تیسرا دروازہ جہاں فصیل ختم ہوتی ہے۔ ویسے تو کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے مگر جس کے آنکھیں نہ ہوں اس کے لیے اتنا فاصلہ بھی میلوں لمبا معلوم ہوتا ہے۔ ہائے میری قسمت!''

بائیں ہاتھ کو تیسرا مکان۔'' جعفرک نے ایک اضطراری دلچسپی کے ساتھ دہرایا ۔''وہ ابن العطاش کا مکان تو نہیں ہے؟''

نابینا نے جعفرک کی طرف منہ پھیرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ اس کے چہرے کو گھورنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''ابن العطاش؟ تو اسے کیسے جانتا ہے۔ اے اندھے کے مہربان دوست؟''

’’مجھے اس کی تلاش ہے۔‘‘

’’بہت لوگ اس کی تلاش میں آتے ہیں۔‘‘ جیسے ہی وہ مسجد کے کونے پر پہنچ کر تنگ گلی میں داخل ہوئے سخت زمین پر اندھے کی لکڑی کی کھٹ کھٹ کی آواز تیز ہو گئی۔ جعفرک نے فوارے سے پانی گرنے کی آواز سنی اور اس نے اندھیرے میں مطلوبہ تیسرا دروازہ ڈھونڈ نکالا۔ شاید اس اندھے آدمی کو اس مکان کا راز معلوم ہو اور کچھ باتیں اس سے معلوم ہو جائیں۔؟ جعفرک سوچنے لگا۔

’’ارے دروازہ آ گیا!‘‘ اندھے نے لکڑی سے چھو کر اندازہ لگایا اور دستک دی۔ دروازہ چرمراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ ’’رے رفیق شب‘‘ اندھے نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ’’آؤ! اندر آ جاؤ اور کچھ دیر آرام کر لو۔‘‘

جعفرک کے بازو کا سہارا لیتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ ان کی پشت پر کوئی چیز حرکت کرتی معلوم ہوئی اور ایک آہنی پنجے نے درباری مسخرے کا گلا سختی سے دبوچ لیا۔ جعفرک شدت کرب سے بیتاب ہو گیا اور گھپ اندھیرے میں منہ کے بل گر پڑا۔

عائشہ کی نیند میں یکایک کچھ خلل واقع ہو گیا اور وہ سوتے سوتے چونک کر جاگ اٹھی۔ وہ بہت ذکی الحس واقع ہوئی تھی۔ اس نے اپنے قریب کسی ایسی غیر معمولی شے کو حرکت کرتے محسوس کیا جس کی موجودگی خطرے سے خالی نہ تھی۔ کھلی ہوئی چھت پر عمر کے پہلو میں قالین کے اوپر لیٹے لیٹے اس نے بغیر ہلے جلے کچھ سننے کی کوشش کی۔

اس نے پھر وہی ہلکی سی آواز سنی جس نے اسے سوتے سوتے چونکا دیا تھا...... کوئی شخص چکنے فرش پر ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا شخص اس کے اتنے قریب گہری گہری سانسیں لے رہا تھا کہ خوف کی شدت سے اس کی سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کسی چیز کے نیچے کاغذ دبانے کی ہلکی سی آواز آئی اور ایک عجیب قسم کی بو اس کی ناک میں داخل ہوتی محسوس ہوئی۔ نوجوان لڑکی چیخ مار کر اس طرح کھڑی ہوگئی جیسے خوفزدہ ہرنی خطرے کے احساس سے ایک دم اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

جیسے ہی وہ کھڑی ہوئی اس نے ٹمٹماتے ستاروں کے مدھم روشنی میں ایک سیاہ ہیولے کو حرکت کرتے دیکھا۔ ننگے پیروں کی کھس کھس دور ہوتی چلی گئی۔ عمر نے بھی گھبرا کر اٹھتے ہوئے ایک شخص کو زینے کی طرف بھاگتے دیکھا اور وہ للکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔

لیکن نیچے صحن میں اس قدر اندھیرا تھا کہ اسے یہ پتا نہ چل سکا کہ وہ ناخواندہ مہمان کدھر گیا۔ اونگھتے ہوئے ملازمین اپنے اپنے حجروں سے نکل کر گرتے پڑتے عمر کی طرف بھاگے۔ مشعلیں روشن ہوگئیں۔ نامعلوم حملہ آور غائب ہو چکا تھا۔ صدر دروازہ بدستور مقفل تھا۔ اسحاق جو دروازے کے قریب زمین پر پڑا سو رہا تھا طرح طرح کی قسمیں کھا کر یہ یقین دلا رہا تھا کہ دروازہ کسی وقت بھی نہیں کھلا۔

عائشہ نے چھت سے نیچے جھانکتے ہوئے پکار کر عمر سے کہا۔ ”میرے آقا! یہاں آئیے۔ دیکھئے یہ کیا ہے؟“

جب مشعلیں اوپر لائیں گئی تو عمر نے اپنے تکیے کے قریب دو چیزیں پڑی دیکھیں۔ ایک بغیر نیام کا خنجر اور دو تازہ روٹیاں لپٹی ہوئی۔ جن میں سے ایک وقت تک ایسا بھپکا نکل رہا تھا جیسے ابھی تنور سے نکالی گئی ہوں۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹا تھا تو اس طرح کی کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ وہ خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا کسی باہر کے آدمی نے جان جوکھوں میں ڈال کر یہ کام کیا ہے یا پھر اس کے اپنے خادموں ہی میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہے۔ عائشہ کو یقین تھا کہ خنجر گھبراہٹ میں یوں ہی زمین پر نہیں گرا بلکہ ضروری کسی نے بڑی احتیاط سے عمر کے سرہانے رکھا تھا۔

عمر نے اس ہتھیار کو اٹھا کر غور سے دیکھا۔ وہ بھورے فولاد کا بنا ہوا نہایت نفیس خمدار خنجر تھا۔ اس نے پہلے بھی اس نمونے کے خنجر الموت میں فدائیوں کی کمر میں لٹکے دیکھے تھے۔ اس نے خنجر زمین پر رکھ دیا اور سنجیدگی سے اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

''لیکن اس کا مطلب کیا ہوا؟'' عائشہ نے سوال کیا۔ وہ ہنوز خوف اور غصے کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی...... ''یعنی اس خنجر اور روٹیوں کا۔''

''یہ دو علامتیں ہیں'' اسحاق نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''روٹیاں زندگی کی علامت ہیں اور خنجر موت کا نشان ہے۔ یقیناً اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔''

''تو ٹھیک کہتا ہے'' عائشہ نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہماری زندگیوں کا انحصار تیری دربانی پر ہوتا تو اے خراٹوں کے بادشاہ! ہم لوگ نجانے کب کے اللہ

کے پیارے ہو چکے ہوتے۔ اے واہ! اس وقت جھ پر نیند کی پکلی نہیں پڑتی۔ جب ملاقاتی سونے چاندی کے سکوں سے تیری مٹھی گرم کرتے رہتے ہیں۔ اور جب اندھیرے میں چور اندر گھس آتے ہیں تو اس وقت تو کہاں کالا منہ کر جاتا ہے؟''

''دیکھیے!'' اسحاق نے ایک دم چلا کر کہا۔ ''یہ کاغذ کیسا پڑا ہے۔ اس پر کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔''

اس نے جھک کر باریک برنجی کاغذ کا ایک چوکور ٹکڑا اٹھایا اور عمر کی طرف بڑھا دیا۔ عمر روشنی کے قریب جا کر اسے پڑھنے لگا۔ تحریر فارسی زبان میں تھی۔ صرف ایک سطر بغیر دستخط کے۔ ''ضرورت اس امر کی ہے کہ تو اپنی زبان قابو میں رکھ۔'' اس نے بلند آواز سے پڑھا۔

''تو اپنی زبان قابو میں رکھ'' اسحاق نے فلسفیانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے دہرایا۔ ''حضور! کس قدر کھلی ہوئی تنبیہہ ہے۔ یہ عائشہ کے لیے ہے۔ ذرا غور کو ملاحظہ فرمائیے۔ جیسا ایسا ہی نوکدار ہے جیسی عائشہ کی زبان۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ روٹی پکائے اور خاموشی سے گھر میں پڑی رہے۔''

لیکن عمر جانتا تھا کہ اس تنبیہہ کا مخاطب وہ خود ہے۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ الموت سے نافذ کی گئی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ حسن نے خود اپنے قلم سے اس کو نہ لکھا ہو۔ کاغذ بھی بجنسہ اسی قسم کا تھا جو نامہ بر کبوتروں کے ذریعے پیغامات بھیجنے کے لیے شیخ الجبال استعمال کرتا تھا۔ بغیر دستخط کیے کاغذ کا ایسا پرزہ اس کے سوا اور کون بھیج سکتا تھا؟ اصفہان پہنچنے کے بعد عمر نے الموت اور وہاں کے واقعات کو تقریباً فراموش

کر دیا تھا۔ اور کسی سے ان باتوں کا ذکر تک نہ کیا تھا جو اس نے الموت کے دوران قیام میں سعیتہ کے متعلق دیکھی جا سنی تھیں۔ لیکن اسے اس پر بڑا تعجب تھا کہ آخر حسن نے روٹیاں اور خنجر اس کے پاس کیوں بھیجے۔

صبح ہوتے ہی اس کی وجہ عمر کی سمجھ آ گئی۔ تو توش کا ایک جاسوس عمر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ادب سے جھک کر فرشی سلام کیا۔

''کیا بات ہے؟'' عمر نے بے صبری سے پوچھا۔

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے اسے کس نے ٹھکانے لگا دیا؟'' ظل السلطان! ہم تمام رات مسلسل سڑکوں پر گشت کرتے رہتے ہیں۔ جب ذرا روشنی نمودار ہوئی تو ہم نے آپ کے ایک خادم کو نالے میں مردہ پڑا ہوا پایا۔ چلئے دیکھیے۔ ہم اس کی لاش اٹھا کر لائے ہیں۔''

نیچے پہنچ کر وہ عمر کو صحن کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی مسہری کے قریب لے گیا۔ لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔

عمر نے اپنا مضبوط ہاتھ بڑھا کر چادر اٹھائی اور اچانک غم و غصہ کی شدت سے وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ لاش جعفرک کی تھی۔ چہرہ تقریباً سیاہ ہو گیا تھا اور ٹھوڑی کے نیچے گلے میں ایک شگاف تھا جس میں سے زبان نکال کر قاتل نے اسے اس قدر کھینچا تھا کہ غالباً جڑ سیا کھڑ کر ساری کی ساری باہر نکل آئی تھی۔

''افسوس! کس قدر عبرتناک منظر ہے!'' گشت کرنے والے سپاہی نے آہ

بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس سے پہلے کبھی کسی کو اس طرح قتل ہوتے نہیں دیکھا۔ پھر یہ تو بڈھا اور بے ضرر آدمی تھا۔''

عمر نے لاش کو پھر چادر سے ڈھک دیا اور ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں خبر دینے والے کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ ''تو توش کے آدمی ہو تم؟ اپنے آقا کو فوراً میرے پاس بھیجو!''

تو توش اس قدر جلد وہاں پہنچ گئے جیسے وہ کہیں قریب ہی عمر کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ خیام نے اسے اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر ایک ایسے کونے میں جا کھڑا ہوا جہاں کوئی ان کی باتیں نہ سن سکے۔ تو توش نے اپنے عمامے کے لٹکتے ہوئے گوشے سے پسینہ پونچھا اور بے چینی کے ساتھ جلدی جلدی اپنی تسبیح گھمانے لگا...... اسے یاد تھا کہ اسی جعفرک کی بدولت چند سال پہلے وہ کسی طرح عمر کے غیض وغضب کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنے میزبان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اس کی ہمت اور بھی پست ہوگئی۔

عمر کے دماغ پر اس وقت مقتول جعفرک کا خیال غالب تھا۔ اس وفادار درباری مسخرے کی موت سے ان یادوں کا آخری رشتہ بھی منقطع ہو گیا تھا جن کا تعلق ان بے فکری کے ایام سے تھا جو عمر نے رحیم مرحوم کے ساتھ گزارے تھے۔

''یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟'' عمر نے تلخ لہجے میں تو توش سے پوچھا۔ ''اس کا کوئی دشمن نہیں تھا...... اف خدایا! وہ ایک شیر خوار بچے کی طرح بے ضرر تھا۔''

تو توش نے اس قدر جھک کر سلام کیا کہ اس کا ہاتھ تقریباً زمین سے لگ گیا......

''جناب والا کی اجازت ہو تو عرض کروں!...... یہ ایک ایسا معما ہے جس کو سمجھنے سے میری ناقص عقل قاصر ہے۔ میں علیؓ کی ریش مبارک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ گزشتہ شام جامع مسجد کے قریب مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اور میں نے اسے سڑکوں پر بے مقصد گھومنے سے سختی کے ساتھ منع بھی کیا تھا...... اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو مجھ پر خدا کی مار ہو...... نہ صرف یہ بلکہ ایک محفوظ مقام تک میں اسے چھوڑنے بھی گیا......'' اپنی صفائی پیش کرتے کرتے توتوش پر ایک خوف طارف ہو گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ کیونکہ وہ تلوار کی کاٹ سے کہیں زیادہ عمر کے جلال سے خائف تھا...... ''میں قسم کھاتا ہوں......'' اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔

''اس کی لاش تجھے کہاں ملی ہے؟''

''لاش کو میرے ایک آدمی نے مسجد سے خاصے فاصلے پر دریا کے کنارے والی سڑک پر نالے میں پڑا پایا۔ معلوم ہوتا ہے اسے اس مقام پر قتل نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ وہاں خون کے ایک قطرے کا نشان بھی نہ تھا۔ میں حسنؓ اور حسینؓ اور تمام شہدائے کربلا کی قسم کھاتا ہوں۔ جناب والا! میرے بات کا یقین کیجیے!......''

''خاموش!'' عمر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ حسن، حسن بن صباح، حسن نے تھوڑی ہی دیر پہلے تنبیہہ کی تھی کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ جعفرک کی زبان تو گزشتہ رات کھینچ کر گدی سے نکال دی گئی تھی۔ آخر کیوں...... کن وجوہ کی بنا پر؟ یہی کہ حسن کے آدمیوں کو شبہ ہوا ہو گا کہ وہ ان کی مخبری کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں جعفرک کن خیالات

میں گم تھا؟ وہ اس منحوس معجزے کے چکر میں تھا جس کی بدبو سے الموت کی ساری فضا بھری ہوئی تھی۔ ابن العطاش کی حویلی میں ایک ہنکارا ابھرا...... ٹھیک ہے۔ اس نے یہ افواہ جامع مسجد کے قریب ہی سنی تھی۔ جامع مسجد کی پشت پر سرا ہے۔ جمعے کی شام کو ۔تو پھر یہاں اس طرح ہوا کہ...... جعفرک کو غالباً جامع مسجد کے آس پاس قتل کیا گیا اور وہاں سے اس کی لاش کو لے جا کر خاصے فاصلے پر پھینک دیا گیا۔

مسجد کی پشت پر جو ابن العطاش کی حویلی ہے۔ اس کے متعلق تجھے کیا معلوم ہے؟ عمر نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں...... میں پہلی مرتبہ یہ نام سن رہا ہوں۔

عمر اس ارادے سے اٹھا کر مذکورہ حویلی میں جا کر خود دیکھے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ لیکن کچھ سوچ کر وہ قریب بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گیا۔ توتوش نے پھر گہرا سانس لیا۔ قاتلوں کو وہاں تلاش کرنا بے سود تھا۔ وہ لوگ ارتکاب جرم کر کے مزے سے مسجد میں درویشوں کے حلقے میں بیٹھے ہوئے ''یا ہو'' یا ''حق'' کر رہے ہوں گے۔

''میں صرف اتنا جانتا ہوں'' عمر نے گہری سوچ سے ابھرتے ہوئے کہا۔ ''کہ رات کو ایک چور میرے سرہانے ایک تحریر چھوڑ گیا تھا جس میں مجھے اپنی زبان بند رکھنے کی تاکید و تنبیہہ کی گئی تھی۔''

جعفرک کی موت کا خیال آتے ہی توتوش کا جبڑا ڈر کے مارے سخت ہونے لگا۔

دور چلمن کے پیچھے سے آتی ہوئی ایک آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "میرے سرتاج! میں اس دخل درمعقولات کے لیے معافی چاہتی ہوں...... خنجر اور تازہ پکی ہوئی روٹیوں کا حال بھی اسے بتائیے۔"

"عائشہ" عمر نے سنجیدگی سے کہا۔ "حرم میں واپس جاؤ۔"

ریشمی لباس سرسرایا اور پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

"روٹیاں!" جاسوس کے افسر اعلیٰ نے باآواز بلند دہرایا۔

"ہاں...... ان کے متعلق کیا بات ہے؟"

"یا اللہ! اور ایک خنجر؟"

"تم نے سن لیا؟"

ایک لمحہ توتوش سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح اعلیٰ طبقے کے پانچ افراد اپنے سرہانے روٹیاں پانے کے بعد مفقود الخبر ہو گئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ جعفرک کو قتل کرنے کے بعد روٹیاں میرے سرہانے رکھی گئی تھیں۔" عمر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "یقیناً یہ ایک ہی شخص کا کام تھا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔ میں آپ کی تائید کرتا ہوں۔" توتوش نے سوچ کر گردن ہلائی۔ جعفرک بھی راتیں اسی مسجد کے قریب گزارتا تھا جہاں سے تین افراد گم ہوئے تھے۔"

"تو پھر یہ فدائیوں کا کام ہونا چاہیے۔" عمر نے رائے ظاہر کی۔

ان الفاظ کا توتوش پر عجیب طرح کا اثر ہوا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس

کہ سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ''کس...... کس کا......؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

فدائی۔ نشہ آور عرق پینے والے۔ موت و حیات کے مالک حسن بن صباح کے خنجر بردار۔ جو قلعہ الموت کا مالک ہے۔ جسے لوگ سعیتہ (باطنیوں) کا قائد بھی کہتے ہیں۔

توتوش نے خوف کے فوری اثر کے تحت ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اٹھا کر بڑی لجاجت سے کہا۔ ''عالیجاہ! یہ نام زبان سے نہ نکالئے۔''

عمر نے خاموشی کے ساتھ توتوش کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ''تو پھر تجھے سعیتہ کا علم ہے۔ اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ یہ انہیں کا کام ہے؟''

''فلکیات کے ماہر! میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں نے تو صرف چند افواہیں سنی ہیں۔ لیکن لوگ یہ نام سن کر جو عالیجاہ نے ابھی ارشاد فرمایا۔ ڈر کے مارے کانپنے لگتے ہیں۔''

''تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم ان سعیتہ کے متعلق کیا کیا جانتے ہو۔''

جو باتیں توتوش کے دماغ میں تھیں انہیں اگلوانا آسان کام نہ تھا۔ وہ سعیتہ سے بھی اتنا ہی خوفزدہ تھا، جتنا عمر سے۔ بہر حال بڑی ہمت کر کے اس نے حالات بیان کرنے شروع کیے لیکن بار بار وہ چلمن کی طرف اس طرح دیکھتا جاتا تھا جیسے اس کے پیچھے کوئی اژدہا چھپا بیٹھا ہو۔

نظام الملک نے ان کے متعلق تحقیقات کا حکم دے رکھا تھا۔ توتوش نے زور

دیتے ہوئے بتایا۔ کیونکہ نظام الملک کا خیال تھا کہ حسن کے پیرو مسلمہ عقاید کے شدید مخالف تھے۔ نظام الملک نے اپنی کتاب میں بھی اس پر اسرار جماعت کا تذکرہ کیا تھا جو خفیہ طور پر مصر سے آکر ایران پر حملہ آور ہوئی تھی۔ اس نے کتاب کے اس حصے کو سر بمہر کر دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ اسے اس کے مرنے کے بعد پڑھا جائے۔ وہ یعنی تو توش تو محض ایک خادم تھا جس کا کام احکام کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔

حسن نے۔ تو توش کی تحقیقات کے مطابق سیدھے سادھے مسلمانوں اور وفادار ملازمان شاہی کو خوف زدہ کر کے قوت و اقتدار حاصل کیا تھا وہ مالدار تاجروں کو دھمکا کر بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ فدائیوں کے ذریعے ایسے افراد کے سرہانے جنہیں وہ اپنا نشانہ بناتا تھا سوتے ہیں تازہ روٹیاں رکھوا دیتا تھا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ شیخ الجبال کو معتدبہ رقم ادا کریں۔ دوسرے دن ان کے دروازے پر ایک شخص فقیر کے بھیس میں مالک مکان کے ہاتھ سے خیرات لینے کے بہانے آتا تھا اور روٹی کے ٹکڑے کیے جائے اسے سونے کے سکوں کی تھیلی ملتی تھی۔ تب کہیں اس مکان کے سر سے بلا ٹلتی تھی۔

لیکن یہ بات ابھی تک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ آیا یہ حسن کا ذاتی طریقہ عمل ہے یا محض ان لوگوں کی چال ہے جو اس کے ملازم یا پیرو ہیں۔ ہم نے اسے گھیرنے اور پکڑنے کی بہت کوششیں کیں۔ مگر بے سود۔ اس کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ رے کے دارالکتب میں بے دھڑک داخل ہوا۔ نظام الملک سے بالمشافہ گفتگو کی

......اس کی صورت بھی کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ ہم نے اس کی مستقر کا پتہ لگانا چاہا۔ لیکن وہ اس طرح غائب ہو گیا جیسے ریگستان کی سطح پر برف۔

تھوڑے ہی دن سے اصفہان میں یہ ڈرانے، دھمکانے اور خوفزدہ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ باوجود انتہائی کوشش کے توتوش ان پانچ گم شدہ افراد کا پتا چلانے سے قاصر رہا تھا جو خراج ادا نہ کرنے کی پاداش میں گم ہو گئے تھے۔ اگر جعفرک کی طرح قتل کر کے ان کی لاشیں کہیں پھینک دی جاتیں تو صبر آ جاتا۔ ظلم و تشدد کی حد یہ تھیں کہ انہیں دن دہاڑے سر بازار اغوا کر لیا گیا تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ توتوش کا خیال تھا کہ شہر میں کسی مقام پر حشیشین نے اپنا اڈا قائم کر رکھا تھا لیکن اس کے پاس ظاہری طور پر اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا۔

''تو نے ان کا کیا نام لیا؟'' عمر نے پوچھا۔

''حشیشین...... حشیش (بھنگ) استعمال کرنے والے۔ یہی تو وہ جنس فاسد ہے جس کے زیر اثر وہ لوگ سنگین جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔''

عمر کو اس شراب کا خیال آیا جو اس نے الموت میں پی تھی۔ اسے وہ تین فدائی بھی یاد آ گئے جو قلعے کی فصیل سے چھلانگ لگا کر خلا میں گر پڑے تھے۔ بیشک، الموت کے رہنے والے حشیشین ہی تھے...... حشیش کے غلام۔

''شاید آج'' توتوش نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فقیر بھیک لینے

آئے گا۔ بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے اور اسے کچھ رقم ادا کر دی جائے۔"

"نہیں نہیں۔ وہ مجھے رقم ادا کرنے پر مجبور نہیں کریں گے۔"

"اوہو...... میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا۔ اقرونوس تاجر پہلے ہی سے حضور والا کے تجارتی قافلے کا مال واسباب اور نقدی لے کر فرار ہو گیا ہے۔ وہ آپ کی دولت کا خراج پہلے ہی وصول کر چکا ہے۔ تاہم وہ کچھ اور طلب کرنا چاہیں......"

"دراصل اس مرتبہ انہیں جعفر ک کی موت کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔"

تو توش نے اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے تسبیح پھراتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ "بہتر ہے کہ قہر کی آگ کو دوراندیشی کے پانی سے بجھا دیا جائے۔" "جناب والا ان کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟ بڑے بڑے مبلغ اور صاحب اقتدار رہنما عوام کے روبرو سعیتہ کے خلاف زہر اگل چکے ہیں لیکن بالآخر وہ چپ سادھنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ اگر اس سلسلے میں کبھی ان کی زبان کھلی بھی تو انہیں نے سعیتہ کی تعریف و توصیف ہی بیان کی۔ کون جانتا ہے کہ ایسا کیوں...... اور کیسے ہوا؟ گھنے جنگل میں سانپ کا بل کون تلاش کر سکتا ہے؟ یہ حشیشین ساربانوں، تاجروں اور درویشوں کے بھیس میں ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں۔ جناب والا کے محل سرا میں بھی ان کا ایک شخص اس وقت خدمت گار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔"

عمر کو معا اس خواجہ سرا کا خیال آیا جو قصر چک میں حرم کی نگرانی پر مامور تھا اور اسے یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید اس کے خادموں ہی میں سے کسی نے گزشتہ رات روٹی اور خنجر مع پیغام کے اس کے سرہانے رکھ دیئے تھے۔

قزوین اور رے کے عقبی کوہستانی علاقے پر انہوں نے پہلے ہی سے خوف طاری کر رکھا ہے۔ ان کے مخبر نیشا پور پہنچ چکے ہیں اور یہاں اصفہاں میں بھی دیز کہ کی چوٹی پر قدیم آتش کدے کے کھنڈروں میں انہیں دیکھا گیا ہے۔ اور اصفہان کے یہ پانچ افراد کس طرح غائب ہوئے؟ کاش میں یہ معلوم کر سکتا! انہیں کھلم کھلا قتل نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ انہوں نے چیخ پکار بھی نہیں مچائی۔ ان کا کوئی پیغام بھی موصول نہیں ہوا۔ وہ اصفہان کی شہر پناہ سے باہر بھی نہیں گئے۔ کوئی نشانی ایسی نظر نہیں آتی جس کی مدد سے ان کا سراغ لگایا جا سکے۔ یہ بڑا سنگین واقعہ ہے۔ عالیجاہ دانشمندی سے کام لیجئے اور جبال کے حا.........سا...... کے آدمیوں سے الجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔''

''وہ جادو اور فریب سے کام لیتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی انہی کی طرح رازداری کے ہتھیار سے ان پر حملہ کیا جائے۔''

''آپ...... آپ ان کا سراغ لگائیں گے؟''

''نہیں۔ وہ خود ہی سامنے آجائیں گے۔''

توتوش جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے خیال آیا کہ اس میں کوئی کلام نہیں عمر خیام بھی ایک پوشیدہ قوت کا مالک ہے اور وہ جادو کا جواب جادو سے دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن توتوش اس آویزش سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ ''عالیجاہ!'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''یہ سب کچھ اس وقت آپ کے گوش گزار کر کے میں نے پہلے ہی اپنی زندگی خطرے میں ڈال لی ہے۔ مخفی قوتوں کے معاملے میں بھی میں

..........میں کوراہوں۔اب مجھے اجازت دیجئے!''

جمعہ کی شام کو جب آفتاب عالم تاب حجلہ مغرب میں داخل ہو گیا اور اندھیروں نے اجالوں پر غالب آ کر ستاروں کی شوخ کرنوں کو رخصت تنویر عطا کی تو عمر دبے پاؤں ایک چور دروازے سے نکل کر باہر آ گیا۔صرف عائشہ کو اس بات کا علم تھا کہ اس نے اپنی ہیئت تبدیل کر لی تھی۔ ایک شخص بڑے چوک سے گزرا۔ وہ صحرا نژادوں کی طرح لہرا کر چل رہا تھا۔قبیلہ قریش کے عربوں کی طرح اس نے سیاہ جلابیہ باندھ رکھا تھا۔ڈھیلی ڈھالی اونی عبا میں اس کا جسم چھپا ہوا تھا اور ایک چھوٹا خمدار خنجر اس کی کمر سے لٹک رہا تھا۔عقال چہرے کو چھپائے ہوئے تھا۔حتیٰ کہ اس کی آواز سے بھی قبائلیوں کی سی کرختگی ہویدا تھی۔

دو گھڑی رات گئے،عشاء کی نماز کے وقت عمر سینکڑوں نمازیوں کے ساتھ جامع مسجد میں موجود تھا۔نماز کے بعد وہ ہجوم کے ہمراہ مسجد سے باہر آیا اور گھوم کو مسجد کی پشت والی گلی میں داخل ہو گیا۔ کچھ لوگ اس کے آگے جا رہے تھے۔گلی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔اس نے یہ دیکھنے کے لیے اپنی رفتار سست کر دی کہ کتنے لوگ گلی کی بائیں جانب مڑ کر ایک مخصوص دروازے میں داخل ہو رہے ہیں۔

ایک آدمی ہاتھ میں عصا لیے اندھوں کی طرح اوپر کو منہ اٹھائے دہلیز پر بیٹھا تھا۔ عمر اس کے عین سامنے جا کر رکا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا۔''کیا ابن العطاش کا مکان یہی ہے؟''

''ہاں۔اے رفیق صحرا!ابن العطاش سے تجھے کیا کام ہے؟''

''میں نے سنا ہے کہ یہاں ایک شخص بہشت کے حالات بیان کرتا ہے۔''

اندھا ہنسی روکنے کے انداز میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پھدکا۔ او ہو ہو............ جنت کا حال۔''

وہ یہ کہہ کہ خاموش ہو گیا اور عمر اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا اندر چلا گیا۔ قریب ہی کہیں کوئی شخص لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا لیکن نظر نہ آتا تھا۔ عمر کے پھیلے ہوئے بازو ایک بھاری پردے سے مس ہوئے جس کھینچ کر اس نے ایک طرف سرکا دیا۔ ایک دم کسی نے ایک روشن شمع اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔ ایک دبلا پتلا درویش عمر کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ اس جائزے سے مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ اس نے عمر کو ایک دوسرے پردے کی طرف جانے کا اشارہ کیا جو اس کی پشت کی طرف لٹک رہا تھا۔ پردہ ہٹا کر ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہو گیا جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ سب ایک قالین کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جو ان سے خاصے فاصلے پر لٹک رہا تھا۔

اس قالین کے سامنے ایک مجذوب آہستہ آہستہ ناچ رہا تھا اور بلند آواز سے رو رو کر اپنا سینہ پیٹتا جاتا تھا............ ایک نیم دیوانہ سا، آوارہ گرد، چیچک رو درویش، جس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔ رقص کی حالت میں شہادت حسینؓ پر نوحہ خوانی بھی کرتا جا رہا تھا۔

پیوست زمیں ہو اس طرح پاک لہو

اے چرخ فلک تفو بر تو تفو

افسوس ہوں یوں قتیل خنجر جفا حسینؑ "

اے وائے شہید کربلا حسینؑ "

حسینؑ حسینؑ حسینؑ

یہ کہہ کر وہ پھر اپنی چھاتی کوٹنے لگا۔

عمر کے لیے یہ نوحہ خوانی نئی نہ تھی۔ مجذوب کی سمت بڑھتے ہوئے اس نے مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی وہاں اسے کوئی ایسی بات نظر نہ آئی جس سے مقتولوں کا سراغ لگانے میں مدد مل سکے۔ سامعین میں کچھ عام شہری تھے۔ چند سپاہی اور ملا بھی وہاں بیٹھے نظر آرہے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک عجیب انتظار و اضطراب کیفیت میں مبتلا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے ہاتھوں سے مجذوب کی آواز کی لے پر بھڑکے ہوئے جذبات کے زیر اثر تال بھی دیتے جارہے تھے۔

جلتے ہوئے عود کا دھواں ایک انگیٹھی سے بلند ہو کر ساری فضا کو معطر کر رہا تھا۔

اے وائے حسینا،

اے وائے حسینا

مجمع نے ایک آواز ہو کر دہرایا۔ ساری فضا اس نوحے سے گونج اٹھی۔

آہستہ آہستہ کمرہ سامعین سے بھر گیا۔ اور مجذوب نے اپنا رقص بند کر دیا۔

''لوگو ادھر دیکھو!'' مجذوب کی آواز گونجی۔ مردہ گفتگو کرنے والا ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دبیز پردہ ایک طرف سرکا دیا۔ جو ایک طویل سلاخ کے سہارے لٹک رہا تھا۔ پردہ ہٹتے ہی ایک محرابی دروازے میں سے ایک دوسرا کمرہ

نظر آنے لگا جہاں چراغ دان کے پیچھے ایک بہت بڑا برنجی طشت رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ طشت خون سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ طشت کے بیچوں بیچ انسانی چہرہ رکھا تھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور سر منڈا ہوا تھا۔

ایک دم مجمع سے حیرت و استعجاب کی آوازیں بلند ہوئیں۔ زرد رنگ کا چہرہ طشت میں بے حس و حرکت سیدھا ٹکا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک عام انسان کا چہرہ نظر آتا تھا۔

''خاموش!!'' درویش نے کرخت لہجے میں ہدایت کی اور...... پھر...... چہرے کی بند آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ اور دائیں بائیں گردش کرنے لگیں۔ اس وقت مجمع کو خاموش رہنے کی ہدایت کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کمرے میں یکا یک سناٹا چھا گیا۔

طشت میں رکھے ہوئے چہرے کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ''مسلمانو! اس کا قصہ سنو جو نظروں سے پوشیدہ ہے۔''

''یا اللہ'' عمر کے قریب بیٹھے ہوئے ایک ملا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

جب وہ چہرہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور ایک ایک کر کے جنت کے راز بیان کر رہا تھا تو عمر دوسرے سامعین کے برعکس، سننے کے بجائے اسے غور سے دیکھنے میں منہمک تھا۔ عمر نے قطعی طور پر یہ محسوس کیا کہ آواز اس گلے سے آ رہی ہے جو طشت کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اور بلا شبہ وہ ایک زندہ انسان کا چہر تھا۔ جس کا جسم نگاہوں سے اوجھل تھا۔

اس طشت کے سوا شہ نشین میں اور کوئی چیز نہ تھی۔ دیواروں پر چاروں طرف پردے پڑے تھے...... آواز خاموش ہو گئی۔ کھلی آنکھیں بند ہو گئیں اور چہرہ دفعتاً کرخت ہو گیا۔ درویش نے ایک جھٹکے کے ساتھ دبیز پردہ کھینچ کر شہ نیشن کو ایک دفعہ پھر ناظرین کی نگاہوں سے چھپا دیا۔

''کرامت'' ایک حیرت زدہ ملا کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''اعجاز''''ایک لطیفہ غیبی!'' آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی طرف غیبی اشارہ۔ بہت سے لوگوں نے بڑے مودبانہ لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ حاضرین میں پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی اور وہ آزادی سے سانس لینے لگے۔ مگر بیشتر لوگ خاموش تھے۔ عمر نے اس حیرت و استعجاب کو شدت سے محسوس کیا جو ہنوز لوگوں پر طاری تھا۔ پھر لوگوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق بحث شروع کر دی۔ ضعیف الاعتقاد افراد کو یقین تھا کہ انہوں نے مردے کی آواز سنی تھی۔ مگر مذبذب لوگ اس بات کا ثبوت طلب کر رہے تھے کہ آیا وہ کسی زندہ انسان کا چہرہ نہ تھا۔

درویش ایک استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سب کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''ثبوت! واللہ اگر یہ معجزہ ہے تو اس کا ثبوت ملنا چاہیے۔''

''خاموش'' درویش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''تمہیں ثبوت بھی مل جائے گا۔''

ایک لمحہ خاموش رہ کر اس نے بات کا اندازہ لگا لیا کہ ہر شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور دبیز پردے کو ایک بار پھر سرکا دیا۔ وہ جھکا اور چہرے کے دونوں کان پکڑ

کر اسے اوپر اٹھالیا آہستہ آہستہ چاروں طرف گھمایا تاکہ ہر شخص اسے دیکھ سکے۔ اور پھر خون سے بھرے ہوئے طشت میں رکھ دیا۔

یہ دیکھ کر ایک ملا فوراً سجدے میں گر پڑا اور مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا...... یہی تو وہ چہرہ تھا جو ابھی بول چکا تھا...... خالی چہرہ۔ بغیر جسم کا چہرہ......

''ہم قائل ہو گئے! ہم نے اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

عمر اٹھا اور بڑھ کر دبیز پردے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے دوستو!'' اس کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی۔ ''یہ کوئی معجزہ یا کرامت نہیں ہے۔ یہ تو محض سڑکوں پر تماشا دکھانے والے مداری کی شعبدہ بازی ہے۔ یہ مردہ نہیں بول رہا تھا۔ بلکہ جو بول رہا تھا وہ اب مر چکا ہے...... اچھا لو دیکھو!''

بظاہر شعبدہ بازی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ لیکن سوائے شعبدہ بازی کے یہ اور کوئی چیز ہو بھی نہ سکتی تھی۔

عمر نے دبیز پردہ ہٹایا اور آگے بڑھ کر اس بے حس و حرکت چہرے کو مع طشت کے اوپر اٹھالیا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ طشت کے عین نیچے پتھر کے فرش میں ایک فٹ لمبا چوڑا سوراخ بنا ہوا تھا۔

مجذوب نما درویش مارے غصے کے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اصفہان کے باشندے جو اس وقت وہاں موجود تھے دوڑ کر عمر کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور

بڑی حیرت سے اس گڑھے کو دیکھنے لگے۔ عمر نے ایک قندیل اٹھائی اور شہ نشین پر لٹکے ہوئے سارے پردے ایک ایک کر کے ہٹا دیے۔ سامنے دیوار میں اسے ایک دروازہ دکھائی دیا۔ ایک ہاتھ میں قندیل لیے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی لو کو ہوا کی زد سے بچاتا ہوا وہ دوڑ کر اس دروازے میں داخل ہو گیا۔ چند گز راستہ طے کرنے کے بعد اس کے پاؤں پھسلنے لگے۔ پتھر کا فرش خون بہنے سے سیاہ اور گیلا ہو رہا تھا۔

''جان عزیز کی قسم، اے عرب! تو نے حقیقت کو پا لیا ہے۔'' عمر کے پہلو میں کھڑے ہوئے سپاہی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہاں ضرور کسی کو قتل کیا گیا ہو گا اور وہ چہرہ بھی تو ہنوز گرم ہے۔ لیکن اس کا جسم کدھر غائب ہو گیا۔''

سب لوگ عمر کے پیچھے آ رہے تھے۔ جب وہ عقبی کمرے کی تلاشی لے رہے تھے تو ہر شخص پر ایک نامعلوم سا خوف طاری تھا۔ آگے بڑھے تو چند سکونتی مکان نظر آنے لگے جن سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھلا ہوا دروازہ بھی دکھائی دیا۔ غالباً اس دروازے کو رات کے وقت آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ اس دروازے سے گزر کر ایک زینہ ملا۔ جب وہ زینہ طے کر کے نیچے پہنچے تو قندیل کی روشنی آخری سیڑھی کے بالکل نیچے ایک لاش پر پڑی، جس کا سر تن سے جدا تھا اور جو فدائیوں کی سفید عبا میں ملبوس تھی۔

''اوہو۔ اسے قتل کر کے یہاں پھینک دیا گیا ہے۔'' سپاہی نے جھلا کر کہا۔ ''بھائیو۔ ذرا دیکھ بھال کر آگے بڑھنا۔ کہیں تمہیں بھی آدم خود کتے نہ لپٹ جائیں۔''

جب سپاہی نے ایک اور بند دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہونا چاہا۔ تو اسے

اک شدید قسم کی بو آئی۔ جو عود کی خوشبو سے زیادہ تیز اور مختلف تھی۔ ''ارے! یہاں تو اور کئی لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ جن کے سرندارد ہیں۔ اف! خبیث کتو خدا تمھیں غارت کرے۔''

اس نے لاتیں مار مار کر دروازہ توڑ ڈالا اور روشن قندیل لے کر اندر داخل ہو گا۔ ایک، دو...... پانچ۔ لیکن ان کی ظاہری وضع قطع ایک دوسرے سے مختلف تھی۔

''نہیں نہیں۔ ذرا مجھے بھی دیکھنے دو۔'' ایک ملا کی آواز گونجی جو مجمع کو چیرتا پھاڑتا سب سے آگے پہنچ گیا تھا۔ ''خدا کی پناہ! یہ امین بیگ کی لاش ہے۔ اور وہ...... شیر افگن ہے جو اکثر مسجد میں آتا جاتا تھا۔ بے شک۔ یہ ان پانچوں آدمیوں کی لاشیں ہیں جو کچھ دن پہلے اصفہان سے مفقود الخبر ہو گئے تھے۔ ان کتوں کا سراغ لگانا چاہیے جنہوں نے ان کی جانیں لی ہیں۔

لیکن اس افراتفری میں درویش کو چپکے سے کھسکنے کا موقع مل گیا۔ اور مغلوب الغضب مجمع کو وہاں سوائے ایک نابینا بوڑھے کے اور کوئی نہ ملا۔ جو اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا اور اپنے مفرور ساتھیوں کو آواز دیتا جاتا تھا جو اسے اکیلا چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے تھے۔

عمر کو اس رات بالکل نیند نہ آئی جعفرک کی مسخ شدہ لاش کا تصور اسے رات بھر پریشان کرتا رہا۔ اسے ان پانچ امیروں کے قتل کا اتنا افسوس نہ تھا جعفرک کی موت سے وہ بے حد متاثر تھا۔ وہ جعفرک دربار مسخرا جس کی یاد سے نہ معلوم زندگی کی کتنی تلخیاں اور مسرتیں وابستہ تھیں۔ اور جو ایک کتے کی موت مارا گیا تھا...... خیام اندر

ہی اندر غصے سے کھولتا۔

صبح کے وقت سڑکوں پر جب حشیشین کو مارو پکڑو کا شور بلند اور...... تو توش اپنے گھوڑے کو بڑے جوش وخروش سے ادھر ادھر دوڑاتا پھر رہا تھا۔ نظام الملک نے اپنی خلوت سے نکل کر ملک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ "سلطان المعظم فوراً حکم فرمائیے کہ تمام ملک میں حشیشین یعنی سعیتہ کو جہاں کہیں بھی وہ ملیں ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے......" اس نے بڑی منت وسماجت کے ساتھ سلطان سے درخواست کی۔ "غور فرمائیے کہ دولت پناہ کی بہ نفس نفیس موجودگی کے باوجود ان کا سرغنہ کس طرح کھلے بندوں حضور کی رعایا سے تاوان وصول کر رہا ہے۔"

ملک شاہ کی نظروں میں سعیتہ کی حیثیت ایک اسلامی فرقے سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی ایک غیر معروف فرقہ۔ لیکن نظام الملک نے اس امر پر اصرار کیا کہ اس فرقے کا اصل مقصد تخت وتاج پر قبضہ اور حدود سلطنت میں خلفشار پیدا کرنا تھا۔

"نہیں" سلطان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ہر اس کتے کا پیچھا کروں جو میرے گھوڑے کے کھروں کو چاٹتا ہے۔ ان مذہبی دیوانوں کے پاس اتنا اسلحہ اور فوج کہاں ہے کہ وہ میرے لشکر کے ہزار تیغ آزماؤں کا بھی مقابلہ کرسکیں۔"

نظام الملک نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے قبضے میں ایک بہت مضبوط قلعہ ہے جو شمالی کوہستانی علاقے میں کسی جگہ واقع ہے اور وہاں انہوں نے اپنا خزانہ، اسلحہ اور دوسرا سامان جنگ محفوظ کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں پر اسرار حسن بن

صباح بہت پہلے نصیب دشمناں، سلطان کے زوال، اسلام کے ایک نئے دور اور روشن مستقبل کی پیشین گوئی بھی تو کر چکا ہے۔

''اگر میں ہر اس نام نہاد پیغمبر کو جو نئے دور کی پیشین گوئی کرتا ہے سولی دینا شروع کر دوں تو'' سلطان نے ترش رو ہو کر کہا۔ ''مجھے شکار کے لیے بھی مشکل ہی سے وقت مل سکے گا۔ اگر یہ حسن ایسا ہی بہادر ہے تو پھر کھل کر میدان میں آ جائے۔ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کے پانچ ٹکڑے نہ کر دوں تو بات ہے۔''

''لیکن اس کے قلعے کے متعلق کیا ارشاد ہے؟''

ملک شاہ نے چڑ کر تلخی سے جواب دیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کس مخبر کی داستان کا یقین کروں۔ تو توش اپنے سر اور اپنی داڑھی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ حشیشین کا نہ کوئی سرغنہ ہے نہ کوئی مخصوص گڑھ۔ اگر حسن اقتدار چاہتا ہے تو میری قلمرو میں اس قسم کے لاتعداد اشخاص ملیں گے...... اچھا اب تم جا سکتے ہو۔''

بوڑھے نظام الملک نے رخصتی سلام کرتے ہوئے کہا کہ ملک شاہ چونکہ ایک دفعہ اسے شک وشبہ کی نظر سے دیکھ چکا ہے اس لیے اب وہ اس کی کسی بات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔ ''بہر حال اگر عالیجاہ مناسب خیال فرمائے تو'' اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''ان کھنڈروں کا ایک جائزہ لے لیجئے جو اصفہان کے شمال میں دیز کوہ پر واقع ہیں۔ کیونکہ حشیشین کا یہ طریقہ ہے کہ وہ آپ کی قلمرو میں تمام بڑے شہروں کے قریب قلعہ بند مقامات پر اپنے اڈے بناتے ہیں اور انہیں دیز کوہ پر دیکھا بھی گیا

ہے۔''

ملک شاہ نے بھی اثنائے شکار میں ان بنجر پہاڑیوں پر ایک سنگین عمارت کے کھنڈر دیکھے تھے۔ اس بوسیدہ عمارت کے متعلق بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس جنات رہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے آتش پرستوں کا قدیم معبد سمجھتے تھے۔

''ٹھیک ہے'' ملک شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی وقت وہاں جا کر دیکھوں گا۔ میں پہلے ہی سے وہاں اپنی فوج کے لیے ایک چھاؤنی بنانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔''

کسی افسر یا مثلاً تو توش کو وہاں بھیجنے کے بجائے ملک شاہ نے عمر کو حکم دیا کہ وہ اصفہان سے مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ ہمراہ لے کر جائے اور اس ویران کھنڈر کا معائنہ کرے۔ اولاً تو عمر جو کچھ کہتا تھا سلطان اس پر اعتبار کرتا تھا اور اسے اپنے حق میں نیک فال سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے یہ افواہ بھی سنی تھی کہ عمر ایک دفعہ پہلے بھی ان اجنبی بے دینوں کی کسی پوشیدہ پناہ گاہ کا پتا لگا چکا ہے اور اپنی عقل و دانش کے ذریعے اس کا سحر باطل کر چکا ہے۔ اس سلسلے میں عمر جو کچھ بیان کرے گا اس پر یقین کرنے میں ی اسے کوئی تکلف نہ ہوگا۔

سلطان کے سپاہیوں نے اس ویرانے کا چپا چپا چھان مارا۔ تاریک گوشوں میں اپنے نیزے ڈال کر دیکھے لیکن انہیں حشیشین کا کوئی سراغ نہ ملا۔ چند گڈریے اور آوارہ گرد خاندانوں کے کچھ افراد انہیں وہاں ضرور نظر آئے جو ان کھنڈروں کو عارضی مسکن کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

وہاں کسی قسم کا چھپا ہوا اسلحہ بھی دستیاب نہ ہوا وہاں کے خوف زدہ باشندوں نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انہوں نے اس سے پہلے نہ تو ''الموت'' کا نام سنا ہے اور نہ حسن بن صباح نام کے کسی جھوٹے نبی کا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود عمر کو ایک عجیب قسم کا شبہ سا تھا۔ وہاں بالکل ایسی ہی ایک قربان گاہ تھی جیسی اس نے الموت میں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ اصفہان میں ابن العطاش کی حویلی حشیشین کے اڈے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ وہ چٹانوں کے درمیان ایک گہرے شگاف سے وہاں ایک چشمہ بھی ابل رہا تھا۔

یہ تمام آثار الموت کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ ان خانہ بدوش گلہ بانوں میں نوجوانوں کی خاصی تعداد ہے۔ عمر نے ایک ایک شخص کے چہرے کو غور سے دیکھا لیکن کسی کو پہچان نہ سکا۔

''اگر محترم خواجہ کی اجازت ہو تو کچھ عرض کروں'' ایک سپاہی نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ ''مدور مینار کی دیواروں پر کچھ شکلیں کھدی نظر آتی ہیں۔ خدا جانے! وہ دیوتاؤں کی شبیہیں ہیں یا جادو کے اشکال۔''

جب عمر گھوڑے سے اتر کر مینار کی پہلی منزل میں داخل ہوا تو مذکورہ سپاہی نے ان نقش و نگار کی طرف اشارہ کیا جو آدم بلندی پر دیواروں میں کھدے ہوئے تھے۔ مینار کی گولائی میں دیواروں پر چاروں طرف نقش نظر آ رہے تھے۔ بادی النظر میں ان کے اول و آخر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بہ یک نظر عمر کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ نقوش

کس قسم کے ہیں۔

ایک بہت بڑا عقرب، رامی (نواں برج) گوسفند جدی)..... غرض کے وہاں بارہ برجوں کی شکلیں موجود تھی جنہیں کسی نامعلوم ہاتھ نے نہ جانے کب دیواروں پر کھودا تھا۔ ہر شکل کے نیچے ایک ایک برنجی نوک نکلی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید کبھی ان پر کچھ چیزیں لٹکی ہوئی ہوں گی۔

عمر نے اپنے ہمراہیوں کو بتایا کہ وہ سب ستاروں (آسمانی برجوں) کی شکلیں ہیں جنہیں اسلام سے قبل کسی نے وہاں بنایا ہوگا۔

''تو پھر آقا'' اس سپاہی نے جس نے انہیں دریافت کیا تھا عمر نے کہا۔ ''یہ سب اعمال شیطانی کا نتیجہ ہے۔ اگر حکم ہو تو ہم انہیں موگریوں سے مسمار کر دیں۔''

''نہیں نہیں۔ ان سے کسی قسم کا برا اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔''

یہاں ان کی موجودگی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ عمر نے سوچا۔ یقین طور پر اس قدر احتیاط سے انہیں بیک وقت تو دیواروں کی سطح پر نگینوں کی طرح جڑا نہیں گیا۔ کسی وجہ سے تو انہیں بنایا گیا ہوگا۔ اس مینار کے بنانے والے آتش پرستوں ہی نے شاید انہیں دیواروں پر کھودا ہو۔ ممکن ہے ان کا تعلق کسی ایسی مذہبی تقریب سے ہو جسے اب دنیا بھول چکی ہے۔

مینار کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر ان بروجی اشکال پر نظر جمائے عمر نے آہستہ آہستہ اپنی جگہ گھومنا شروع کیا۔ اور اسے ان اشکال کا صحیح اندازہ ہو گیا جو برج حمل سے شروع ہو کر برج حوت پر ختم ہوتی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ غالباً مینار کے کسی

روشندان سے کسی خاص انداز سے سورج کی روشنی ان پر پڑتی ہوگی جس کی مدد سے موسموں کا شمار کیا جاتا ہوگا...... اس نے اپنی گردش کی رفتار اور بھی کم کر دی۔ اس کے ہمراہی بڑے حیرت و استعجاب سے اس کی اس حرکت کو دیکھ رہے تھے اور ساتھ ہی سوچ رہے تھے کہ شاید علم نجوم کا ماہر کوئی فوق الفطرت عمل کرنے میں مصروف ہے۔

یکا یک عمر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''خواجہ! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' شکلیں دریافت کرنے والے سپاہی نے عمر سے پوچھا۔ ''کیا ان میں کوئی پیغام پوشیدہ ہے؟ کیا ہمارے قدموں کے نیچے کوئی خزانہ دفن ہے؟''

''پیغام'' عمر نے جواب دیا۔ ''خدا کی طرف سے ہے اور اسے اس وقت بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

بہت ادب سے ''امان''۔ ''امان'' کہتے ہوئے وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ عمر مینار سے باہر نکل آیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کٹر سے کٹر ملا سے بھی یہ تسلیم کرا سکتا تھا کہ زمین گردش کرتی ہے۔

اس وقت اس نے جعفرک کی موت کا غم دل سے بھلا دیا۔ حشیشین کے خیال کو دماغ سے نکال دیا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے اس کی کوشش کی کہ اسے کسی طرح ملک شاہ سے بیت النجوم واپس جانے کی اجازت مل جائے تاکہ وہاں پہنچ کر وہ اپنے اس نئے نظریے کا علمی تجربہ کر سکے۔

تقدیر کا پہیہ آہستہ آہستہ گردش کرتا رہا۔ انسانی زندگیاں مقررہ وقت پر اس طرح

ختم ہوتی رہیں جیسے تیز ہوا چراغوں کی روشنی اڑا لے جاتی ہے۔ نئی نئی ننھی جانیں روتی چیختی دنیا میں آتی رہیں۔

سلطان نیشاپور کی جانب سفر کر رہا تھا۔ شاہی فراش ہر شام استراحت سلطانی سلطان کے لیے بلند خیمے نصب کرتے، ہر صبح انہیں اکھاڑ کر لپیٹتے اور آگے بڑھ جاتے۔

نظام الملک اپنی کتاب کے نئے ابواب لکھنے میں مصروف تھا۔ وقت کا پہیہ آہستہ آہستہ گردش کرتا رہا۔ کچھ لوگ عزت و افتخار حاصل کرتے رہے، کچھ ذلت و رسوائی کا شکار ہوتے رہے، کچھ مسرت و شادمانی سے لطف اندوز ہوتے رہے، کچھ رنج و مصائب کا...... سلطان کے پڑاؤ کے عین اوپر ایک دمدار ستارہ نمودار ہوا۔ ملک شاہ نے فوراً عمر کو طلب کیا تاکہ وہ اس کے اثرات کی تشریح کر کے فال نکالے۔

"یہ مصائب کی نشانی ہے" منجم نے سلطان کو بتایا۔ آگ کی طرح یہ روشن ستارہ مغربی کی طرف سے برج عقرب میں داخل ہوا ہے۔ ملک شاہ نے بھی دیکھا کہ ایسا ہی تھا۔ اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے ایک امیر کو حکم دیا کہ وہ فوج کی ایک بھاری جمعیت لے کر قزوین کے عقب میں شمالی کوہستانی علاقے میں جا کر حشیشین کے صدر مقام یعنی قلعہ الموت کو تلاش کرے اور اسے بالکل مسمار کر دے۔

ملک شاہ کے خیال میں فی الوقت وہی سب سے بڑا خطرہ تھا۔ اور حقیقتاً حسن مصر سے آیا تھا۔ جو سلجوقی مملکت کے مغرب میں واقع تھا۔ جنگجو ترک، اس وقت ایک لمحے کے لیے خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے شکار کے بہانے نیشاپور جانا ملتوی

کر دیا تھا۔ اور کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گیا تھا۔ ایسی صورت میں بھلا وہ عمر کو وہاں سے کہیں جانے کی اجازت کیوں دیتا۔

پورا ایک مہینہ گزر گیا اور جب نیا چاند ایک روپہلی لیچھے کی طرح آسمان پر نمودار ہوا تو شاہی پڑاؤ میں حشیشین کی تلواریں میان سے نکل چکی تھیں۔

آدھی رات کا عمل تھا۔ ایک نوجوان ویلمیوں کا سا لباس پہنے فریادیوں کی طرح روتا پیٹتا امرا کی خیمہ گاہ میں وارد ہوا اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا اس نے نظام الملک کے خیمے میں داخل ہو کر تلوار کے ایک ہی وار میں بوڑھے سیاست دان کا کام تمام کر دیا۔ فوراً ہی اسے محافظوں نے آلیا اور اس کی تکابوٹی کر کے رکھ دی۔ لوگوں نے سنا کہ وہ اس خون خرابے کے دوران میں جنت کے متعلق کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''بے شک'' ملک شاہ نے بہت ہی فکر مندانہ لہجے میں کہا۔ ''ہم پر آفت نازل ہو کر رہی اور شگون پورا ہوا۔''

اس نے واقعی خلوص کے ساتھ نظام الملک کا سوگ منایا۔ اور اس فوج کو جو قلعہ الموت کی پہاڑیوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھی تیز رفتار قاصدوں کے ذریعے حکم بھیجا کہ قاتلوں کی جائے پناہ کو مسمار کرنے کی کسی کوشش میں کوتاہی نہ کی جائے۔

اس نے نظام الملک کی کتاب کا سر بمہر باب پڑھا اور اسے یقین ہو گیا کہ سعیتہ کا نیا مذہب واقعی اس کی حکومت کے لیے ایک شدید خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ملک شاہ نے عمر کے روبرو اس بات کا اعتراف کیا کہ ''نظام الملک واقعی ایک

وفادار خادم تھا۔ میں یہاں ایک ماہ قیام کر کے اس کا سوگ مناؤں گا۔"

عمر کی خواہش کے مطابق ملک شاہ نے اسے ایک ماہ کی رخصت مرحمت فرما کر، نیشاپور جانے کی اجازت دے دی۔

عائشہ کی معیت میں وطن واپس جاتے ہوئے عمر کو خیال آیا کہ دنیا میں کیسے کیسے طاقتور سلاطین میں گزرے ہیں۔اور اس خیال کو اس نے رباعی کے قالب میں اس طرح ڈھالا

این کہنہ رباط راہ کے عالم نامست
آرا مگہ ابلق صبح و شامست
ہنر ایست کہ واماندہ جمشید است
قصر یست کہ تکیہ گاہ صد بہر امست

قلعہ الموت کے نیچے پہاڑ کے دامن میں منجنیقیں اپنے بھاری بھرکم بازوؤں کو جنبش دے رہی تھیں۔ بڑے پتھر قلعے پر پھینکے جا رہے تھے جو قلعے کی دیواروں سے ٹکراتے اور پاش پاش ہو کر گردو غبار کے برقعے میں لڑھکتے ہوئے دریا میں جا گرتے تھے۔

آتش گیر روغن سے بھرے ہوئے آہنی برتن سنسناتے ہوئے ہوا میں اڑ کر قلعے کی چھتوں اور وسیع صحن میں پے در پے گر رہے تھے۔

الموت کی فصیلوں میں جواب میں نیزوں اور تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور اوپر سے بڑے بڑے پتھر نیچے منجنیقوں پر گرا کر انہیں ناکارہ بنا رہے تھے۔ شاہی

لشکر کو برابر کمک پہنچ رہی تھی لیکن محاصرین کی تمام کوششیں اس کوہستانی قلعے پر کوئی خاص اثر نہ کر سکی تھیں۔

کبھی کبھی حسن بن صباح قلعے میں چلتا پھرتا نظر آ جاتا تھا۔ کسی خفیہ راستے سے وہ بدستور باہر آتا جاتا رہتا تھا۔ قلعے سے باہر اس کی موجودگی کا اکثر علم بھی ہو جاتا تھا۔ راتوں کو اسے کے نمائندے رہے، نیشاپور اور بلخ جیسے دور دراز مقام تک سفر کرتے رہیت اور پریشان حال عوام میں یہ کہہ کر اور زیادہ ابتری پھیلاتے کہ سرخ دم دار ستارے کے اثر سے بہت جلد آفات کا نزول ہونے والا ہے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر پھسلاتے کہ جس ''مہدی'' کا مدتوں سے انتظار کیا جا رہا ہے، اس کے ظہور کا وقت اب قریب آ گیا ہے۔

خراسان کی عظیم شاہراہ پر درویش سادہ لوح کسانوں کو چپکے چپکے بتاتے پھر رہے تھے کہ جس دن کا وعدہ کیا گیا تھا وہ دن اب دور نہیں۔

مسجدوں اور کارواں سراؤں میں ہر جگہ نظام الملک کے قتل کا چرچا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ نظام الملک کو ملک شاہ کے حکم سے قتل کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اس بات پر مصر تھے کہ نہیں اسے کسی فوق الفطرت ذریعے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ وہ بوڑھا وزیر جو دو بادشاہوں کے عہد حکومت میں کامیابی کے ساتھ ملک کا انتظار کرتا رہا آج ایک قبر کے گوشے میں آسودہ تھا۔

بے اطمینانی اور خوف کا زہر بڑے شہروں کی حدود سے نکل کر سارے ملک میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اس پریشانی کی اصل وجہ کا کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود

پریشانی و بے اطمینانی طاعون کی طرح تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اگر ایسے وقت میں ملک شاہ رے یا اصفہان آ کر دربار منعقد کر لیتا تو عوام کی بے اطمینانی کی شدت میں بڑی حد تک کمی واقع ہونے کا امکان تھا۔

لیکن ملک شاہ کو اپنے سیر و شکار کے مشاغل ہی سے کب فرصت تھی۔ بسا اوقات وہ کئی کئی دن اپنے خیمے سے باہر نہ نکلتا۔ اس کے افسر یہ سمجھ رہے تھے کہ نظام الملک کی موت سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اس کی افتادِ مزاج سے ناواقف تھے۔

بیت النجوم میں عمر خیام ایک نئے نظریے پر غور کر رہا تھا۔ اس کے عملے کے ریاضی داں اور مہندس جو علم ہندسہ کے مخصوص مسائل پر کام کرنے میں مصروف تھے طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد اپنے آقا کی واپسی پر بے حد خوش تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ عمر اپنے جدید تجربے میں کھویا ہوا ہے جو بادی النظر میں انہیں بچوں کے کھیل سے زیادہ دل خوش کن نظر آ رہا تھا۔

وہ تجربہ بظاہر ایسا تھا جیسے اوپر سے ڈھکی ہوئی چینی قندیل سے روشنی اور سائے کا مطالعہ۔ جس کا اندازہ قندیل کے اندر جھانکنے سے ہوتا ہے اوپر سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

عمر نے اپنی رصد گاہ کے مدور مینار کی پہلی منزل کو بالکل خالی کر لیا تھا۔ قد آدم بلندی پر اس نے دیوار پر چاروں طرف الماری کا سا ایک خانہ بنا کر اس میں ایک سو چراغ روشن کر کے رکھ چھوڑے تھے الماری کے اس خانے کو چراغوں سمیت اس جھلی

سے منڈھا دیا تھا۔ اس جھلی پر ایک مصور سے بروج فلکی کی تصویریں بنوائی تھیں۔ اس طرح رات کے وقت جھلی کے اس مدور فیتے کے علاوہ کہیں اور سے روشنی آنے کی گنجائش نہ تھی۔

جب پہلی دفعہ چراغ روشن کئے گئے اور سب ریاضی دانوں اور مہندسوں نے وہاں آ کر دیکھا تو ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بجز اس کے کہ بروجی حلقے کے بارہ حصے جھلی کے پیچھے رکھے ہوئے چراغوں کی روشنی میں ضرور نظر آتے تھے۔ جنہیں ایک بچہ بھی آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

عمر نے مسکراتے ہوئے کہا: ''بیشک ایک بچہ وہ چیز دیکھ سکتا ہے جو ہماری نظر سے پوشیدہ ہے۔''

باوجودیکہ ریاض دانوں نے ہر پھر کے اسے دیکھا لیکن کوئی ایسی نئی چیز نظر نہ آسکی جو انہوں نے پہلی نظر میں نہ دیکھی تھی۔ آپس میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ سارا گورکھ دھندا اس کے علاوہ کوئی چیز نہ تھا کہ سلسلہ بروج فلکی کو بڑے ٹھیٹ انداز میں پیش کیا گیا تھا جس کے متعلق ہر شخص کو علم تھا کہ سورج، چاند اور دوسرے سیارے اس رستے سے آسمان کے واژگوں گنبد سے گزرتے ہیں۔ اس طرح مصنوعی روشنی کا انتظام کرنے کی عمر نے بیکار تکلیف گوارا کی تھی۔ اسے رات کے وقت آسمان پر ویسے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ بہر حال ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔

عمر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ بروج فلکی والے کمرے میں...... جسے اب

اس کے رفقا ''دیوان خانہ بروج'' کہنے لگے تھے...... چند کاریگروں کو اپنی نگرانی میں جگہ جگہ سے فرش کے پتھر اکھاڑنے پر لگا دیا۔ سوائے کاریگروں کے وہاں کسی اور کو کونے کی اجازت نہ تھی۔ ایک لکڑی کا شہتیر اور بہت سے تختے اندر لائے گئے۔ بڑھیوں نے اس شہتیر میں ایک سرے پر چند سوراخ کئے، ان سوراخوں میں لگانے کے لیے تختے بنائے گئے۔ اتنے لمبے لمبے تختے جو ایک بہت بڑی چکی میں لگائے جاتے ہیں۔ آخر میں سوائے دو کے باقی سارے کاریگروں کو رخصت کر دیا گیا۔ یہ دونوں کاریگر ''دیوان خانہ بروج'' کی زیریں منزل میں کئی دن تک مسلسل نہ معلوم کیا کام کرتے رہے۔

ایک دن جب عمر نے علامہ غزالی کو بیت النجوم آنے اور چینی قندیل کا تماشا دیکھنے کی دعوت دی تو عمر کے رفق ہکا بکا رہ گئے۔ امام غزالی اس وقت جامعہ نیشاپور کے مدرس اعلیٰ تھے۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

خاصی رات گئے مہمان آنے شروع ہوئے۔ ہر شخص ایک اشتیاق کے ساتھ وہاں آیا۔ کیونکہ اس سے پہلے جب کبھی عمر نے اپنے تجربات کا مظاہرہ کرنے کے لیے لوگوں کو بلایا تھا ہمیشہ خوش طبعی کا مظاہرہ کیا تھا۔

عمر کے مددگار ریاضی دانوں اور مہندسوں نے جامعہ سے آنے والے معزز مہمانوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ خصوصاً امام غزالی کو جو حسب معمول اپنی اونی عبا پہنے ہوئے تھے سب نے جھک کر سلام کیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس صوفی منش عالم کے عزو وقار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور اب وہ حجتہ الاسلام کے لقب سے

یاد کیے جاتے تھے۔ بیت النجوم کے عملے کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ عمر امام غزالی جیسی شخصیت کو برج فلکی کے اس روشن سلسلے کے دیکھنے کی دعوت دے گا۔

عمر نے اس عظیم صوفی کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔ اور اپنے ہاتھ سے فواکہ اور شربت ان کی خدمت میں پیش کیے۔ نوجوان اسلامی قائد نے بھی پروقار انداز میں جواب دیا۔

''میں نے سنا تھا'' امام غزالی نے فرمایا کہ

''کس طرح جناب والا نظام الملک کی ...... خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے .... نگرانی اور سرپرستی سے روگرداں ہو کر باہر تشریف لے گئے تھے اور اصفہان کے قیام میں آپ نے کفار کے طریق پر کس طرح اعمال سحر کا مظاہر کیا تھا۔''

''اس سے قبل'' عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرے متعلق نہ معلوم کتنے قصے بیان کیے جاتے رہے ہیں۔ لیکن میری خواہش ہے کہ حجتہ الاسلام کو آج کی شب جو چیز میں دکھانی چاہتا ہوں اسے ملاحظہ فرما کر وہ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ براہ کرم میرے ہمراہ تشریف لائیے۔''

''بسم اللہ'' امام غزالی نے جواب دیا۔

جب وہ مینار کی پہلی منزل میں داخل ہوئے تو منجم کے رفقا اور بزرگ صوفی کے ہمراہی اور معتقدین خاموش کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ دیوان خانے میں سوائے

اس روشنی کے جو جھلی کے مدو غلاف سے چھن چھن کر آ رہی تھی کسی اور روشنی کا انتظام نہ تھا۔ عمر کے اشارے پر باقی سب لوگ دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گئے۔ صرف دونوں قائد کمرے کے وسط میں کھڑے رہے۔

"کیا آپ بائیں طرف سے داہنی طرف گھوم کر یہ بتا سکیں گے کہ یہ کیا ہے؟" عمر نے امام غزالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ یہ سلسلہ بروج فلکی ہے۔ وہ برج حمل ہے اور وہ برج ثور ہے اور وہ برج حوت کی شکل ہے۔ مجھے تو سوائے بارہ بروج فلکی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی جنہیں سلسلے وار ترتیب دیا گیا ہے اور بس۔" امام غزالی نے جواب دیا۔

عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب حجتہ الاسلام براہ کرم وسط میں نہیں بلکہ لکڑی کے اس گول ٹکڑے پر کھڑے ہو جائیں ...... ہاں۔ اس طرح پہلے برج کی طرف منہ کر کے۔"

سب لوگ بڑے اشتیاق کے ساتھ آگے جھک کر حیرت آمیز خاموشی سے اس عمل کے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ جھلی کے روشن سرپوش کے سائے میں وہ نصف کے قریب چھپے ہوئے تھے۔ خود امام غزالی سنجیدگی اور قدرے لاپروائی سے کھڑے تھے۔

"اب" عمر نے پست آواز میں کہا، آپ بغیر ہلے جلے۔ یہاں کھڑے رہیے۔ اور جو کچھ پیش آئے اسے حظ فرمائیے آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ البتہ یہ مدور کمرہ آپ کے گرد گھومنے لگے گا۔" اور یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔

امام غزالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی انہوں نے سوچا کہ بھلا یہ کس طرح ہوسکتا تھا۔ انہوں نے اسے محض مذاق سمجھا اور ایک گہرا سانس لے کر انتظار کرنے لگے...... جھلی کا روشن فیتا پیچ گردش کررہا تھا۔

انہوں نے اپنے قدموں کے نیچے کسی چیز کو چٹختے اور دبتے ہوئے محسوس کیا۔ ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور بے ساختہ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ایک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ سارا گول کمرہ گھومنے لگا۔ جھلی پر بنے ہوئے بروج کی شکلیں ایک ایک کرکے نظر کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ وہ گردش رک گئی اور امام غزالی گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑے۔

''واللہ...... کیا تماشا تھا۔ واقعی یہ ساری عمارت اپنی بنیادوں پر گردش کررہی تھی بہر حال میں اسے گردش کرتے دیکھ رہا تھا۔''

عمر نے خاموشی سے بزرگ صوفی کو اٹھنے میں سہارا دیا۔ ان کے تمام معتقدین بھی ساتھ ہی دوڑ پڑے۔

''پیرو مرشد'' ایک شخص نے کہا۔ ''آپ یقین فرمایئے کہ یہ کمرہ اپنی جگہ قائم تھا۔ ہم نے آپ کو صرف آہستہ آہستہ گردش کرتے دیکھا اس کے بعد آپ زمین پر تھے۔

''نہیں نہیں۔ میں نے مطلق حرکت نہیں کی۔''

''بے شک، آپ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلے۔'' عمر نے بھی امام غزالی کو اس بات کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ آپ اپنی جگہ کھڑے کھڑے ایک جگہ گھوم گئے تھے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اتنی بڑی عمارت ایک پہیے کی طرح گھوم بھی کیسے سکتی

تھی۔"

"لیکن کس طرح............"

"شہتیر کے اس سرے کو چکی کے دستے کی طرح نیچے سے تو گھمایا جا سکتا ہے۔ جب میں نے تالی بجائی تھی تو میرے ملازمین نے نیچے جا کر شہتر میں لگے ہوئے دستوں کو حرکت دینی شروع کر دی تھی۔"

"تو پھر" امام غزالی نے اپنی عبا کا دامن سمیٹتے ہوئے ترش روئی سے کہا۔" میرے ساتھ یہ طفلانہ شعبدہ بازی کرنے کا کیا مقصد تھا؟"

"اس لیے کہ آپ ہم میں سب سے زیادہ عقلمند تسلیم کیے جاتے ہیں اور میں آپ کی زبان سے صرف وہ بات سننا چاہتا تھا جو آپ نے ابھی ملاحظہ فرمائی تھی۔ اچھا اب سنیئے......پہلی مرتبہ آپ ساکت اپنے قدموں پر کھڑے رہے تھے۔ دوسری مرتبہ آپ بغیر حرکت کیے ہوئے گھومنے لگے تھے۔ اور جیسے جیسے آپ گھومے آپ کی نگاہوں کی سامنے بالترتیب بروج کی شکلیں آتی رہیں۔ لیکن اس کے ساتھ دوسری مرتبہ آپ کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ تمام عمارت گردش کر رہی تھی۔ آخر ایسا کیوں محسوس ہوا؟"

"کیونکہ میں اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلا......میرے ساتھ شعبدہ بازی کی گئی تھی۔ یہی وہ بات تھی جو نار نے تمہیں سکھائی تھی؟"

"ہر شب......" عمر نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ آپ کہکشاں اور بروج فلکی کے قدرتی سلسلہ نجوم کو اپنے سر کے اوپر سے گزرتے دیکھتے ہیں۔ اور

جیسا کہ آپ نے ابھی ارشاد فرمایا کہ آپ ساکت کھڑے رہے تھے۔ یہ تمام ستارے ہمارے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ یہ مغالطہ صرف ہمارے دماغ میں بسا ہوا ہے۔'' امام غزالی بالکل خاموش کھڑے غصے سے پیچ وتاب کھا رہے تھے۔اور ان کے معتقدین بے اعتمادی سے عمر کو بغور دیکھ رہے تھے۔

دراصل زمین گردش کرتی ہے...... بالکل ایسے ہی جیسے ابھی یہ شہتیر گھوم رہا تھا...... دن اور رات کے عرصے میں ایک طرف سے دوسری طرف گھوم جاتی ہے۔ امام صاحب! انسان صدیوں سے اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ آسمان زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ آنکھیں کھول کر حقیقت کا نظارہ کرتا۔ ممکن ہے نوزائیدہ بچوں کو اس کا علم ہو کہ وہ ساکت اور بے حرکت ستاروں کے نیچے حرکت کر رہے ہیں۔ تیزی سے خلاف میں چکر لگا رہے ہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے یہ سب کچھ ضرور دیکھتے ہوں گے۔ لیکن ہم سے بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔''

''نہیں'' بلند پایہ صوفی نے باآواز بلند کہا۔'' اللہ تعالیٰ نے زمین کو ساکن بنایا ہے۔ جو فضائے بسیط کے وسط میں قائم ہے۔''

ان کے تمام معتقدین نے یک زبان ہو کر ان کی تائید کی۔ اور ان میں سے ایک شخص نے ہمت کر کے کہا۔'' یہ سب شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہ تھا...... بجز اس کے کہ اے ماہر نجوم! تو حجتہ الاسلام کو اپنے قدموں میں گرا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ شیطانی شکلیں جو تو نے سامنے بنا رکھی ہیں محض بیکار ہیں۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اجرام فلکی گردش نہیں کرتے؟''

''ہاں! کیا ثبوت ہے؟'' سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''یہ بات بالکل صاف ہے۔'' عمر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تو پھر اس کی وضاحت کر۔''

مختصر اگر ذرا بے چینی سے عمر نے تفصیل بیان کرنی شروع کی۔ اس نے کہا کہ ساکت ستاروں کے مقابلے میں ''سیارے'' زمین سے زیادہ قریب ہیں...... مریخ، عطارد، زہرہ قریب تر، مہتاب اور بھی زیادہ نزدیک، اور سورج بھی، جب گرہن ہوتا ہے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ یعنی جب چاند زمین اور سورج کے درمیان سے گزرتا ہے یا زمین (کرۂ ارض) چاند اور سورج کے درمیان سے گزرتی ہے۔ لیکن جہاں تک باقی ستاروں کا تعلق ہے، جو بے حس و حرکت نظر آتے ہیں، وہ بہت دور آسمان کی بلندیوں پر واقع ہیں۔

''اس بات کا کیا ثبوت ہے؟'' کسی نے سوال کیا۔

''ایک شخص......'' عمر نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''رات کے وقت قاہرہ میں کھڑا ان ہزاروں ستاروں کو دیکھ سکتا ہے جو نیشاپور سے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زمین کے مختلف فاصلوں سے وسیع و عریض آسمان کے صرف ایک حصے پر چمکتے ہوئے ستاروں ہی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔''

عمر بڑے اعتماد سے گفتگو کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے بیان پر کامل یقین تھا۔ لیکن جب چند ریاضی دانوں کے چہروں پر بھی سنجیدگی کے آثار رونما ہونے لگے تو جامعہ کے طالب علم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر خاموش ہو گئے۔

''کچھ ستارے'' عمر نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو ہمیں نظر آتے ہیں جسامت میں اس سے ہزار گنا زیادہ ہیں اور کروڑوں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ وہ اس لیے چھوٹے نظر آتے ہیں کہ بہت دور ہیں۔ اور سورج چونکہ ان کے مقابلے میں زمین سے قریب ہے۔ اس لیے وہ بڑا نظر آتا ہے اور اس کی روشنی بھی خیرہ کن دکھائی دیتی ہے۔''

''اگر اسے سچ مان بھی لیا جائے'' سامعین میں سے ایک شخص نے کہا۔ ''تو بھی اس کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔ چھوٹے یا بڑے جتنے ستارے ہیں وہ سب گردش کرتے ہیں۔ یہی اللہ کی مشیت ہے۔''

''وہ گردش کر ہی نہیں سکتے'' عمر نے پرکون لہجے میں جواب دیا۔ ''کیونکہ اگر وہ زمین کے گرد چکر کاٹنے کے لیے حرکت کریں گے تو انہیں بے تھا خلا میں اس تیزی سے گردش کرنی پڑے گی کہ وہ خود بخود جل کر نابود ہو جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ہم آئے دن آسمان پر ستارے ٹوٹتے دیکھتے رہتے ہیں۔ جو اپنے مقام سے زمین کی سمت آتے آتے شعلوں میں تبدیل ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔''

''یہ سب کفر ہے'' ایک شخص نے چلا کر کہا۔ ''اے ایمان والو۔ کیا یہ بات اللہ کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ ایک پتھر کو آگ میں اور آگ کو ایک پتھر کی شکل میں تبدیل کر دے؟''

''بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے'' عمر نے کہا۔ ''اسی کی قدرت سے زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔ اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے اس فضائے بسیط میں

ایک دنیا سے دور دوسری دنیا قائم کر رکھی ہے۔ اسی کی قدرت سے ہم زندہ ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔'' اور اس نے ایک اضطراری انداز میں امام غزالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہم اس کی قدرت کے بھید نہیں جان سکتے۔''

''تمام علم'' امام غزالی ن جواب دیا۔ ''خدا ہی کی طرف سے ہے۔ خدا آفتاب کی مانند ہے اور ہمارے علم کی حیثیت دھوپ سے زیادہ نہیں۔''

''یک ذرہ ز حکم تو جہاں خالی نیست'' (جہان کا ایک ذرہ بھی اس کے حکم سے باہر نہیں ہے) آفتاب؟ آفتاب الکل اسی طرح پانی جگہ ساکت اور قائم ہے۔ جیسے میں اور آپ یہاں کھڑے ہیں۔ ہمیں بھی روز ازل ہی تخلیق کیا گیا تھا۔ ہمیں سورج سے کیا علم حاصل ہو سکتا ہے اگر ہم اسے اس طرح دیکھنے کی کوشش نہ کریں جیسا کہ وہ ہے؟'' عمر نے جوش میں آکر بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

یکایک محترم صوفی نے اپنے ہمراہیوں میں سے ایک شخص کو کنویں سے تازہ پانی لانے کا حکم دیا۔ جب پانی آگیا تو انہوں نے وضو کیا اور اپنی عبا درست کر کے کمرے سے باہر آگئے۔

''عمر خیام!'' امام غزالی نے کہا۔ ''تم نے جو کچھ کہا ہے اس پر پھر غور کرو۔ یہ کفر ہے۔ میں ستاروں کے فاصلے یا گرہن کے متعلق تمہارے بیانات پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے صاف الفاظ میں فرمادیا ہے کہ اللہ نور السموت والارض (اللہ زمین اور آسمان کا نور ہے)...... اللہ یھدی من یشاء (اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)۔ وقت کی پیائش سے

بھلا انسانی روحوں کا کیا واسطہ۔ میری طرف سے تمہیں یہ تنبیہ ہے۔''

''مجھے تنبیہ کی جا چکی ہے'' عمر کو ایک گزشتہ تنبیہ کا خیال آ گیا اور وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ کچھ عرصے قبل مجھے ایک تحریری تنبیہ موصول ہو چکی ہے جس میں مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں اپنی زبان دانتوں میں بند کر کے رکھوں۔ بہر حال میرا ارادہ ہے کہ کل میں جامعہ کی مجلس گاہ میں آ کر اپنی تمام عمر کے مطالعہ و تحقیق کا نچوڑ وہاں کے اساتذہ کے روبرو پیش کروں گا۔''

امام غزالی نے عمر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خیام! تم دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ لیکن انسان ہمیشہ تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ کون جانتا ہے کہ میرے نفس کا تار کب ٹوٹ جائے۔ اس لیے اب کہ یہ سانس آ رہا ہے میں چاہتا ہوں کہ جیتے جی اپنا علم دوسروں تک پہنچا دوں۔''

''یہ سب مذاق ہے۔ خیام! واقعی تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ کیونکہ جو کچھ تم نے ابھی کہا ہے وہ یا تو ایک شاعر کو زیب دیتا ہے یا پھر کوئی مسخرا ہی اس قسم کی باتیں کر سکتا ہے۔ میں خدا سے دعا کروں گا کہ تمہیں بروقت عقل سلیم عطا کرے۔''

جب امام غزالی اور ان کے ہمراہی رخصت ہو گئے تو عمر بہت دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ وہ سب واقعی اس سے ناراض تھے جس کا اظہار بھی انہوں نے کر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے عمر کی تمام باتوں کو مذاق کیوں تصور کیا۔

''آقا'' اس کے ایک مددگار نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے

روبرو حجتہ الاسلام کا گر پڑنا واقعی نامناسب تھا۔ یہ افسانہ اب سارے نیشاپور میں مشہور ہو جائے گا۔"

"اگر انہوں نے یہ نہ سوچا ہوتا کہ یہ سارا مینار گردش کر رہا ہے تو وہ کبھی نہ کرتے۔" عمر نے بے خیالی سے جواب دیا۔

"آپ جامعہ تشریف نہ لے جائیں۔ ممکن ہے وہاں کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔"

"اگر تقدیر میں یہی لکھا ہے تو میرے یا تیرے چاہنے سے وہ مٹ نہیں سکتا۔"

نیشاپور میں طرح طرح کی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ کوچ و بازار میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ سلطان کے منجم نے اپنی (شیطانی) قوتوں کا مظاہر کرنے کے لیے دھوکے سے حجتہ الاسلام کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا۔ اور وہ اپنے عمل سحر سے عوام کے محبوب امام غزالی کو تقریباً بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن امام غزالی نے آیات قرآنی پڑھ کر اس کے سحر کو رد کر دیا اور خیام مارے شرم کے خاموش ہو گیا۔ بعض لوگ یہ مشہور کر رہے تھے کہ عمر خیام نے جسمانی طور پر امام غزالی سے کشتی لڑ کر انہیں زمین پر گرا دیا تھا۔ کچھ لوگ بڑے وثوق سے یہ بھی بیان کرتے تھے کہ امام غزالی نے بیت النجوم میں ایک ایسی پوشیدہ مشین کا سراغ لگایا تھا جو دھماکے کے ساتھ پھٹتی ہے اور تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

یہ افواہیں نیشاپور کی حدود سے آگے بڑھنا شروع ہوئیں حتیٰ کہ قصر کوچک کے دربان اسحاق کے کانوں تک بھی اس کے آقا عمر خیام کے متعلق طرح طرح کی

افواہیں پہنچنے لگیں۔ ایک دن اون کے تاجروں کا ایک قافلہ جو بلخ جا رہا تھا اس کے سامنے سے گزرا۔ گزرتے ہوئے ایک شخص نے سواری پر بیٹھے بیٹھے جھک کر قصر کے دروازے پر تھوکا۔

''حرام خور!'' اسحاق نے بڑے تحکمانہ انداز میں چیخ کر کہا۔ ''خدا کرے تیرے باپ کی قبر پر کتیا بچے جنے۔''

''یہ مکا نجس کی تو دربانی کر رہا ہے۔ نپاک کتوں ہی سے بھرا ہوا ہے۔ ہاں! ابے...... کافر ہے...... تیرا آقا...... خوں آشام کافر...... حرام خور۔''

''کیا ہو گیا ہے تجھے۔'' اسحاق نے جو غیر متوقع طور پر یہ سب باتیں سن کر بھونچکا اور لاجواب سا ہو گیا تھا، اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس سے قبل جب بھی اس طرف سے کوئی کارواں گزرتا تھا تو مسافر شاہی منجم کے قصر کو بڑے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو لوگ تحفے تحائف بھی دے جاتے تھے۔ اسی لیے ایسے موقعوں پر اسحاق خاص طور سے دروازے پر آ بیٹھتا تھا۔

''تجھے کچھ خبر بھی ہے'' شتربان نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے خچر کو روکا اور اچک کر اس کی پشت پر ایک طرف ہو بیٹھا تاکہ اسحاق کا چہرہ اس کے عین مقابل ہو جائیں۔ ''پہلے تو میں نے سنا تھا کہ تیرے ملحد آقا نے اپنے منحوس مینار میں ایک گہری خندق کھود کر اسے گھاس پھونس سے ڈھک دیا تھا۔ تاکہ دھوکے سے انجان لوگوں کو اس میں گرا کر ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن ایک پاک طینت بزرگ نے...... جن کا نام میں اس وقت بھول رہا ہوں۔ لیکن سنا ہے وہ بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔ قرآنی

آیات پڑھ کر اس خندق پر دم کر دیں۔ جس سے آناً فاناً تمام شیطانی قوتوں کا استیصال ہو گیا۔ اس کے بعد سرائے کے مالک کی لڑکی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منحوس شخص نے جسے تو اپنا آقا کہتا ہے۔ جامعہ نیشاپور میں بڑے بڑے بارلیش علماء کے روبرو ایک دن اور ایک رات مسلسل تقریر کی۔ اور تقریر بھی کیسی۔ خدا کی پناہ خدا کبھی آئندہ کسی کو ایسی تقریر نہ سنوائے۔"

شتربان ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا اور اپنی خورجی میں سے انار نکال کر اسے چھیلتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ سیاروں نے اجرام فلک نے گردش کرنی چھوڑ دی ہے۔"

اسحاق نے اسے اس طرح غور سے دیکھا جیسے وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

"علاوہ ازیں......" مزے لے لے کر انار کے سرخ دانوں کا رس چوستے ہوئے خبر رساں نیا یک ہنکارا ابھرا...... "ہونہہ وہ کہتا تھا کہ سورج حرکت ہی نہیں کرتا۔ میں نے سمرقند میں چینی بزرگوں کی گفتگو بھی سنی ہے۔ جی ہاں۔ اور خانہ خدا کی زیارت کے لیے میں مکہ معظمہ بھی گیا ہوں، وہاں بھی اللہ کے نیک بندوں کو ہر قسم کی باتیں کرتے سن چکا ہوں، میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے مگر آج تک کسی عالم یا درویش کو یہ کہتے میں نے نہیں سنا کہ سورج طلوع وغروب نہیں ہوتا بلکہ آسمان میں ایک جگہ ٹکا ہوا ہے۔ خدا کرے تجھے کتے بھنبھوڑیں اور تیرے اس گھر پر شہیدان کربلا کا صبر پڑے۔"

چلتے چلتے اس نے اسحاق پر ایک اور چوٹ کی اور اپنے خچر کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ

گیا۔ اسحاق بے دلی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر زلیخا کی طرف چل پڑا تاکہ یہ منحوس خبریں اسے بھی سنائے۔

''میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں'' موٹی تازی باورچن نے اپنا فیصلہ سنایا ''کہ کائنات وائنات، کے متعلق بحث وحث کوئی فائدہ تھوڑا ہی پہنچے گا۔''

''واللہ! کیا نام لیا ہے''

''ارے تو پھر خائنات ہوگا۔ ایک ہی بات ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہمارے آقا پر ایسی کیا افتاد آپڑی ہے کہ لگاوت کی پیائش کرنے۔''

وہ باورچی خانے سے اٹھ کر حرم کی طرف چل پڑا جس کے دروازے پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ نیشاپور کی گرمی سے بچنے کے لیے اس وقت عائشہ قصر کوچک میں مقیم تھی۔ اس نے تفصیل کے ساتھ وہ تمام واقعات عائشہ سے بیان کیے جن کی وجہ سے سارا نیشاپور اس کے آقا کا مخاطب ہو گیا تھا عائشہ خاموشی سے سنتی رہی اور اس کے دل میں طرح طرح کے برے برے خیالات آتے رہے۔

''اگر ہمارے سرتاج کی یہ رائے ہے کہ سورج غیر متحرک ہے تو بے شک ایسا ہی ہے۔'' عائشہ نے وثوق کے ساتھ کہا۔ ''اگر انہیں اس حقیقت کا علم نہ ہوگا تو پھر کسے ہوگا؟

اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اس سے انکار نہیں کہ علماء سے بحث و تکرار کوئی مناسب فعل نہیں ہے لیکن جب تک عمر کو سلطان کو خوشنودی حاصل ہے کوئی بھی اس

کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اس کے دشمن زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ کتوں کی طرح اس کی سواری کے پیچھے پیچھے بھونکتے ہوئے دوڑتے رہیں اور بس۔

اسحاق حیران و پریشان واپس آ کر قصر کے دروازے پر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اور دور میدان کے کنارے پر سورج کی سرخ گیند کو غروب ہوتے ہوئے غور سے تکنے لگا۔ اس کی ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سورج بالکل اسی طرح نظروں سے روپوش ہو رہا تھا۔ جس طرح کئی سال پہلے وہ اس روز غروب ہوا تھا جب عمر خیام نے سلطان کے حکم سے نئی زیچ کا آغاز کیا تھا...... اسحاق نیا پنی خمیدہ انگلیوں پر گزشتہ سال شمار کیے۔ معلوم ہوا اس واقعے کو تیرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت بھی جبکہ نئی زیچ کو شروع ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا ملاؤں نے متفقہ طور پر اس سے بری فال نکالی تھی۔ بقول ان کے افق پر ''موت کے سرخ پھریرے'' اس وقت بھی اسی طرح لہرا رہے تھے۔ جس طرح موجودہ شام کے وقت افق پر گہری سرخ چھائی ہوئی تھی۔ اسحاق نے پھر اپنے یقین کا اعادہ کیا۔ نہیں! سورج میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اسحاق بدستور الجھن میں مبتلا تھا۔ وہ دروازے سے اٹھ کر سڑک پر آ گیا تا کہ نیشاپور سے آنے والوں سے مزید خبریں معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ ایک بردہ فروش نے اسے بتایا کہ خواجہ عمر حسب دستور بیت النجوم میں اپنے ریاضی داں مددگاروں کے ساتھ مصروف عمل تھا جامعہ نیشاپور ہنوز اس کی بعید از قیاس تقریر سے گونج رہا تھا۔ بردہ فروش نیک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تقریر کرتے

وقت غالباً عمر نشے کے عالم میں تھا۔ اگر وہ مشہد مقدس جا کر حضرت امام رضا علیہ السلام کے مزار مبارک پر حاضری دے تو اس کے گناہ کا کفارہ ادا ہو سکتا ہے۔

اتنے میں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا اور ایک سلطانی قاصد ہٹو بچو کا شور مچاتا، کسانوں اور گڈریوں کو راستے سے ہٹنے کی ہدایت کرتا سامنے سے گزرا۔ وہ سمرقند جا رہا تھا۔

''کیا خبر لے جا رہے ہو؟'' اسحاق نے چیخ کر اس سے دریافت کیا۔

تیزی سے دوڑتے ہوئے قاصد نے گردن موڑ کر اسحاق کو جواب دیا۔ ''بہت بری خبر ہے۔ سلطان کا انتقال ہو گیا۔''

ملک شاہ کی موت کی خبر بلخ سے بغداد تک اتنی تیزی سے عام ہو گئی جتنی تیزی سے دوڑتے ہوئے گھوڑے وہ فاصلے طے کر سکتے تھے۔ شکار کھیلتے ہوئے سلطان کی طبیعت ایک دم سے خراب ہو گئی تھی۔ معالجوں نے اپنی سی بہتیری کوشش کی۔ فصد بھی کھولی۔ لیکن سلطان جاں بر نہ ہو سکا تھا اور بغیر اپنا جانشین نامزد کیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

نیشاپور اور اصفہان کے سارے بازار بند ہو گئے۔ مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہوئے تمام کارواں شاہراہوں سے پلٹ آئے۔ مسلح فوجیں طاقتور امراء کی قیادت میں جگہ جگہ جمع ہونے لگیں۔ قلعہ الموت کا محاصرہ ختم کر دیا گیا۔ اس فوج کا کمانڈر ملک شاہ کے ایک لڑکے برکیارق کی افواج میں شامل ہونے کے لیے عجلت پہنچنا چاہتا تھا جسے مقتول نظام الملک کے ایک فرزند کی حمایت حاصل تھی۔

اسی اثناء میں خلیفہ بغداد نے ملک شاہ کے ایک دوسرے لڑکے محمود کو وارث تخت وتاج تسلیم کرلیا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا۔ جنگجو سپاہی دو مخالف کیمپوں میں تقسیم ہوتے رہے اور آخر کار خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

جیسے ہی قلعہ الموت سے محاصرہ اٹھا حسن بن صباح چپکے سے قاہرہ روانہ ہوگیا تاکہ وہاں جاکر حشیشین کے مصرف قائدوں سے صلاح و مشورہ کرے۔ ایران میں خانہ جنگی سے اس کے عزائم کو تقویت پہنچتی تھی۔ کیونکہ اس افراتفری میں اس کے حواریوں کو بے روک ٹوک پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ تخت خواہ برکیارق کو ملے یا محمود کو حسن بن صباح کا دونوں صورتوں کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اسی دوران میں وہ شام میں بھی قلعہ بند مقامات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے متعین نے اب کھلم کھلا اصفہان میں ویز کوہ پر قلعے کی مرمت شروع کردی تھی۔ قاہرہ میں حشیشین کے قائدین کے اشتراک سے اسے ایک عالمگیر حکومت کا خاکہ بھی تیار کرنا تھا۔

برسوں پہلے اس نے ایران کے معاملات میں ٹانگ اڑانی شروع کردی تھی اور پھر اس کے نمائندوں نے برکیارق کو قتل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ برکیارق اپنے مخالف پر زور بروز غالب آرہا تھا۔

ملک شاہ کی موت کی خبر سنتے ہی عائشہ نے اسحاق پر زور دیا کہ وہ اسے نیشاپور کے چھوٹے محل میں پہنچا دے جو کتاب فروشوں کے بازار اور باغ عام کے قریب واقع ہے۔ وہاں وہ عمر کے قریب رہ سکے گی۔ ان دنوں عمر بیت النجوم میں اپنا بیشتر وقت اقلیدس کے علم ہندسہ کی نظر ثانی کرکے اس کی شرح لکھنے میں صرف کرتا تھا۔

عائشہ نے مسلح محافظوں کی ایک جمعیت بھی ملازم رکھ لی تھی جن میں سے بیشتر عرب تھے۔ دبلے پتلے، مگر بلا کے بہادر، ایرانی کون ہیں کیا ہیں۔ انہیں اس سے قطعاً کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ انہیں تو پیٹ بھر کھانے اور تنخواہ کی کثیر رقم سے سروکار تھا۔ عائشہ نے تیز رفتار گھوڑے اور باربردار اونٹ بھی خرید لیے تھے۔ اسے قوی احساس تھا کہ عمر کا پشت پناہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ان کے پاس حفاظت کے لیے اپنے ذاتی محافظ ہوں اور اپنے گھوڑے بھی تاکہ ضرورت پڑنے پر بلا کسی تاخیر کے وہ نیشاپور سے فرار ہو سکیں۔ اسے ایرانیوں پر قطعی اعتماد نہ تھا جو بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح ہجوم کر کیا دھر بھاگتے تھے کبھی ادھر۔

عائشہ کو نیشاپور کے عوام میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہ ہوا بجز اس کے کہ اب عمر کے دردولت پر اس کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کا ہجوم نظر نہ آتا تھا۔ خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ امراء نئے سرے سے تعلقات پیدا کرنے اور نئے پیمان باندھنے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف نظر آتے تھے۔ مسجدوں میں بھی عوام کا موضوع گفتگو بغداد یا رے سے افواج کی آمد و روانگی تک محدود تھا۔ رات کے وقت شہر کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے اور گھڑ سوار پہرے دار سڑکوں پر مسلسل گشت کرتے تھے۔

البتہ اتنا ضرور ہوا کہ کچھ عرصہ گزرنے پر شاہی خزانے سے عمر کو تنخواہ ملنی بند ہو گئی۔ لیکن جب کبھی اسے اپنے تحقیقی عملے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی وہ اپنے

ناظرہ کے ذریعے بازار سے حسب ضرورت قرض لے لیتا۔ اور پھر عائشہ کے پاس تجوری میں زرو نقد خاصی مقدار میں موجود تھا جس کی حفاظت وہ بڑی سختی سے کرتی تھی۔

ایک مرتبہ اس نے عمر کو بہت سمجھایا کہ وہ برکیارق کے دربار میں جا کر شاہی آداب بجالائے۔ برکیارق بغداد کی فوجوں کو شکست فاش دے چکا تھا۔ عائشہ کے خیال میں پیشین گوئی کرنے کا یہ نہایت شاندار موقع تھا۔ آخر درباری معزی نے بھی تو اس فتح کی مبارک باد میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ شکست خوردہ فریق کو بھی چپکے سے ایک تسلی آمیز اور ہمت افزا نظم لکھ کر روانہ کر دی تھی۔ اور خصوصات ایسے موقع پر جیسا کہ عمر نے عائشہ کو بتایا تھا کہ عنقریب چاند گرہن ہونے والا ہے اور نیشا پور سے صاف دکھائی دے گا۔

لیکن عمر ملک شاہ کا سوگ منا رہا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس۔ نوجوان سلطان۔ ملک شاہ اپنی موت کے وقت زیادہ سے زیادہ انتالیس سال کا تھا۔ بچپن سے دونوں ساتھ رہے تھے۔ اب وہ رحیم، یاسمین اور جعفر ک سے جا ملا تھا۔ اللہ! وہ سب کہاں چلے گئے؟

اس نے ایک رباعی لکھی۔ لیکن عائشہ کو اسے سن کر بالکل لطف نہ آیا۔

یاران موافق ہم از دست شدند
دریائے اجل یکاں یکاں پست شدند
خور دیم زیک شراب در مجلس عمر

''لیکن اس سے برکیارق کی تعریف کا تو کوئی پہلو نہیں نکلتا۔'' اس نے اعتراض کیا۔ ''مردوں کے متعلق اس قدر سوچنے سے فائدہ؟ وہ سب اپنی اپنی قبروں میں آسودہ ہیں اور ان سے اب کیا منفعت پہنچ سکتی ہے۔ آپ ابھی چالیس سے کچھ ہی اوپر ہوں گے اور میں'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کے قوی کس قدر مضبوط ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ اس قدیم مینار میں بیٹھے کاغذ پر لکیریں کھینچتے رہنے کی بجائے دوسرے امیروں کی طرح سلطان کے ہم رکاب کیوں نہ ادھر ادھر جائیں؟''

''میں ایک مرتبہ ملک شاہ کی ہم رکابی کی عزت حاصل کر چکا۔ بس یہی بہت ہے نہیں نہیں۔ اب یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ عائشہ۔ چھوڑو اس قصے کو...... ہاں آج رات تم دیکھو گی کہ چاند گہنا کر کس طرح یکسر غائب ہو جاتا ہے۔''

''کیا عقرب سارے کے سارے کو نگل جائے گا۔'' چاند گرہن کا متوقع منظر دیکھنے کے اشتیاق سے اس کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔

''دیکھو گی تو پتا چل جائے گا۔''

عمر نے وہ ساری رات اپنے مینار کی چوٹی پر گزاری۔ عائشہ بھی نیشاپور میں اپنے محل کی چھت پر لیٹی عوام کے خوف و اضطراب کو غور سے دیکھتی رہی۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ اور جب اس کے روشن چہرے پر سیاہی بڑھنا شروع ہوئی تو تمام فضا شوروغوغا سے گونج اٹھی۔

اک دم سے قرنا پھونکے جانے لگے، نقارے پٹنے لگے، جھانجھ بجنے لگے اور مکانوں کی چھتوں سے عورتوں کی چیخوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عائشہ کی طرح ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ آسیب (شر کا دیوتا) خبیث نیت سے چاند کو ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سیاہی گہری ہوگئی۔ ملاؤں کا ایک گروہ ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے بلند آواز سے اسماء الٰہی کا ورد کرتا ہوا سڑکوں پر گشت کرنے لگا۔ تاکہ اسمائے پاک کی برکت سے چاند کی آسیب زدگی کا رد ہو جائے۔

سیاہی اور بڑھ گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ صحرا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ چیخوں کی آوازیں اور تیز ہوگئیں۔ جوشیلے مسلمان بھاگم بھاگ پیتل کی تھالیاں لا کر انہیں پیٹنے اور نعرے لگانے لگے تاکہ خبیث طاغوتی طاقت کو خوفزدہ کر کے آسمان سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود چاند کے روشن چہرے پر ظلمت غالب آگئی۔ سارا شہر تاریکی کے سمندر میں ڈوب گیا البتہ تیزی سے ادھر ادھر رقص کرتی ہوئی مشعلیں کبھی کبھی اس بحرِ ظلمات میں ننھے ننھے دیوں کی طرح تیرتی نظر آجاتی تھیں۔

اور پھر...... عائشہ یکا یک خوشی کے جوش میں چیخ اٹھی...... روشنی کی ایک رمق آسمان پر نمودار ہوئی۔ ایک نازک لچھے کے مانند۔ ڈھول اور جھانجھ ایک نئے جوش کے ساتھ بجائے جانے لگے...... اور آہستہ...... آہستہ...... شر کے دیوتا نے چاند کو، جسے وہ پورا نگل چکا تھا...... اگلنا شروع کر دیا۔

جب تک پورا چاند نہ نکل آیا شور و غوغا مسلسل بلند ہوتا رہا۔ عائشہ جو جذبات کی شدت سے تھک چکی تھی۔ اب ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ گئی اور جلد ہی نیند کے آغوش میں آسودہ ہو گئی۔ اس تمام ہنگامے کے دوران اسے ایک دفعہ خیال آیا کہ شاید عمر نے بھی اپنے مینار پر ڈھول پیٹا ہو لیکن پھر خود ہی اس نے اپنے اس خیال کی تردید بھی کر دی کہ بھلا عمر کب ایسا کرنے والا تھا۔

مذہبی جوش و خروش جو چاند گرہن کے موقع پر ابھر آیا تھا کچھ دیر قائم رہا۔ قضاۃ شہر کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور انہوں نے عمر کو پیغام بھجوایا کہ وہ اگلے دن ان کی مجلس کے روبرو پیش ہو۔ یہی نہیں بلکہ محافظوں کا وہ دستہ جو یہ پیغام عمر کے پاس لے کر آیا تھا اس وقت تک بیت النجوم کے سامنے پہرا دیتا رہا جب تک عمر مجلس قضاۃ کے روبرو حاضر ہونے کے لیے ان کی نگرانی میں وہاں پہنچ نہ گیا۔

سو اتفاق کہ عمر کو اس طلبی کی اطلاع قبل از وقت نہ مل سکی۔ اس کے تمام دوست اپنے اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے...... البتہ چلتے وقت اس کے معاونین نے اس سے یہ درخواست ضرور کی تھی کہ وہ معزز قاضیوں کو ناراضی کا کوئی موقع نہ دے۔ کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ قاضی ہونے کے لحاظ سے اسلام معاشرے میں انہیں ایک مسلم حیثیت حاصل تھی۔ اور صرف اس وقت تک کے لیے جب تک کہ اسے نئے سلطان کا قرب یا بہت ممکن خلیفہ کی خوشنودی حاصل نہ ہو جائے۔ مجلس قضاۃ کی جانب سے جو اعتراضات بھی اس پر کیے جائیں انہیں خاموشی سے تسلیم کر لے۔

جب عمر دیوان میں داخل ہوا تو بیک نظر اس نے اندازہ لگا لیا کہ جامعہ کا پورا عملہ فلسفہ اور دینیات کے سربراہوں سمیت ادھر سے ادھر تک دیوار سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔ آگے کی صف میں عمر کے روبرو سفید عمامے باندھے قاضیوں کے علاوہ حجتہ الاسلام غزالی اور مفتی شہر بھی تشریف فرما تھے۔ پورا کمرہ اس طرح کھچا کھچ بھرا تھا کہ قاضیوں کے سامنے دوزانو بیٹھنے کے لیے بھی اس کو بمشکل جگہ مل سکی۔

عمر اساتذہ کے مجمع میں تقریر کرنے یا مجلس جامعہ کو مشورہ دینے کے لیے وہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ تقریباً تمام چہرے جانے پہچانے تھے۔ عمر کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور اس نے سمجھ لیا کہ اس کے خلاف عدالتی تحقیقات کی جانے والی ہے۔

سب سے معمر قاضی نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کہہ کر کارروائی کا آغاز کیا۔

جب اسے فرد جرم پڑھ کر سنائی جا رہی تھی تو وہ دماغی طور پر چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ الفاظ کے بجائے مجلس قضاۃ کے ان جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو الفاظ کے پردے میں پوشیدہ تھے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ملک شاہ زندہ ہوتا تو بھلا ان کی کیا مجال تھی جو مجھے اس طرح طلب کرتے۔ ان تمام ملاؤں او عالمان دین کی آنکھوں میں جو وہاں موجود تھے اسے اپنے خلاف وہ قدیم نفرت صاف جھلکتی نظر آ رہی تھی جسے وہ نہ جانے کب سے چھپائے ہوئے تھے۔

ایک ملا نے عمر خیام سابق منجم سلطان مرحوم و مغفور کے خلاف با آواز بلند فرد جرم پڑھ کر سنانا شروع کیا۔

ملا نے کہا کہ سب سے پہلے تو عمر کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے جو تمام دنیا ے

اسلام کے مدارس میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہیں۔

اس کی تصانیف پر یہ اعتراض کہ...... وہ ساری کتابیں کافر یونانیوں کی تعلیمات کے مطابق تصنیف کی گئی ہیں...... اور یہ کہ ان کا مصنف ملحد ہے۔

اس نے بدیہی طور پر دوسرے مختلف طریقوں سے بھی اسلام کے مسلمہ عاقعد سے روگردانی کی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات کہ اس نے سلطان مغفور کو اس بات پر راضی کیا کہ مروجہ اسلام زیچ ترک کر دی جائے اور کفار کے طرز پر از سر نو جدید زیچ تیار کر کے رائج کی جائے۔

پھر اس نے قبرستان کے قریب اپنی رصد گاہ قائم کی ہے تا کہ وہاں قبروں میں آزادی سے چل پھر کر مردوں سے ناپاک اور خلاف شرع (روحانی) رابطہ قائم کر سکے۔ اس کے علاوہ وہ یہ کہہ کر بھی خدائے پاک کی بے حرمتی اور نافرمانی کا مرتکب ہوا ہے۔ کہ کرۂ ارض فضائے بسیط کا مرکز نہیں ہے اور وہ سیارے جن کے متعلق ازروئے حدیث بھی ثابت ہے کہ طلوع و غروب ہوتے ہیں۔ گردش نہیں کرتے۔ وہ تمام لوگ...... اللہ کے راستے پر چلنے والے...... جو یہاں موجود ہیں ان سب نے اس ملحد کو یہ کلمات کفر ادا کرتے ہوئے سنا ہے۔ صرف یہی ایک بات اس کے خلاف عدالتی تحقیقات کے لیے کافی ہے۔ ملا نے اپنے بیان ختم کرتے ہوئے کہا کہ حقیقتاً یہ تمام الزامات بحث و تفصیل کے محتاج نہیں۔ اور مسلمہ حقائق پر مبنی ہیں۔ اور ان میں سے ہر الزام کے ثبوت میں سینکڑوں گواہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مجلس کے سامنے صرف یہ مسئلہ ہے کہ عمر خیام کی تصانیف کے لحاظ کیا طرز عمل اختیار کیا جائے اور خود

ان کتابوں کے مصنف کو کیا سزا دی جائے۔

جب ملا خاموش ہو گیا تو جامعہ کے ایک اور عالم نے بولنا شروع کیا۔ میرے رائے میں جو حقائق پیش کیے جا چکے ہیں ان کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ لیکن عمر خیام سے ایک اور گناہ بھی سرزد ہوا ہے۔ جس کا عام طور سے لوگوں کو علم نہیں۔

وقتاً فوقتاً عمر خیام رباعیاں لکھتا رہا ہے۔ جن کو کتابی شکل میں ایک جگہ جمع تو نہیں کیا گیا لیکن ہر طبقے کے لوگ انہیں پڑھتے ہوئے سنے گئے ہیں۔ خصوصاً صوفیاء کے حلقے میں وہ بے حد مقبول ہیں اور اوباش قسم کے لوگ قرآن و احادیث کی تردید میں انہیں سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مقرر نے جو اپنے آپ کو خاکپائے علماء خیال کرتا تھا۔ عمر خیام کی تصنیف کردہ کچھ رباعیاں مختلف لوگوں سے نقل کرا کے جمع کی تھیں۔

اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر علماء کرام اور قضاۃ عظام اسے اجازت مرحمت فرمائیں تو وہ ان ناپاک اشعار کو با آواز بلند پڑھ کر سنا سکتا ہے اور ساتھ ہی ان خباثت آمیز الفاظ و معانی کے اعادے کی اس نے معافی بھی چاہی۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔

سارے مجمع میں اشتیاق کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگ قدرے آگے جھک کر گوش بر آواز ہو گئے۔ عام طور سے لوگوں کو رباعیوں کا خالق بھی سامنے ہی موجود تھا اور خود اپنے الفاظ و خیالات کی ستم ظریفی کا شکار ہونے والا تھا۔

بزرگ ترین قاضی نے ارشاد فرمایا "بے کھٹکے پڑھ کر سناؤ۔"

معترض نے آہستہ آہستہ اشعار سنانے شروع کیے۔ عمر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا...... اسے یاسمین کا خیال آیا۔ بھلا یاسمین کے پہلو میں اسے جنت کا خیال کس طرح آ سکتا تھا...... اور شراب...... اس کے لیے غم رہائی کا واحد ذریعہ ہی تو تھی ......

"یہ مذہب کے ساتھ استہزا ہے" رباعیاں سنانے والے عالم نے کہا۔ لیکن میں آپ کو ایک اور شعر سناتا ہوں جو کھلا ہوا الحاد ہے۔

اے آنکہ تو فریاد رسی بخش ما
بخشی نہ اگر یابی کجا بخشش را (2)

عمر نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ شعر میں نے نہیں لکھا۔"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سفید عماموں سے آراستہ سر ذرا اور بلند ہو گئے۔ باریش چہروں پر خشونت کے آثار کچھ اور واضح نظر آنے لگے۔ امام غزالی اٹھے اور عمر کی نظروں سے کتراتے ہوئے قریبی دروازے سے باہر چلے گئے۔ عمر کو روز روشن کی طرح صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے حق میں کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ یقیناً اسے لائق تعزیز اور مجرم قرار دیا جانے والا تھا۔

وہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ جیسے ایک بڑا بار اس کے دماغ پر سے اتر گیا ہے۔ ان ضدی عالموں اور قاضیوں سے وہ بحث مباحثے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی۔

''کیا تو اپنی بر بیت میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟'' مفتی نے عمر سے سوال کیا۔ ''ہاں!
یہ آخری شعر میرا نہیں ہے۔ لیکن میں اپنی ایک اور رباعی آپ کو سنانی چاہتا ہوں جسے
یہاں نقل نہیں کیا گیا۔

گویند از آنکساں کہ باپرہیزند
زآنساں کہ بمیرند چناں برخیزند
ما با می و معشوق ازا نیم مدام
تا بو کہ بحشر ماں چناں انگیزد

''یہ رباعی بالکل تازہ ہے'' عمر نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
''یہ میں نے ابھی ابھی فی البدیہہ کہی ہے اور اس موقع کے لیے مناسب بھی
ہے۔''

ناپسندیدگی کے الفاظ سے سارا دیوان گونج اٹھا۔ اور مفتی نیا پنا ہاتھ بلند کر کے
کہا۔

''اب تو یہاں سے جا سکتا ہے۔ قاضیوں کے فیصلے کا انتظار کر۔''

جب وہ اس دروازے سے گزر رہا تھا جس سے امام غزالی تھوڑی دیر پہلے باہر
تشریف لے گئے تھے۔ ایک درویش نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔

''الموت میں اب بھی پناہ مل سکتی ہے۔''

عمر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی تو درویش وہاں سے کھسک گیا۔ محافظ دستہ
اسے ہمراہ لے کر ایک بغلی دالان میں پہنچا جس کے فرش پر مسجد کے بلند مینار کا سایہ

پڑھ رہا تھا۔ عمر نے وہاں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور آرام سے بیٹھ گیا۔

اب وہ پہلا سا عمر ابن ابراہیم الخیام نہ تھا۔ مشہور و معروف خواجہ امام عمر، سلطان کا منظور نظر، اس سلطان کا جو ہر وقت اس پر انعام و اکرام کی بارش کرتا رہتا تھا۔ اس نے ساری زندگی علمی مباحثوں میں گزاری تھی۔ اور اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر بڑے بڑے علماء سے کسب علم کیا تھا۔ اور اب.......... امیر پایگاہ خواجہ عمر وہاں ایک مجرم کی حیثیت سے بیٹھا تھا۔ ایک قیدی۔ جس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔

فیصلہ سنانے کے لیے خود مفتی اس کے پاس آیا۔

''تیری تمام تصانیف کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کا مصنف ایک ملحد ہے ان کی تعلیم مدرسوں میں ممنوع قرار دے دی گئی ہے جو کتابیں اس وقت یہاں موجود ہیں۔ انہیں نذر آتش کر دیا جائے گا۔''

''بیت النجوم کو ضبط کر کے نیشاپور کی مجلس نظما کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ اب تو اس کے احاطے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ ازیں تجھے حدود نیشاپور میں عوام کے کسی جلسے اور درس گاہوں میں طالب علموں سےخطاب کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔''

''آپ کا فیصلہ میں نے سن لیا۔'' عمر نے جواب دیا۔ ''لیکن میری ذات کے متعلق کیا حکم ہے؟''

مفتی نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے ایک لمحہ سوچا '' کچھ قاضیوں کی رائے ہے کہ تو دیوانہ ہے۔ مردود خداوندی.......... تیری ذات کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں

کیا گیا۔ بہر حال تو آزاد ہے۔ لیکن تجھے نیشا پور فوراً چھوڑ دینا ہو گا۔ مدرستہ العلوم اور دیگر درس گاہوں سے بھی تیرا کوئی تعلق نہ ہو گا۔"

"کتنے عرصے کے لیے؟"

"ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

جب محافظ رخصت ہو گئے تو عمر صدر دروازے سے ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔ اسے دیکھنے کے لیے باہر ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے قدم بے ارادہ اس مانوس سڑک کی طرف اٹھ گئے جو کتب فروشوں کے بازار کی طرف جاتی تھی۔

"اے ملحد" کسی نے آواز کسا۔ طالب علموں کی ایک ٹولی جو شور مچاتی ہوئی باغ کی طرف جا رہی تھی اسے قریب آتا دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ کتابوں کی دکانوں سے لوگوں نے اسے جھانک کر دیکھا۔ سڑک کے موڑ پر چشمے کے کنارے پہنچ کر وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اس وقت بھی پانی اسی طرح چمک رہا تھا جیسے بیس برس پہلے چمکتا تھا۔ پتھروں پر بیٹھی ہوئی عورتیں بھی بالکل اسی طرح غپ شپ کر رہی تھی۔ ایک لڑکی نے جو کنارے پر بیٹھی اپنی صراحی بھر رہی تھی عمر کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھا تو گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس غیر متوقع گھبراہٹ میں صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پتھر پر گری اور پاش پاش ہو گئی۔

"میں معافی چاہتا ہوں" عمر نے ایک دم چونک کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

پچیس سال پہلے جو وہ اس چشمے کے کنارے بیٹھ کر یاسمین کا انتظار کرتا تھا تو صبح

معنی میں زندہ تھا اور سامنے گزرنے والے انسانوں کی حیثیت اس کے خیال میں کاغذی فانوس پر گردش کرتے ہوئے سایوں سے زیادہ نہ تھی۔ اب وہ سب لوگ اسے زندہ نظر آرہے تھے۔ اور خود وہ ایک سائے میں تبدیل ہو چکا تھا جو بے مقصد ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ بیت النجوم کے چھن جانے کے بعد اسے دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ خود اپنا وجود بھی بے حقیقت نظر آرہا تھا۔

عائشہ برابر روئے جا رہی تھی۔ وہ اسے طرح طرح سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ابھی وقت ہے کہ ہم اپنے بچے کھچے آدمیوں کے ساتھ روپیہ پیسہ اور ضروری سامان لے کر جس قدر جلد ہو سکے قصر کو چک سے چلے جائیں۔ نیشاپور میں مزید قیام کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس نے عمر کو وہ سب افواہیں بتائیں جو کوچہ و بازار میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مسجدوں میں نماز کے وقت جمع ہونے والے لوگ اس کے متعلق کیسی کیسی باتیں کر رہے تھے۔ اس نے بار بار اصرار کیا کہ گھوڑے تیار ہیں اور باربردار اونٹ بھی موجود ہیں۔ اس سے پہلے کہ نئی مصیبتیں نازل ہوں بہتر یہی ہے ہم یہاں سے نکل جائیں۔

لیکن عمر نیشاپور چھوڑنے کو کسی قیمت پر راضی نہ تھا۔ اس نے اقلیدس پر اپنی شرح مکمل نہ کی تھی............ اس کی تصانیف کے سارے نامکمل مسودے بیت النجوم میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

عائشہ کی تمام گفتگو کے جواب میں عمر نے صرف ایک لفظ "نہیں" کہا اور اٹھ کر قصر کی چھت پر چلا گیا۔ وہ وہاں لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے لیکن کسی نتیجے

پر نہ پہنچ سکا اور دھوپ کی تیزی کو غروب آفتاب کے خونی منظر میں تبدیل ہوتے دیکھنے میں محو ہوگیا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر اندھیرا چھانے لگا تھا کہ اسحاق دوڑتا ہوا اوپر آیا اور خوف زدہ انداز میں عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''حضور! ایک جم غفیر بیت النجوم کی طرف جا رہا ہے۔ ان میں کچھ ملا ہیں۔ کچھ سپاہی اور بہت سے واہی تباہی لوگ شامل ہیں۔ وہ آپ کے خلاف نعرے بھی لگاتے جا رہے ہیں۔ ان کا ارادہ مینار کو لوٹنے کا معلوم ہوتا ہے۔ اٹھیے! جلدی چلیے تاکہ جو کچھ ہاتھ لگے وہاں سے بچا لائیے۔ اور شہر پناہ کے دروازے بند ہونے سے پہلے یہاں سے نکل کر قصر کو چک چلے جائیں۔ واللہ! اب یہاں امان ملنی مشکل ہے۔

''گھوڑا تیار کرو!'' عمر نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے حکم دیا۔

گھوڑے پر سوار ہو کر جب وہ روانہ ہونے لگا تو اس نے اسحاق کو ہدایت کی کہ گھر کا کوئی شخص باہر نہ نکلنے پائے اور صدر دروازہ بند کر دیا جائے۔

باغ عام کو عبور کر کے دریا کی طرف والے دروازے سے گزرتا ہوا وہ شہر پناہ سے باہر آ گیا اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔

اس وقت سڑک بالکل سنسان تھی۔ جب وہ سڑک پر چھائے ہوئے درختوں کے گھنے سائے سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے پہنچا تو اس نے اپنی نظریں تیزی سے مینار کی طرف دوڑائیں۔ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کے پیش منظر میں بجائے ایک

سیاہ خط کے اس نے مینار کی جگہ آگ کی لپٹیں بلند ہوتی دیکھیں۔

جب ذرا اور قریب آیا تو پورا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ دھوئیں کے سیاہ بادلوں کے نیچے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے گھوڑے کو شدت سے مہمیز کیا۔ گھوڑا مجمع کو چیرتا ہوا قلانچیں بھرتا۔ چڑھائی پر تیزی سے دوڑنے لگا۔ پائیں باغ کے دروازے پر پہنچ کر وہ گھوڑے سے کود پڑا اور دوڑتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ اور جلتے ہوئے مینار کے مختلف پہلوؤں سے شعلوں کی سرخ زبانیں تیزی سے باہر نکلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ تیز گرم ہوا کے ایک جھونکے نے جیسے اس کا منہ جھلس دیا۔ کچھ لوگوں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

''یا اللہ! اے شخص! کیا تجھے نظر نہیں آتا! کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔''

''شاید ابھی لگی ہے!''

''اسے لگے ہوئے تو عرصہ ہو گیا۔ اب تو پورے شباب پر ہے۔ دیکھتا نہیں آگ مینار کو کس طرح کھا رہی ہے۔''

جن لوگوں نے عمر کو رصد گاہ کے دروازے سے باہر کھینچا تھا۔ بہت خوش ہو کر اس آتشیں منظر پر رائے زنی کر رہے تھے۔ کچھ لوگ دروازوں کے پردے بغل میں دبائے کھڑے تھے۔ وہ آدمی اس پردے کے لیے جھگڑ رہے تھے جس پر سنہرے سلمہ ستارے سے اژدہے کی شکل بنائی گئی تھی...... وہ یہ طے نہیں کر پائے تھے کہ اگر وہ اسے لے جائیں تو بازار میں اس کے کچھ دام بھی اٹھ سکیں گے یا نہیں؟

عمر نیم بے ہوشی کے عالم میں لوگوں کو ادھر ادھر دوڑتے اور لوٹ مار کرتے دیکھ رہا تھا۔ رصد گاہ کی پہلی منزل چنگھاڑتے ہوئے شعلوں کی بھٹی بنی ہوئی تھی۔ آگ تیزی سے اوپر کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس کی تمام کتابیں اور کاغذات وہیں تھے۔ تیسری منزل پر...... سیاروں کی جدولیں۔ جو سالہا سال کے مشاہدہ و محنت کے بعد ترتیب دی گئی تھیں۔ اور نامکمل شرح اقلیدس بھی......!

اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخ کر دریافت کیا۔ ''کتابوں کا کیا حشر ہوا؟''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا؟ کتابیں...... کتابیں تو آگ کے شعلوں کی مرغوب ترین غذا ہیں۔ ہم نے انہیں جمع کر کے پہلے ہی نیچے کی منزل پر ڈھیر لگا دیا تھا۔''

ایک لڑکا اپنی قمیض کے نیچے کوئی چیز چھپائے بھاگتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ ایک طرف چند سپاہی سنہری اژدہے کو اپنے چاقوؤں سے کھرچ کھرچ کر کپڑے سے الگ کرنے میں مشغول تھے۔ لمبے چوڑے کپڑے سے الگ کر کے اس کا لے جانا نسبتاً آسان تھا۔ جب پہلی منزل کی چھت ایک دھماکے کے ساتھ نیچے گری تو انہوں نے نگاہیں اٹھا کر دلچسپی سے اس طرف دیکھا۔ دور، دور تک چنگاریاں اڑ کر آئیں اور آگ کی لپٹیں بل کھاتی ہوئی بلند ہو گئیں۔

بالآخر جب مینار کی بالائی چھت بھی جل کر زمین پر آ رہی تو مینار کی شکل بالکل

ایک ایسی چمنی کی سی ہوگئی جسے دہکتے ہوئے انگاروں پر کھڑا کر دیا گیا ہو۔

آگ کی چمک اور تپش آہستہ آہستہ دھیمی پڑنے لگی اور ہوا بھی رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ آوازوں کا شور مدھم پڑنے لگا۔ لوگ شہر پناہ کے دروازے بند ہونے سے پہلے گھر پہنچنے کے لیے تیزی سے واپس ہو گئے۔

سواروں کا ایک دستہ باغ میں داخل ہوا اور لوگ سے تباہی کا منظر دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ وہ لوگ ٹہلتے ہوئے ابن سینا کے مستی کرۂ ارض (تانبے کے بنے ہوئے گلوب) کے قریب پہنچ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔ اس گلوب کو کسی نے مینار سے باہر نکل کر حفاظت کے ساتھ ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس کا اسطرلاب بھی اس کے پاس ہی احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔

''عالیجاہ! آگ لگنے کے اس واقعہ کے متعلق ضرور ایک نظم تصنیف فرمایئے گا۔''

عمر نے نظریں اٹھا کر تعجب سے انہیں دیکھا۔ بولنے والے کوئی نووارد معلوم ہوتا تھا۔ اور جس شخص کو اسے نے مخاطب کیا تھا وہ درباری لباس پہنے ایک عمدہ گھوڑے پر سوار تھا۔ عمر کو اس سوار کی صورت جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ ایک لمحے توقف کے بعد اس نے پہچان لیا۔ وہ معزی تھا۔ درباری شاعر۔

معزی نے جان بوجھ کر عمر کو نظر انداز کر دیا۔ بلکہ آگ کے سلسلے میں مذاق کے طور پر چند جملے بھی کہے۔ گھوڑا موڑتے ہوئے اس نے اپنے ہمراہیوں کو یاد دلایا کہ واپسی میں انہوں نے خاصی دیر لگا دی تھی۔ جب ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینی بند ہو گئیں تو عمر کو اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔

اس کا ذہن ہنوز ماؤف تھا۔ وہاں سے واپس جانے کا خیال بھی اسے نہ آیا۔ اس کا سب کچھ وہیں تھا۔ زندگی بھر کی دماغی کاوشوں کا نچوڑ۔ وہ سب کچھ جھلسے ہوئے پتھروں کے نیچے اس کے ساتھ راکھ میں تبدیل ہو رہا تھا۔ یکایک اسے اپنے ساتھیوں کا خیال آیا جو برسوں سے اس کے ساتھ یہاں مصروف تحقیق تھے۔ آخر ان سب کا کیا حشر ہوا۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ یقیناً وہ مجمع کی زد سے بچ کر فرار ہو گئے ہوں گے۔

انگاروں کا ڈھیر اسے ایسا نظر آیا جیسے گلاب کے پھولوں کو انبار کر کے انہیں نیچے سے روشن کر دیا گیا ہو اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی ان کی سرخی گہری ہو جاتی ہو، کبھی مدہم۔ اس کے دماغ میں ابھی تک شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے اپنے تمام بدن میں آگ سی جلتی ہوئی محسوس کی بالکل ایسی ہی اندرونی تپش اس نیا یک مرتبہ اور بھی محسوس کی تھی جبکہ دریائے فرات کی کنارے خیموں کو آگ لگائی تھی۔ وہ آگ اس کے جسم میں آج تک ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔ اس نے اسی تپش کو ایک مرتبہ پھر شدت سے محسوس کیا اور سوختہ مینار سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو آسمان پر بادل کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

یکایک اس کی نظر چاند کی روشن چہرے پر پڑی جو صاف و شفاف آسمان کی بلندیوں سے ٹکٹکی باندھے سکون سے اسے دیکھ رہا تھا۔

عمر خالی الذہن ہو کر اجڑے ہوئے باغ کی روشوں پر ٹہلنے لگا۔ گلاب کی نازک نازک پتیاں جھاڑیوں سے ٹوٹ کر روشوں پر بکھری پڑی تھیں۔ ایک تاریک گوشے

میں بنفشہ کا ایک خوبصورت پھول سر شاخ لہلہا رہا تھا۔ عمر احتیاط سے چلنے لگا تا کہ اس کا پیر اندھیرے میں کسی پھول پر نہ پڑ جائے۔ پھر اس نے سوچا کہ اس اجاڑ میں ٹھہرنے سے کیا حاصل اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپسی کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

اس کے گھوڑے کو یا تو کوئی چرا کر لے گیا تھا یا پھر وہ خود ہی بھٹک کر کہیں ادھر ادھر چلا گیا تھا...... وہ پیدل ہی چل پڑا۔ سر پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس کا اپنا سایہ اس کی تنہائی کا ساتھی۔ قدم بہ قدم اس کے ساتھ چلنے لگا۔ چلتا رہا......

شہر کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ محافظوں نے اسے ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا۔ رات کے سناٹے میں کچھ وہ ادھر ادھر گھومتا، آوارہ گردی کرتا، مضافات شہر کے ایک گاؤں کی طرف نکل آیا۔ وہاں صرف ایک ہی دروازے سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر کان لگائے۔ اندر سے کسی کے قہقہہ مار کر ہنسنے اور ستار بجنے کی آواز آ رہی تھی۔

اس نے کھلے ہوئے دروازے میں جھانک کر دیا۔ وہاں اسے کمہار کا چاک نظر آیا جس پر سوکھی ہوئی مٹی کا ایک تودہ رکھا تھا۔ پاس ہی ایک کمبل اور کچھ صراحیاں پڑی تھیں۔ لیکن فضا شراب کی بو سے معمور تھی۔ عمر ذرا اور آگے بڑھا سامنے ایک اور دروازہ دکھائی دیا جس پر پردہ پڑا تھا۔ اس نے پردہ سرکایا اور اندر داخل ہو گیا۔

دیوار کے سہارے ان گنت صراحیاں ایک دوسرے پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک شخص لرزتی ہوئی انگلیوں سے ستار بجا رہا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر ایک دیہاتی دوشیزہ

کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی شراب کی صراحی اپنے دونوں بازوؤں میں، ہم آغوشی کے انداز میں لئے بیٹھا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس میں سے ایک پیالے میں شراب انڈیلتا جاتا تھا۔

''ذرا احتیاط سے'' عمر نے با آواز بلند کہا۔ ''شراب گرا کر ضائع نہ کرو۔''

جب عمر نے شراب سے بھرا ہوا پیالہ ہاتھ میں لیا تو ٹھنڈی سرخ شراب اس میں سے چھلک پڑی اور وہ آہستہ آہستہ پینے لگا۔ باقی تینوں اسے غور سے دیکھتے رہے۔

''ماشاء اللہ'' سفید ریش بوڑھے نے کہا۔ ''غالباً عالیجاہ راستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں؟''

عمر نے اپنے لباس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ پھر اس نے ایک آہ بھر کر پیالہ خالی کر دیا۔ شراب خانے کے اندر نسبتاً خنکی تھی۔ بوڑھا کوزہ گر جس کے ہاتھ کوزے بناتے بناتے ٹیڑھے ہو گئے تھے عمر کو اس وقت ایک فرشتہ نظر آ رہا تھا جو چاندنی رات میں آسمان سے اتر آیا ہو۔ عمر صراحی کے قریب آرام سے بیٹھ گیا اور نہ معلوم کس خیال میں محو ہو گیا۔

''آج'' اس نے محویت سے چونکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے عقل و دین کی دیویوں کو طلاق دے دی ہے اور دختِ رز کو اپنا شریکِ حیات بنا لیا ہے۔''(3)

''کیسے عجیب نام ہیں'' دیہاتی دوشیزہ نے ہنس کر کہا۔

''گا! اے دوشیزۂ شب'' عمر نے فرمائش کی۔ ''اور اے کشادہ دہن شخص تو ستار بجا۔ ایسی طلاقیں اور نکاح روز روز واقع نہیں ہوتے۔

وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ شراب ایک نغمگی کے ساتھ قلقل کرتی ہوئی صراحی سے پیالوں میں ڈھلتی رہی۔ عمر کا دل چاہا کہ اس کیفیت کا دوسروں کو بھی احساس دلائے۔ اس نے اپنا ہاتھ صراحی پر رکھا جو اسے ٹھنڈی محسوس ہوئی اور کوزہ گر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''کیا عجب یہ مٹی ایک ایسے عاشق زار کی ہو جس کے ہونٹ اس کے محبوب کے ہونٹوں سے پیوست رہے ہوں اور بازو اس کی گردن میں حمائل ؟''

''کون جانتا ہے؟'' بوڑھے نے غنودگی کے عالم میں جواب دیا۔

عمر نے پھر مغنیہ کی آواز پر کان لگائے۔ لیکن گانا ختم ہو چکا تھا۔ حجرے کی ساری فضا تاریک پردے میں لپٹ گئی۔ اور وہ بھی بے خبر سو گیا۔ ایک دفعہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اٹھ کر صراحی کو ہلایا لیکن وہ پہلے ہی خالی ہو چکی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور اندھیرے کی چادر اوڑھ کر پھر سو گیا۔

کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیا۔ سارے حجرے میں صبح کاذب کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ بوڑھا آدمی پریشان اور خوف زدہ سا کھڑا اس سے کہہ رہا تھا۔ ''میرے آقا اٹھیے۔ صبح کی اذان ہو رہی ہے۔ بلند مینار پر کھڑا ہوا موذن پکار پکار کر نماز کے لیے بلا رہا ہے۔''

''اس کی آواز پر کان نہ دھرو۔'' عمر نے جواب دیا۔ ''دراصل وہ پاین کمین گاہ سے جو مینار میں واقع ہے تمہیں دھوکے سے بلا رہا ہے۔ اس سے خبردار رہو۔''

اور پھر وہ خالی صراحی کی طرف کروٹ لے کر یہ سوچتا ہوا سونے کی کوشش کرنے

لگا کہ جب نیشا پور کے دروازے ہی اس پر بند ہو چکے ہیں تو وہ اب ناحق کر کرے گا بھی کیا۔

بوڑھے کوزہ گر نے ایک دفعہ پھر لجاجت سے کہا۔ "سنو! آقا!"".....حی علی الصلاح۔ حی علی الصلاح...... حی علی الفلاح......"

دور سے آتی ہوئی آواز کوزہ گر کے حجرے میں گونج رہی تھی۔ عمر ذرا لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں رک کر اس نے کچھ سوچا......صبح ہو رہی تھی۔ اور وہ شراب خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔...... اس نے موذن کو مخاطب کرتے ہوئے یہ رباع پڑھی۔

آمد سحرے ندا زمیخانہ ما

کائے رند خرا باتی دیوانہ ما

برخیز کہ پر کنیم پیانہ زمے

زاں پیش کہ پر کنند پیانہ ما

اور پھر وہ پلٹ کر جا لیٹا اور سو گیا۔

تمام دن کوزہ گر کا چاک گھومتا رہتا۔ پانی کے ٹھنڈے قطرے اس سے ٹپک ٹپک کر زمین پر گرتے رہتے۔ کوزہ گر کر مڑے ہوئے ہاتھ گیلی مٹی سے طرح طرح کی شکلیں تخلیق کرتے رہتے۔ ایک رات کے بعد دوسری رات آتی رہی۔ عمر اپنے سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو شراب کے چھینٹے دے دے کر ٹھنڈا کرتا رہا حتیٰ کہ دیوار کے سہارے چنی ہوئی لاتعداد صراحیوں نے ایسی انسانی شکلیں اختیار کر لیں جو اس

سے گفتگو کر سکتی تھیں۔ جب عمر نے ان سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تو نیند اس پر غالب آ گئی اور اس نے روز و شب کا شمار کرنے کی کوشش بھی ترک کر دی۔

''مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں'' اس نے طنزیہ لہجے میں کوزہ گر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس زمانے سے جو گزر گیا اور اس زمانے سے بھی جو آئے گا۔''

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ ہاں ایک روز اس کے سکون میں تھوڑا سا انتشار پیدا ہوا جب عائشہ اور اسحاق یکا یک اس کے سر پر آ دھمکے۔ عائشہ کی آواز مارے غصے کے کپکپائی ہوئی تھی۔

''یہ کیا نئی دیوانگی ہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ ہم ہفتوں سے تمہاری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اے واللہ!'' عائشہ نے اپنے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''یہ کچھ کم مصیبت ہے کہ انہوں نے بیت النجوم کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور قرض خواہوں نے تمہارے شہری مسکن پر اپنے قرضے کے بدلے قبضہ کر لیا۔

یہ سب تو کل کی بات ہے اب تک تو بھڑکتے ہوئے شعلے ٹھنڈے ہو کر راکھ میں تبدیل ہو چکے ہوں گے۔

''ہاں انہوں نے قصر کو چک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اب نئے سلطان کے دربار میں تمہارے نام کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس نے تمہاری ترتیب دی ہوئی تقویم کو ناکارہ قرار دے کر پرانے طریقے پر چاند کے حساب سے ماہ و سال کا شمار پھر رائج کر دیا......''

''میری تقویم؟''

''ہاں! ہاں! تمہاری مرتب کی ہوئی تقویم!! بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ ہے ہے!!
کیا غضب ہے کہ جب میں حمام جاتی ہوں تو عورتیں میری طرف انگلیاں اٹھاتی
ہیں۔ کہتی ہیں۔ وہ دیکھو وہ عمر خیام کی لونڈی ہے؟ کیا یہ ستم نہیں ہے کہ معزی کی
داشتائیں اور طوائفیں تو پالکیوں اور سوار ہو کر نکلیں جن کے آگے حبشی غلام ہٹو بچو
کرتے ہوئے چلیں اور میں خود گھوڑے پر چڑھی اسحاق کو ساتھ لیے اس طرح
سڑکوں پر ماری ماری پھروں...... اور تم یہاں بیٹھے ایک کوزہ گر کی لونڈیا کو بغل میں
دبائے شراب پی رہے ہو، رنگ رلیاں منا رہے ہو......''

''اچھا اب بہت ہو چکی'' عمر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''عائشہ میں تجھ سے
وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے عورتیں عمر خیام کا نام لے کر مذاق نہ اڑا سکیں گی۔ اور
تیرے مقابلے میں معزی کے مور اپنی چمکیلی دمیں پھیلا کر نہ ناچ سکیں گے۔ اسحاق
تیرے پاس جس قدر زرو نقد ہے وہ سب ادھر لے کر آ!''

''اللہ ہی جانتا ہے اس کے پاس کس قدر رقم ہے'' عائشہ نے چپکے سے کہا۔

''اور عائشہ، تیرے پاس بھی تو سنہرے سکوں کے توڑے موجود ہیں۔ علاوہ
دوسرے قیمتی سامان کے؟''

جوان کنیز اور اسحاق نے ایک دوسرے کو حیرت آمیز نظروں سے دیکھا نہیں
بہت پہلے اس امر کا یقین تھا کہ عمر سے ان کے خیالات پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن پھر
بھی انہیں عمر کی باتیں سن کر تعجب ہو رہا تھا۔

''عائشہ کے پاس جواہرات ہیں'' اسحاق نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''اور آپ کا

نقدی کا صندوقچہ بھی۔''

''تو پھر اے کوزہ گر! میں تجھے گواہ کر کے اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنا سارا مال و زر اپنی اس کنیز اور اس ملازم کو جو اس وقت یہاں موجود ہیں بخشتا ہوں۔ جاؤ اور نیشا پور کے مفتی کے روبرو جا کر اس کی تصدیق کرالو کہ میں نے ایسا کیا ہے۔''

چند لمحے کے لیے تلخ سناٹا چھایا رہا...... اسحاق نے جستجو آمیز لہجے میں عمر سے پوچھا۔ ''لیکن آقا! آپ کے پاس کیا باقی رہے گا؟''

اب باقی ہی کیا رہا۔ عمر حیرت سے سوچنے لگا۔ جو کچھ اس کا تھا وہ سب ختم ہو چکا۔ اس کی تصانیف مدرسوں میں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ اس کے مسودے جلا دیئے گئے۔ اس کی تقویم طاق نسیاں کی زینت ہوگئی۔ اس شہر بدر کر دیا گیا؟

''افق کے اس پار'' اس نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ایک جام پوشیدہ ہے جسے ہر شخص کو پینا ہی پڑے گا۔ جب تیری باری آئے تو بلا تکلف اسے ہاتھ میں لے کر غٹ غٹ چڑھا جانا۔ ایک قطرہ بھی اس میں نہ رہنے پائے...... میں صرف اس قدر جانتا ہوں۔''

اسحاق نے اپنی کہنی سے کوزہ گر کو ٹھوکا دیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔ ''اور اس مفتی سے یہ بھی کہہ دینا'' عمر نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کہ میں حلب جانے والے کارواں کے ہمراہ جلد ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا...... اچھا اب نیشا پور چلے جاؤ...... تم دونوں۔''

جب وہ دونوں کانا پھوسی کرتے ہوئے گھوڑوں کے قریب پہنچے تو عائشہ نقاب

ڈالے رو رہی تھی۔ اسحاق نے سہارا دے کر اسے گھوڑے پر سوار کرایا۔ ''اے عورت! اب تجھ پر کون سی مصیبت نازل ہوگئی؟'' اسحاق نے عائشہ کو طنز کیا۔

''نہ جانے کیوں میرے دل میں آگ ہوک سی اٹھ رہی ہے۔ لیکن کیا...... کیا یہ سارا زر و مال اب میرا ہے۔''

''بے شک! آقا نے یہی ارشاد فرمایا ہے۔''

عائشہ نے آہستہ سے اپنے آنسو پونچھے۔ مفتی کی عدالت کو جاتے ہوئے عائشہ ان دکانوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنے سے باز نہ رہ سکی۔ جن پر عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ریشمی پارچے خریدنے میں مصروف تھے۔

ایک کارواں سرائے کے دروازے میں جو خراسان سے دو روز کی مسافت پر سڑک کے کنارے واقع تھی عمر آلتی پالتی مارے بیٹھا اس الاؤ کو کرید رہا تھا جس نے رات بھر اس کے جسم کو حرارت پہنچائی تھی۔ اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی ایک بوسیدہ عبا اس کے شانوں پر پڑی تھی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے پیر انگاروں کی طرف پھیلا دیئے۔

خاصی رات گزر چکی تھی۔ آسمان پر عقرب مغربی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ صرف دو گھنٹے اور...... وہ نگہبانی کے فریضے سے سبکدوش ہو جائے گا۔ اس لیے کہ صبح ہو جائے گی۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے پتیاں...... خشک، بے جان پتیاں کھڑ کھڑا کر اوپر کی طرف اڑیں۔ بگولے کی شکل میں...... جیسے روحیں کرب کی شدت سے پھڑ پھڑا رہی ہوں۔ عمر نے دونوں ہاتھوں میں کچھ پتیاں لے کر آگ

میں جھونک دیں تو ایک لمحے کے لیے شعلے بھڑکے اور دب گئے۔ اس کے سینے میں کھجلی محسوس ہوئی وہ آرام سے بیٹھا کھجاتا رہا...... بس صبح ہونے ہی والی تھی۔

اس کے سکون میں کوئی چیز خلل انداز ہو رہی تھی۔ سڑک کی سخت زمین پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بند ہو گئی۔ ایک تنہا سوار الاؤ کے قریب آ کر رکا۔ ''اے نگہبان شب!'' اجنبی نے عمر سے سوال کیا۔ ''کیا یہ کارواں حلب کی طرف جا رہا ہے؟''

''ہاں'' عمر نے کہا۔

سوار گھوڑے سے اتر پڑا۔ کھڑے ہو کر اپنی ٹانگیں سیدھی کیں جو دیر تک زین پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے اکڑ گئی تھیں۔ اور پھر اس نے جماہی لی۔ ''یا اللہ نیشاپور سے یہاں تک کا سفر خاصا طویل ہے۔ کیا کوئی شخص خواجہ عمر خیام اس کارواں کے ہمراہ سفر کر رہا ہے؟''

چند خار دار شاخیں آگ پر ڈال کر عمر سوچنے لگا۔ باتوں کی آواز سن کر سرائے کا مالک بھی اپنے حجرے سے باہر نکل آیا جو دروازے کے پہلو میں واقع تھا۔ اور سوار کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''نہیں!'' سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ یہاں صرف ایک ہی تاجر ہے جو نہ خواجہ ہے اور نہ خیام ہے۔''

''میں ہی مطلوبہ شخص ہوں'' عمر نے ایک لمحہ توقف کر کے کہا۔

دونوں آدمی اسے دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑے۔

''یا خدا!'' سوار نے کہا۔ ''کیا میں خلیفہ کا خط ایک دربان کو دیدوں جس کی

داڑھی بھی ترشی ہوئی نہیں ہے؟ خلیفہ مصر نے قاہرہ سے عمر خیام کے نام خط بھیجا ہے اور درخواست کی ہے کہ وہ قاہرہ آ کر اس کا زائچہ بنائے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اسے عزت و احترام کے ساتھ قاہرہ لے جا کر دربار میں حاضر کروں۔

''انشاء اللہ'' سرائے کے مالک نے کہا۔ ''کیا یہ حقیقت ہے؟''

قاصد نے اپنی پیٹی سے ایک لپٹا ہوا خط نکالا۔ جو سر بند تھا اور اس پر دھاگا لپیٹ کر اوپر سے ایک بڑی مہر لگا دی گئی تھی۔ ''دیکھو! یہ ہے۔'' سوار نے خط دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے۔'' عمر نے پوچھا۔ ''کہ الموت کا حکمران حسن اس وقت دربار قاہرہ میں موجود ہے۔ جسے تمہارے والی نعمت خلیفہ کا پورا اعتماد حاصل ہے۔''

''تو کون ہوتا ہے۔ یہ جاننے والا؟ ہاں وہ بھی وہاں موجود ہے۔ جیسا کہ تو بیان کر رہا ہے۔ لیکن تجھے کیا............؟''

''قلم دوات لاؤ'' عمر نے سرائے کے مالک کو حکم دیا۔

عمر نے خط لے لیا اور اسے اپنے انگلیوں میں پکڑ کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصا وزنی ہے اور یقیناً طویل بھی ہوگا۔ یہ بہت آسان بات تھی کہ دھاگا کاٹ کر اسے کھول لیا جائے تاکہ اس کے مضمون سے آگاہی ہو جائے۔ عمر آنکھیں بند کر کے اسے پھر اپنی انگلیوں پر تولنے لگا۔

یہ دونوں شخص آخر اسے پریشان کرنے کے لیے اس وقت کہاں سے آن مرے۔ وہ آرام سے بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ اس کی تصور کی آنکھوں نے نظام

الملک کو ایک بار پھر اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جو اس سے از سرِ نو وقت کی پیمائش کی فرمائش کر رہا تھا۔ اس نے ملک شاہ کو پیشین گوئیاں طلب کرتے ہوئے دیکھا۔ افرونوس اس کی آڑ لے کر دولت جمع کرتا نظر آیا۔ اب اس کے سامنے ہر چیز آئینے کی طرح روشن تھی۔ حسن اس کی دماغی صلاحیتوں سے کام لینا چاہتا تھا۔ دارالعلوم کے قاضیوں نے اسے شہر بدر کر دیا تھا۔ سلطان کے درباری اس کا مذاق اڑاتے تھے...... اس وقت سے وہ مسلسل ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ بے مقصد، ایک پتے کی طرح جو ہواؤں کے رحم و کرم پر ہو۔

ایک وہ زمانہ تھا جبکہ اسے اپنی ذات پر کامل اعتماد تھا۔ کتنا اعلیٰ اقتدار اسے حاصل تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر غیر مرئی شے کے چہرے سے پردہ ہٹانا چاہا۔ اور لیجئے وہ غیر مرئی شے آج بھی اتنی ہی غیر مرئی ہے جتنی پہلے تھی۔

"قلم حاضر ہے" سرائے کے مالک کی آواز آئی عمر نے قلم ہاتھ میں لے لیا۔ "اگر یہ شخص لکھ سکتا ہے" سرائے کے مالک نے کہا "تو پھر یہ دربار نہیں ہو سکتا۔"

اسے ان دونوں سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ کوچ کا نقارہ بجنے سے پہلے پہلے اسے اس خط کا جواب لکھنا چاہیے۔ بنام خلیفہ مصر منجانب عمر الخیام جو علم و حکمت کے بے شمار خیمے سی چکا تھا۔ آگ کے قریب جھک کے عمر نے بند خط کی پشت پر حسب ذیل چار مصرعے تحریر کر دیئے۔

خیام کہ خیمہائے حکمت می دوخت

در کوزۂ غم فتاد و ناگاہ بسوخت

مقراض اجل طناب عمر ش برید

دلال امل بریگانش بفروخت

جب عمر نے قاصد کو خط واپس دیا تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''لیکن تو نے خط کھول کر تو پڑھا ہی نہیں!''

''مجھے معلوم ہے اس میں کیا لکھا ہے۔''

حیرت سے عمر کو دیکھتا ہوا وہ شخص آگ کے پاس سے اٹھ کھڑے ہوا۔ اسے بتا دیا گیا تھا۔ کہ عمر ایک بڑا ساحر ہے۔ انسانی تقدیروں کو پڑھنے والا۔ اپنے گھوڑے کی لگام گھسیٹتا وہ سرائے کے مالک کے ہمراہ دروازے میں داخل ہو گیا۔

عمر نے تجسس آمیز نظروں سے اپنے شانے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ عقرب پہاڑی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ صبح کی جسم میں تیر جانے والی خنکی ہوا میں پیدا ہو چلی تھی۔ بالاخر اس وقت وہ وہاں تنہا تھا بغیر کسی دوست، ساتھی یا رفیق کے۔

اسے یاد آئی کہ یاسمین نے ایک دفعہ کہا تھا کہ محبت میں وہ وقت بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے جب ستارے ڈوب رہے ہوں اور انسان اکیلا ہو۔ کیا یاسمین اس نقاب کا سایہ تھی جو غیر مرئی شے کے چہرے پر پڑا ہوا ہے؟ اور رحیم...... رحیم کا وہ جوان خون جو ایک مرتبہ زمین میں جذب ہو گیا پھر کبھی گردش میں نہ آئے گا۔ اسے اب یہ سب باتیں یاد نہیں کرنی چاہئیں۔ اب وہ کبھی واپس نہ آئیں گے۔ وہ اس قاصد کی طرح گھوڑوں پر سوار خراسان کی عظیم شاہراہ کو عبور کر کے اب کبھی نہ آسکیں گے۔

اس نے اپنا سر ہاتھوں میں دبا لیا۔ اور گھٹنوں کے بل سڑک کی طرف چلنے لگا۔''

اے ارحم الراحمین بس'' اس نے چلا کر کہا۔

ان کی آمد کا وقت قریب آ گیا تھا۔ اندھیرے میں سائے جمع ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے کنارے کنارے ناچتے ہوئے ...... لو! اب وہ اس کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ ان کے رونے کی خفیف آوازیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے برفانی ہواؤں کی سائیں سائیں۔

اس نے اپنے ہاتھ پھیلا کر انہیں چھونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ نہ انہیں سرعت کے ساتھ آگے بڑھنے ہی سے روک سکا۔ وہ انہیں صاف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ اندھیرے کے پیچھے پیچھے تیزی سے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ مڑ مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے۔ ان کی نحیف آوازیں عمر کو ان کا پیچھا کرنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ ایک ایسے خلا کی سمت جو ناپید اکنار ہے......

اسے بھی جلدی کرنی چاہیے۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ستارے ماند پڑ چکے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ دوڑتا ہوا نقارے کے پاس پہنچا جو سونے والوں کے قریب رکھا تھا۔ جب اس نے اس نقارے پر اپنی مٹھی سے بھرپور ضرب لگائی تو نقارے کی آواز سرائے کی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹی اور ساری فضا گونج اٹھی۔

فرداً فرداً ہر شخص کے پاس پہنچ کر اس نے انہیں بیدار کیا سب اپنا اپنا بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب بیٹھے ہوئے اونٹ کھڑے ہونے لگے تو چاروں طرف گھنٹیاں بجنے لگیں۔

ایک آدمی نے کھانس کر تھوکا۔ ایک ڈول کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز آئی ......

''لیکن'' سرائے کے مالک نے سکے شمار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے اسے خلیفہ کے خط پر اشعار لکھتے دیکھا تھا۔''

امیر کارواں نے اپنا نقدی کا بٹوا بند کر کے پیٹی میں اڑس لیا۔ ''ارے وہ تو ایک مجذوب ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ وہ کبھی طلوع آفتاب تک نہیں سوتا۔ الوداع سنو۔'' اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے اس نے با آواز بلند کہا۔ ''اے نگہبان شب، یہ کارواں کدھر جاتا ہے؟''

عمر نے کارواں کے سب سے آگے والے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دن اچھی طرح نکل آیا تھا۔ سرائے سے اٹھتی ہوئی گرد کے دھند میں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔

''جدھر رات چلی گئی'' اس نے پر جوش آواز سے جواب دیا۔ ''لیکن ہمیں بھی جلد روانہ ہونا چاہیے۔''

''اور وہ کہاں ہے؟'' امیر کارواں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

تھکے ہوئے انداز میں عمر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کسی جگہ نہیں'' اور پھر ...... اپنی بوسیدہ عبا سر پر کھینچ کر جریب ہاتھ میں لیے سب سے آگے والے اونٹ کی نکیل پکڑے وہ سرائے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔

حوالہ جات

1 یزداں کہ گل وجود مارا آراست

دانست زفعل ماچہ برخواہد خاست

بے حکمش نیست ہر گناہے کہ مراست

پس سوختن قیامت ازبہر چہ خواست

2 از جملہ رفتگان ایں راہ دراز

باز آمدہ کیست تامبا گوید راز

پس برسر ایں دوراہہ از بیناز

تاہیچ عمانی کہ نمی آئی باز

3 اے وہ کہ جس سے ہم رو رو کر بخشش طلب کرتے ہیں

بتا اگر تو نہ بخشے گا تو پھر وہ بخشش کہاں سے حاصل ہو گی

لیم کے انگریزی متن کا منظوم ترجمہ۔

4 ۔ یک چند بکود کی باستاد شدیم

یک چند باستادی خود شاید شدیم

پایان سخن شنو کہ مارا چہ رسید

از خاک بر آمدیم و بر باد شدیم

(خیام)

5 ۔ پا برسر سبزہ تا بخواری ننہی

کاں سبزہ زخاک لالہ روئے رستہ است

(خیام)

6 ۔ من بادہ بجام یک منی خواہم کرد

خود رابدو جام می غنی خواہم کرد

آنگہ سہ طلاق عقل ودیں خواہم گفت

پس دختر رزرا بزنی خواہم کرد

(خیام)

7۔این کوزہ چومن عاشق زاری بودہ است

در بند سر زلف نگاری بودہ است

این دستہ کہ برگردن اومی بینی

دستی است کہ برگردن یاری بودہ است

(خیام)

☆..........☆..........☆

ضمیمہ

عمر خیام

حجتہ الحق عمر خیام کا پورا نام غیاث الدین ابو الفتح عمر بن ابراہیم خیام ہے۔ (خیامی ان کے قبیلہ کا نام تھا) بدھ کے دن 18 مئی 1048ء کو نیشا پور میں پیدا ہوئے۔ فطرتاً ذہین اور قوی الجثہ تھے۔ نیشا پور کے مشہور عالم رئیس العلماء ابو حامد ناصر الدین محمد بن منصور سے تعلیم کی حاصل کی اور 17 سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ کی تکمیل کی۔

زندگی کا ابتدائی زمانہ بلخ میں بسر کیا۔ 18 سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا اور کافی مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور سلسلہ تعلیم بھی منقطع ہو گیا۔ انہیں ایام میں عمر خیام نے ایک رسالہ الجبرا کے مسائل پر تصنیف کیا اور علم ریاضی پر بھی کچھ تحقیقات کیں۔ ان کی ان تحقیقات کا ذکر شدہ شدہ سمر قند کے قاضی القضاۃ ابو طاہر عبد الرحمٰن بن احمد ملق سامریہ کے کانوں تک پہنچا جو ایک صاحب حیثیت عالم تھے۔ انہوں نے عمر خیام کو سمر قند بلایا اور اپنی سرپرستی میں لے لیا اور تحقیقات جاری رکھنے کی فرمائش کی۔ اس ہمت افزائی کے تشکر کے طور پر خیام نے اپنا رسالہ ''حل المساوات الجبر والمقابلہ'' اپنے سرپرست کے نام معنون کیا۔ اس رسالہ کی اشاعت نے انہیں گوشہ گمنامی سے نکال کر باہم شہرت پر فائز کر دیا۔

قاضی القضاۃ ابو طاہر عبدالرحمن ہی نے عمر خیام کو بخارا کے ایک خانی فرمانروا خاقان شمس الملک (دورِ حکومت 1068-1079ء) سے متعارف کرایا۔ جو آخر وقت تک خیام کی بے حد قدر و منزلت کرتا رہا۔ خاقان شمس الملک کی وساطت سے ملک شاہ سلجوقی کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی اور 1074ء میں ملک شاہ نے انہیں شاہی منجم کی حیثیت سے اصفہان میں شاہی رصد گاہ کا سربراہ مقرر کیا۔ اس وقت عمر خیام کی عمر بمشکل 26 سال ہوگی۔

1077ء میں خیام نے اقلیدس کا تتمہ تصنیف کیا اور اسی زمانے میں طبیعیات پر ایک رسالہ لکھا۔ 1079ء میں ملکشاہی زیچ مکمل کی۔

علم نجوم و فلکیات کے علاوہ علوم قرآن، حدیث، تاریخ، لسانیات میں بھی خیام کو اعلیٰ مہارت حاصل تھی۔ نیز گلی مجسمے بنانے میں ید طولیٰ اور علوم طب میں کمال حاصل تھا شاہی منجم ہونے کے ساتھ وہ ملک شاہ کے طبیب خاص بھی تھے اور دربار شاہی میں ''مصاحب'' کے اعلیٰ منصب پر بھی سرفراز تھے۔

عمر خیام کے شاگردوں میں چار اشخاص بہت مشہور ہیں۔ نظامی عروضی سمرقندی ، مصنف چہار مقالہ، عبدالرحمن میانجی مصنف زبدۃ الحقائق، حکیم شرف الزماں محمد علاقی، اور مشہور طبیب علی بن محمد حجازی القائینی۔

تمیں سال کی عمر میں خیام نے مابعد الطبیعیات کی طرف توجہ دی۔ 1079ء میں اصفہان کے ایام کے دوران بو علی سینا کے کلمات کا ترجمہ کیا اور اس کے بعد 1080ء مابعد الطبیعیاتی مسائل پر کئی رسالے لکھے۔ یعنی ''رسالۃ الکون و التکلیف''،

الجواب عن ثلاثہ مسائل''، ''ضرورت تضاد فی العالم والجبر والبقا''، رسالہ فی الوجود''، رسالہ فی کلیات وجود'' اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں شعر گوئی کا شوق ہوا اور لاتعداد اور رباعیاں ان سے یادگار ہیں۔ ایک ماہر ریاض داں، منجم، فلسفی اور طبیب کے برعکس ان کے شاعر کی حیثیت سے اکناف عالم میں بے پناہ شہرت حاصل ہے۔ خصوصاً رباعی گو شاعر کی حیثیت سے فارسی ادب میں انہیں جو مقام حاصل ہے اس کی کوئی نظر نہیں۔

عمر خیام زندگی بھر متعلم اور معلم رہے۔ آخر میں تصوف سے لگاؤ پیدا ہوا۔ خواجہ محمد بن اسمٰعیل بخاری سے انہیں بہت عقیدت تھی۔ ان کی فلسفیانہ تصانیف بالخصوص رباعیات میں جو تصوف کی چاشنی ملتی ہے وہ اسی عقیدت کا فیض ہے۔

عمر خیام نے 516ھ (1122ء) میں 12 محرم بروز جمعرات تقریباً 75 سال کی عمر میں اپنے آبائی وطن نیشاپور میں وفات پائی اور قبرستان امام محروق میں آسودۂ خاک ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی

سلجوقی نسلاً ترک ہیں۔ صاحب ملک وحکومت ہونے سے قبل یہ قوم بخارا اور ماوراءالنہر کے درمیان بودوباش رکھتی تھی۔ محمود غزنوی نے سلطنت کو خراج نہ دینے کی وجہ سے انہیں تتر بتر کر دیا تھا لیکن اس کے بیٹے مسعود نے انہیں پھر اکٹھا کر کے فوجی خدمات پر مامور کیا۔ مسعود کے عہد حکومت میں طغل بیک اور اس کے بھائی داؤد

بک کی سربراہی میں خراسان پر چڑھائی کی اور طوس، رے اور نیشا پور اور بلخ فتح کر کے سلجوقی حکومت کی بنیا ڈالی۔

طغرل بک چونکہ لاولد تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلام داؤد اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ الپ ارسلام کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ابوالفتح کنیت اور ملک شاہ نام تھا۔ 9 جمادی الاول 447ھ کو پیدا ہوا۔ مرنے سے قبل الپ ارسلام نے بیٹے کو بادشاہ بنا دیا۔ اور ارا کین سلطنت و سرداران لشکر سے فرمانبرداری اور وفاداری کا حلف لیا۔ نظام الملک کو وزیر اعظم مقرر کیا۔

ملک شاہ بڑا فتح نصیب اور اولوالعزم بادشاہ تھا۔ ساتھ ہی رعایا کا بھی بڑا خیال رکھتا تھا۔ رفاہ عام کے لیے جا بجا شہر کی فصیلیں، شاہراہوں پر پل، مساجد، کارواں سرائیں تعمیر کرائیں۔ شکار کا عاشق تھا۔ جب فرصت ملتی شکار میں مصروف ہو جاتا۔ ایک دفعہ حکم دیا کہ جتنے جانور ہم نے شکار کیے ہیں ان کا شمار کرو۔ دس ہزار کی گنتی ہوئی۔

بادشاہ نے دس ہزار دینار خیرات کر دیے اور خدا سے عفو کا طالب ہوا اور آئندہ ہر شکار پر ایک دینار صدقہ کرتا تھا۔

طبیعت میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ ایک دفعہ حاجیوں کو رخصت کرنے کے لیے کوفہ سے نکلا تو کئی کوس تک پا پیادہ مشایعت کی۔ کہتے ہیں کہ رسد رسانی افواج کا انتظام ایسا عمدہ تھا کہ جس شہر یا قصبہ میں جا کر بادشاہ اترتا وہاں اشیاء کا

نرخ روزمرہ کی بہ نسبت سستا ہوا جاتا تھا۔

بیس سال حکومت کرنے کے بعد 16 شوال 447ھ کو بمقام بغداد انتقال ہوا۔ جنازہ اصفہان لایا گیا اور مدرسہ عظمہ میں دفن کیا گیا۔

نظام الملک

نام حسن ابن علی بن اسحٰق بن عباس۔ کنیت ابو علی۔ لقب نظام الملک قوام الدین ہے۔ لیکن مشہور نظام الملک کے لقب سے ہوئے بروز جمعہ 21 ذیقعد 408ھ کو نوقان ضلع طوس میں پیدا ہوئے اور 17 رمضان 485ھ کو ایک ذیلمی نوجوان کے ہاتھوں نہاوند کے قریب شہادت پائی۔

اس عظیم مدبر اور علم دوست سلجوقی وزیر سلطنت نے نظامیہ بغداد کی بنا ڈالی اور تین کروڑ روپے سالانہ کی جاگیر اس اسلامی یونیورسٹی کے لیے دواماً وقف کی۔ نظامیہ بغداد کو دنیائے اسلام کی سب سے پہلی یونیورسٹی تسلیم کیا گیا ہے۔

اس یونیورسٹی کی بنیاد 457ھ میں رکھی گئی اور 459ھ میں اس کی عمارت مکمل ہوئی۔ شیخ ابو اسحٰق شیرازی اس کے پہلے شیخ الجامعہ تھے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت امام غزالیؒ، امام نووی اور ابن جوزی جیسے فضلائے اجل اس لافانی دانشگاہ میں درس دیتے تھے۔ عمر خیام بھی اس سے وابستہ رہے۔ شیخ سعید شیرازی نے اسی دانش گاہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ شیخ سعدی بوستان میں اپنی مادر درسگاہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

مرا در نظامیہ اورارر بود
شب و روز تلقین و تکرار بود

نظام الملک ایک معمولی زمیندار کے فرزند تھے۔ حدیث وفقہ اور دوسرے علوم متداولہ سے بہرہ ور تھے۔ جواں العمری ہی سلجوقی فرمانروا میکائیل سلجوقی کے دربار سے وابستہ گئے۔ اس کے بیٹے الپ ارسلام سلجوقی نے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق نظام الملک کو اپنا مدار المہام سلطنت مقرر کیا۔ دس سال بعد الپ ارسلان نے وفات پائی اور اس کے جانشین ملک شاہ سلجوقی کے عہد حکومت میں سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ اسی زمانے میں نظامیہ بغداد کی بنیاد ڈالی۔ جا بجا مہمان سرائیں، مدرسے اور پل تعمیر کرائے۔

ابوالقاسم قشیری اور امام الحرم ابوالمعالی بھی نظام الملک کے ہمعصر تھے جن کا وہ بہت احترام کرتے تھے۔

نظام الملک وزیر سلطنت بھی تھے اور عالم دین تھی۔ ان کا علم مداومت عمل سے مزین تھا۔ حدیث پاک کے درس میں طالبعلمانہ حاضر ہوتے تھے۔ اخلاق حمیدہ اور خصائل جمیلہ کے مالک تھے۔ انتظام سلطنت کے ماہر اور دوراندیش سیاست داں تھے۔ ان سے ایک مہتم بالشان کتاب ''سیاست نامہ'' یادگار ہے جو آج بھی اپنی نوعیت کی پہلی عالمانہ تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔

ابوالہیجا مقاتل بن عطیہ نے ان کی شہادت پر ایک ارثی قطعہ عربی میں لکھا جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

''نظام الملک وزیر ایک نفیس موتی تھا جسے رحمان نے دریائے شرف سے نکالا تھا۔ اس نے دنیا کو اپنی آب تاب دکھائی مگر دنیا نے اس کی کچھ قدر و قیمت نہ پہچانی۔ اس لیے غیرت الہیہ نے اس کو پھر صدف ہی میں رکھ۔'' صدف میں رکھنے کا کنایہ'' منہا خلقنا کم و فیہا نعید کم '' کی طرف ہے۔

امام غزالیؒ

ابو حامد کنیت۔ محمد بن محمد بن الغزالی نام۔ حجتہ الاسلام زین الدین لقب ہے۔ غزالہ ضلع طوس میں پیدا ہوئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے۔ غزالی ان کی عرفیت ہے اور یہ کہ وہ 445ھ کو خراسان کے اضلاع میں طاہران میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے باپ محمد روئی فروش تھے اس مناسبت سے ان کا خاندان غزالی کہلایا کیونکہ روئی کاتنے والے کو عربی میں غزالی کہتے ہیں۔ ان کے والد تعلیم سے محروم تھے مگر دونوں بیٹوں محمد اور احمد کو تعلیم حاصل کرنے کی تاکید کی۔ ابتدائی تعلیم طاہران میں ہوئی۔ شہر طوس میں احمد راذ کانی سے فقہ پڑھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر ابو نصر اسمٰعیل سے کسب فیض کیا۔ پھر نیشاپور میں امام الحرمین ابو المعالی کی خدمت میں جملہ علوم کی تکمیل کی، نیشاپور میں غزالی اور خیام ہم مکتب تھے۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں صاحب تصنیف و فتویٰ ہو گئے تھے۔ 20/18 برس کی عمر میں تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا تھا۔ استاد کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نظام الملک طوسی کے دربار میں پہنچے اس نے حد درجہ تعظیم و تکریم کی۔ دوران قیام وزیر الممالک کے سامنے متعدد

فاضلوں کے ساتھ مختلف علوم میں مناظرہ مباحثہ ہوتا رہا اور غزالی ہمیشہ غالب رہے۔اس طرح ان کی شہرت تمام اسلامی ممالک میں پہنچ گئی۔

جمادی الاول 484ھ میں جب ان کی عمر 34 سال تھی مدرسہ نظامیہ میں پروفیسر مقرر کئے گئے۔جہاں 488ھ تک درس دیتے ہوئے علامہ مدرسہ ک علماء کے چار پانچ سو علماء ان کے درس میں شامل ہوتے تھے۔488ھ میں مستعفی ہو کر زھد و انقطاع الی اللہ اختیار کیا۔حج کو گئے وہاں سے واپسی پر جامع دمشق میں دس سال معتکف رہے۔گھومتے گھامتے پھر نیشاپور آئے مدرسہ نظامیہ سے وابستہ ہو گئے۔نظامیہ میں انہیں چار سو اشرفی تنخواہ ملتی تھی۔مدرسہ سے کنارہ کش ہو کر اپنے وطن واپس آ گئے اور درس وتدریس ومجاہدات میں مصروف ہو گئے۔

ان کی تصانیف بیشمار ہیں جن میں سے بعض مشہور تصانیف ک نام یہ ہیں:

وسیط بسیط تہافتہ الفلاسفہ مشکوۃ الانوار، المنقذمن الضلال ،کیمائے سعادت،احیاء العلوم۔

خدا ان پر رحمت کرے اور ہمارے وطن میں بھی اس پر آشوب زمانے میں غزالی جیسے علماء پیدا کر۔جنہیں ہماری آئندہ نسلیں محی الدین کے نام سے یاد رکھیں۔

جمادی الثانی 505ھ میں بعمر 55 سال اپنے وطن طاہران وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

حسن بن صباح

حسن بن صباح، ایران کے شہر قم میں پیدا ہوا۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ والد کا نام علی بن صباح الحمیری ہے جو کوفہ کا رہنے والا ایک امامی شیعہ تھا۔ حسن کا دعویٰ تھا کہ وہ حمیری بادشاہوں کی نسل سے تھا لیکن نظام الملک طوسی نے اسے طوس کا باشندہ بیان کیا ہے۔ اور اس کے آباواجداد کو دہقان بتایا ہے۔ بعض مورخوں نے اسے رے کا باشندہ (الرازی) کہا ہے جہاں اس نے تعلیم پائی۔ عمر خیام اور نظام الملک کے ہم مکتب ہونے اور دور طالب علم کے معاہدہ کی مشہور روایت کی افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں۔

سترہ سال کی عمر میں حسن نے اسماعیلی مذہب اختیار کرلیا تھا اور 464ھ / 1071ء میں وہ عبدالملک ابن عطاش کا نائب مقرر ہوا جو عہد سلجوقی میں سب سے بڑا اسماعیلی داعی تھا۔ 469ھ/ 1077ء میں ابن عطاش نے اسے مصر بھیجا (غالباً تربیت کے لیے) جہاں وہ تین سال رہا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اس نے اسماعیلی مفاد کے لیے ایران، عراق اور عرب کے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔

مصر کے خلیفہ مستنصر کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کا قضیہ کھڑا ہوگیا تھا۔ حسن کے اس بیٹے نزار کا طرفدار ہوگیا اور اس بہانے سے مصر کی فاطمی حکومت کے خلاف اس نے بہت سے مقامات پر نزاری اقتدار حاصل کیا۔ بالخصوص الموت کے سنگین قلعہ پر، وہاں مقیم فوج میں اسماعیلی عقیدہ رکھنے والے فوجیوں کی مدد سے تصرف حاصل کیا۔ سلجوقی حکومت کے خلاف یہ سب سے پہلی بغاوت تھی۔ اس نے ایک

خفیہ جماعت کا مرکز قائم کر کے سلجوقی حکومت کو کمزور کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا اور اس کے لیے سربرآوردہ افراد کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ نظام الملک کا نام سرفہرست تھا اور آخر 485ھ/ 1092ء میں نظام الملک کو قتل کرا دیا جو ملک شاہ سلجوقی کا وزیر الملک تھا۔

نظام الملک کے قتل کے بعد سلجوقی حکومت روبزوال ہو گئی۔ ملک شاہ کے بیٹے برکیارق کا دور بڑی افراتفری میں گزرا۔ لیکن برکیارق کے بیٹے سلطان محمد نے حشیشین کی دہشت گردی سختی سے استحصال کیا اور اسمٰعیلی داعی اعظم بن عطاش کو قتل کر ادیا۔ (500ھ/ 1107ء)

اس کے بعد حسن بن صباح کو حشیشین نے اپنا داعی اعظم تسلیم کر لیا اور نزاری تحریک کا امیر بھی مان لیا اور اس طرح وہ نزاری دعوۃ جدیدہ کی اہم ترین شخصیت بن گیا اور خود کو حجتہ اور متوفی امام کا زندہ ثبوت اور اماموں کے سلسلہ میں مختار کی حیثیت سے قلعہ الموت میں ظہور پذیر ہوا اور ''سیدنا'' کے لقب سے اپنے آپ کو شہرت دی اور نزاری مقبوضات کو متحد کرنے میں منہمک ہو گیا اور نزاری ریاست کا امیر بن بیٹھا۔ آخر الامر وہ 518ھ/ 1124ء میں کیا بزرگ امید رودیاری کو اپنا امیر بنانے کے بعد فوت ہو گیا۔

حسن بن صباح نے آخری عمر میں ایک طرح سے خلوت نشینی اختیار کر لی تھی۔ وہ فطرتاً بڑا سخت گیر، جابر اور شقی القلب واقع ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے بیٹوں کو بھی نہیں بخشا۔ ایک کو قتل کے جرم میں سزائے موت دی۔ دوسرے کو شراب نوشی کی

پاداش میں تہہ تیغ کرادیا۔

علمی طور پر وہ فلسفیانہ مزاج کا آدمی تھا اور تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہتا تھا۔ خود نوشت سوانح عمری کے ایک جزو کے علاوہ علم کلام پر ایک رسالہ کا ملخص اور چند اور تصانیف بھی اس سے یادگار ہیں۔ خصوصاً اس نے فارسی میں شیعی نظریہ تعلیم کی ایک نہایت منطقی قسم کی تشریح سپرد قلم کی تھی۔

☆..........☆..........☆

اختتام--------------------------The End